www.iqbalkalmati.blogspot.com

تختہ دار کے سائے تلے

مصنف

جاوید ہاشمی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فہرست خطوط

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
	پیش لفظ	
	تختہ دار کے سائے تلے	
1۔	تختہ دار کے سائے تلے	9
2۔	جیل کے معمولات	13
3۔	جیل کیا ہے؟	16
	میرا گاؤں	41
4۔	گلوبل ولیج کی کہانی	43
5۔	صدرِ پاکستان رانا عبدالوحید خان	47
6۔	کاش میں نیامت موچی ہوتا	51
7۔	مقدر کی تختی	55
8۔	احساس جرم کی صلیب	58
9۔	ماضی سے نجات	62
10۔	غریب نواز سلامت	64
11۔	تاریخ کا نیا رخ	67
12۔	سچائی کے بیج	70
13۔	نقارے پر چوٹ	74
14۔	غلاموں سے بڑھ کر غلام	78
15۔	بھٹی کا ایندھن	82
16۔	ہم سب بھٹہ مزدور	85

www.iqbalkalmati.blogspot.com

17-	علامہ ابوالخیر اسدی صاحب	90
18-	مولانا نوراحمد فریدی صاحب	93
19-	گیلی لکڑی کے آنسو	97
20-	بھیانک تصویر	100
21-	یہ ایک صدی کا قصہ ہے	102
22-	تو شاہ ہم گدا	105
23-	مہاجر	107
24-	روشنی کے منار	110
25-	ذہن کی غلاظت	114
	حدیث دل	119
26-	یوم پاکستان اور بھٹکے ہوئے راہی	121
27-	سرخ اور کالے گلاب	126
28-	زلزلہ زدگان اور درد کے رشتے	128
29-	شوق شہادت	131
30-	چاچا منگو خان رحمۃ اللہ علیہ	134
31-	پانچ ہزار بچے!	137
32-	انتقال اقتدار	139
33-	زیتون کی شاخ	143
34-	ماریہ سے بشریٰ	146
35-	یقین زندگی کا پیغام ہے	148
36-	احساس ذمہ داری	153
37-	اجتماعی قیادت کا تصور	156

www.iqbalkalmati.blogspot.com

38۔	بڑے باپ کا بڑا بیٹا	160
39۔	آزادی کی خوشبو	165
40۔	زمینی حقائق	168
41۔	دل دریا سمندروں ڈونگے	172
42۔	پردہ غیب سے باہر	173
43۔	تاریخ کا پنڈولم	178
44۔	حیات جاودانی	181
45۔	زرعی فارم کی کہانی	185
46۔	نیب کی عدالت میں بیان	188
47۔	وطن کی بیٹیو!	198
48۔	ماں	203
49۔	شکم سامانِ موت	207
50۔	روشنی کا دریچہ	209
51۔	سیکولرازم اور اسلام	212
52۔	کوے کی لاش	220
53۔	دلیل نہ وکیل فقط تعمیل	223
54۔	شناخت پریڈ	226
55۔	انقلاب کے آثار	229
56۔	ناکام ریاست	232
57۔	ناقابل علاج	236
58۔	موروثیت کی سیاست	239
50۔	تہذیبوں کی ناکامی اور نوشتہ دیوار	244
60۔	سونے کا شہر (CITY OF GOLD)	251

www.iqbalkalmati.blogspot.com

61۔	آخری ملاقات	257
62۔	پہلا قدم	260
63۔	قیدی کا قیدی سے رابطہ	263
64۔	انجیل مقدس سے مشکوٰۃ شریف تک	267
65۔	انسٹھ سالہ آزادی	270
66۔	زندہ دلان لاہور	275
67۔	الوداع اکبر بگٹی	284
68۔	ہیرو	290
	بشریٰ کے نام	293
69۔	ناقابل معافی	295
70۔	فیوڈل ازم اور بلدیاتی نظام، ایک چہرہ دو رخ	297
71۔	افسر شاہی.........نوکر شاہی	302
72۔	فیوڈل مسٹر کلین (Mr. Clean) ہوتا ہے	306
73۔	کیا میں غدار ہوں؟	310
74۔	متوسط طبقے کی قیادت	316
75۔	قوت برداشت	319
76۔	آٹھ ارب کا فائدہ	322
	اقتدار اور اختلاف کی سیاست	
77۔	عہدے کی سیاست اور نیلسن منڈیلا سے ملاقات	327
78۔	قیادت کا تصور اور چرچل کا گاؤں	332
89۔	گلوبل ویلج اور بین الاقوامی سیاست	335
80۔	پارلیمنٹ کی بالادستی واحد علاج	340
81۔	صبح آزادی	345

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

یہ کتاب تحریر سے زیادہ خود کلامی پر مشتمل ہے میں نے جتنے خطوط لکھے ہیں ان سب کے کردار حقیقی ہیں، واقعات کی صحت کا خیال اس لئے بھی ضروری تھا کہ میں نے انہی لوگوں کے پاس ووٹ مانگنے کے لئے جانا ہے، جن کا ذکر اس کتاب میں ہے، اگر کوئی بات خلاف واقعہ ہوئی تو جوابدہی مشکل ہو جائے گی اس لئے خود کلامی خود احتسابی میں تبدیل ہو گئی۔ میرا عقیدہ ہے کہ حقیقت افسانے سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہے صرف دیکھنے والی آنکھ کی ضرورت ہوتی ہے۔

گزشتہ کئی صدیوں سے ہمارے مذہب اسلام کو تنگ دائروں میں محدود کر دیا گیا ہے میں خدا کی ذات پر غیر متزلزل یقین رکھتا ہوں۔ میرا کامل یقین ہے کہ خدا انسانوں میں رہتا ہے غریبوں کی بھلائی اور خوشنودی میں خدا کی خوشنودی شامل ہے۔ اشرف المخلوقات یا عظمت انسان کا درس قرآن میں ہر جگہ دیا گیا ہے۔ جب یہ فرمایا گیا کہ خدا اپنے حقوق معاف کر دے گا مگر انسان کے حقوق غصب کرنے والے کو معاف نہیں کرے گا۔ تو گویا ہماری بخشش کو انسانوں کی رضامندی سے مشروط کر دیا گیا یہی انسانیت کی عظمت کا فلسفہ ہے اس فلسفہ حیات کو دنیا کے سامنے کامیاب طریقے سے پیش کرنے کی ذمہ داری تمام مسلمانوں پر ہے میں نے کوشش کی ہے کہ اس ذمہ داری کا احساس دلوا سکوں۔

میں سمجھتا ہوں دوسری جنگ عظیم کے بعد نو آبادیاتی نظام کو ایک نئے روپ میں پیش کیا گیا، ملک آزاد ہو گئے مگر معاشرے غلام بنا دیئے گئے۔ معاشرتی غلامی کی جکڑ بندیوں کو افرادی قوت اور قدرتی وسائل کے ذریعے شکست ہو چکی ہے۔ اب سامراج نیو ورلڈ آرڈر کو نو آبادیاتی نظام کے طور پر دنیا پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔ اس عفریت کا سامنا حکمرانوں کی بجائے قومیں کر سکتی ہیں۔ کسی قوم کی سوچ کی عکاسی صرف جمہوریت سے ہو سکتی ہے، باقی تمام راستے منزل سے بھٹکا دیتے ہیں۔ فرد واحد کی حکمرانی والے معاشرے تباہی سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہمکنار ہو رہے ہیں۔ طاقت کا توازن مغرب سے مشرق یا شمال سے جنوب کی طرف ہوتا جا رہا ہے۔ اجتماعی سوچ اپنانے والے معاشرے بالادست ہو رہے ہیں۔ ہمیں اپنے گردوپیش کو بہتر بنانے کے لئے اجتماعی سوچ اور اجتماعی قیادت کی اشد ضرورت ہے۔ یہ مقصد صرف اور صرف جمہوریت سے ہی حاصل ہوسکتا ہے۔

کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا پہلے حصے میں جیل کا تذکرہ ہے اس میں جیل کے اندر کی زندگی کے کئی گوشے نقاب کیے گئے ہیں میں کیسے اپنے شب و روز گزارتا ہوں اس کا ذکر بھی اس میں شامل ہے اس حصے کو شامل کر کے یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ اگر نظام عالم کو بغیر کسی نظریے کے چلایا جائے تو وہ لوٹ کھسوٹ کا نظام بن جاتا ہے جس میں شرف انسانیت کی قدم قدم پر تذلیل ہوتی ہے۔

دوسرے حصے میں میرے مخاطب دنیا بھر کے محروم عوام ہیں میں نے کوشش کی ہے اپنے گاؤں کے محروم طبقات کے حوالے سے دنیا بھر کے مظلوم اور محروم لوگوں کی پسماندگی کی وجوہات کی نشاندہی کرسکوں تاکہ خود احتسابی کے عمل سے گزر کر غربت جہالت اور بیماریوں کے خلاف جنگ کو تیز کیا جاسکے۔

تیسرا حصہ جیل میں ہونے والے مشاہدات اور اردگرد وقوع پذیر حالات پر مشتمل ہے ملکی اور بین الاقوامی صورت حال کا جائزہ بھی اس میں شامل ہے اور درد دروں کی کہانی بھی اس میں نصیحتیں بھی ہیں کچھ در پردہ حکایتیں بھی اور شکایتیں بھی۔

چوتھے حصے میں اڈیالہ جیل میں بشریٰ کے نام تحریر کیے گئے خطوط شامل ہیں یہ خطوط میری پہلی کتاب ''ہاں میں باغی ہوں'' میں شائع ہو چکے ہیں انہیں معمولی ردوبدل کے بعد اس کتاب کا حصہ بنایا گیا ہے تاکہ تمام خطوط یکجا ہو جائیں اور قاری کو آسانی ہو۔

قید میں کتاب لکھنے میں کئی دشواریوں کا سامنا ہوتا ہے خوف کے پہرے میں ہر لفظ کو قید سے آزاد کرانا پڑتا ہے قیدی کی تلاشی جیلر کا قانونی حق ہے اس کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں جیل حکام رات اور دن کے کسی حصے میں تالہ کھول کر آدھمکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تلاشی کے لئے آئے ہیں۔ یہاں مسودے کی حفاظت کتاب لکھنے سے زیادہ مشکل کام

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔ تاہم اس حقیقت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر میں قید تنہائی میں نہ ہوتا تو کوئی کتاب نہ لکھ پاتا یہ جیل کی زندگی کا مثبت پہلو ہے۔

کتاب لکھنے کا محرک یہ جذبہ تھا کہ میں جو کچھ سوچ رہا ہوں اسے کسی نہ کسی طرح جیل کی باہر کی دنیا تک پہنچایا جائے ہو سکتا ہے دردوروں کی یہ داستان درماندہ قافلوں کو منزل کا نشان بتانے کا سبب بن جائے۔ میں اپنا پیغام پہنچانے میں کہاں تک کامیاب ہوا یہ فیصلہ آنے والے وقت پر چھوڑتا ہوں۔

(مصنف)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تختۂ دار کے سائے تلے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تختہ دار کے سائے تلے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

منشی جی!

السلام علیکم!

2 اپریل 2005ء کو میں کوٹ لکھپت جیل میں داخل ہوا تو مجھے لگا کہ میں ایک ویران اور سنسان جزیرے پر اترا ہوں۔ سائیں سائیں کی آوازیں، مہیب خاموشی کا پیش خیمہ تھیں۔ مجھے سیکورٹی سیل میں بند کر دیا گیا جو الگ احاطے میں قائم کیا گیا ہے، اسکی دیواروں پر خاردار تاریں بچھائی گئی ہیں۔ مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کو بھی اس سیل میں رکھا گیا تھا۔ احاطے کے اردگرد موت کی سزا پانیوالے قیدی ہیں۔ اس حصے کو جیل کا حساس ترین علاقہ قرار دیا گیا ہے۔ میرے احاطے کی دیوار پھانسی گھاٹ کیساتھ ہے، گویا، میں تختہ دار کے سائے میں رہ کر رموزِ زندگی سیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ چاروں طرف موت کے سائے ہیں۔ جب ملاقات کیلئے ڈیوڑھی کی طرف جاتا ہوں تو پھانسی گھر کے دروازے سے گذرنا پڑتا ہے۔ گذشتہ دنوں کچھ افراد کو موت سے ہم کنار کیا گیا۔ میں چند قدموں کے فاصلے پر موجود ہونے کے باوجود موت کے قدموں کی چاپ نہیں سن سکا۔ البتہ، خوفناک خاموشی اور گہرے سناٹوں سے یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ یہی موت ہے۔ اس خاموشی نے مجھے پورے معاشرے کی خاموشی کے معنی سمجھا دیئے۔ معاشرہ اگر جبر ناروا کے خلاف خاموش ہو جائے تو شہرِ خموشاں کے معنی سمجھنے میں مزید دیر نہیں لگتی۔ جیل کے اس حصے میں ہر وقت موت کا راج رہتا ہے۔ ہر کوٹھڑی کے دروازے پر DEATH CELL اور ہر احاطے پر "سزائے موت کا احاطہ" جلی حروف میں لکھا ہوا ہے۔ یہاں پر تقریباً سو سے زیادہ موت کی کوٹھڑیاں اور چار سو سے زیادہ موت کے منتظر قیدی پھانسی گھاٹ کو اپنے سامنے دیکھتے رہتے ہیں۔

جب مجھے قید تنہائی مین ڈالا گیا تو اِس اُجڑے احاطے میں صرف ایک مریل بلی نظر آتی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تھی۔ شام کو جب مجھے کمرے میں تالہ بند کردیا جاتا تو میں اسے اپنی جالیوں سے رینگتا ہوا دیکھتا۔ کسی جاندار کا نظر آنا زندگی کی علامت تھی پھر میں نے بنجر زمین پر کام کا آغاز کیا۔ جیل والوں نے THE FRONTIER POST کے چیف ایڈیٹر رحمت شاہ آفریدی کو دن کے کچھ حصہ کیلئے میرے پاس آنے کی اجازت دے دی، جو تین سال سزائے موت کی کوٹھڑی میں رہے، وہ اس کام میں میرے معاون ہو گئے۔ تم انہیں اس وقت سے جانتی ہو جب وہ تبلیغی جماعت والوں کے ساتھ ملتان ہمارے گھر آیا کرتے تھے۔

سب سے پہلے سنگلاخ زمین کی پیمائش کر کے اسے کیاریوں کی شکل دی گئی۔ زیر زمین اینٹوں اور پتھروں کے ڈھیر کو گہری کھدائی کر کے باہر نکالا گیا۔ کمرے کے پچھلی جانب گٹروں سے گندگی نکلتی رہتی تھی جو ایک متعفن تالاب کی صورت اختیار کر گئی تھی، بدبو کے بھبھوکوں سے متلی ہونے لگتی۔ اس پر پختہ اینٹوں کی فرش بندی کردی تو کسی حد تک مسئلے کا حل نکل آیا۔ اب یہ جگہ پھولوں کی کاشت کیلئے تیار تھی۔ ہم نے اشوکا اور ایروکیریا کے پودے منگوائے۔ نیم، لیموں، جامن، انار اور آم کے چند پودے پہلے سے موجود تھے لیکن ان کی حالت سزائے موت کے منتظر قیدیوں سے مختلف نہیں تھی۔ انھیں وقت پر پانی اور کھاد ملنے لگی تو اُن میں زندگی کی رعنائیاں رنگ بھرنے لگیں۔ کچھ حصوں کو گلاب کیلئے مخصوص کر دیا گیا۔ سخت گرم موسم میں پودے سوکھنے لگتے، شدید سردی نے بھی چالیس سالہ ریکارڈ توڑ دیا سخت نگہبانی کی وجہ سے موسموں کو شکست ہوگئی۔

آج تم اگر اِس جگہ کو دیکھ سکو تو گوشہ قفس، گوشہ چمن میں تبدیل ہو چکا ہے۔ چار سو پھولوں کی قطاریں ہیں، رنگوں کی بہار ہے۔ رینگنے والی بلی کو متواتر غذا ملنے لگی، اب وہ چھلانگیں لگاتی ہے۔ درختوں پر آنے والے پرندوں کو شکار کرنے کیلئے باقاعدہ گھات لگا کر حملہ کرتی ہے۔ پرندوں کیلئے دانہ ڈال دیتا ہوں۔ وہ بھی بہت بڑی تعداد میں آموجود ہوتے ہیں۔ اِن پرندوں کی آوازوں سے کئی ساز چھڑتے ہیں۔ موت سے ہمکنار ہونیوالی یاسیت کے ماحول میں زندگی کو چار سو مسکراتے دیکھتا رہتا ہوں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میرے پاس موسمی پھولوں کا وسیع ذخیرہ اکٹھا ہو گیا ہے۔ اتنے پھول شاید ہی لاہور میں کسی اور جگہ موجود ہوں جس قدر ہمارے اس چھوٹے سے زمین کے ٹکڑے پر ہیں۔ صرف گلاب، بیس سے زیادہ رنگوں میں ہے، بجری کی کیاریوں کا اپنا حسن ہے، زینیا اپنا رنگ؟ دکھا رہا ہے۔ پینزی کبھی بلی کی طرح لگتا ہے، کبھی مکی ماؤس (Micky Mouse) اور کبھی بھالو کی طرح۔ ڈیلیا نے تو پورے ماحول کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ جافری، میری گولڈ، گل اشرفی اور مسبری سے موسم بہار کا بسنتی رنگ بھی شرما رہا ہے۔ نمائشی گوبھی کے پھولوں نے گرگٹ کی طرح کئی رنگ بدلے ہیں۔ پیپر فلاور (Paper Flower) اور لوٹن میں قوسِ قزح کے سارے رنگ نکھر آئے ہیں۔ پٹونیا، پکوٹی اور سٹاک، اگرچہ، دیر سے نکلے مگر خوب نکلے۔ موتیا، رات کی رانی اور دن کا راجہ نہ ہوتے تو سارا آنگن خوشبو سے خالی ہوتا۔ ہماری ثقافت بھی اب ولائتی پھولوں کی طرح ہر طرف رنگ بکھیرتی ہے، مگر اس کا اپنا دامن خوشبو سے خالی ہے۔ مجھے اڈیالہ جیل میں لگائے گئے چنبا، چنبیلی اور موتیا کے پودے بہت یاد آتے ہیں جو یہاں کوشش کے باوجود میسّر نہیں آ سکے۔ پھولوں کی زندگی انتہائی مختصر ہوتی ہے۔ ان کا کھلنا اور مسکرانا ہی ان کا جوہر کامل ہے۔ وہ فضاؤں کو معطر کر کے ایک دو دن کے اندر موت کی وادی میں چلے جاتے ہیں۔ مگر جو مسّرتیں وہ بکھیرتے ہیں اسی میں زندگی کا پیغام ہوتا ہے۔ فنا تو ہر ایک شے نے ہونا ہے پھر ہم پھولوں کی طرح خوشبو پھیلا کر دنیا سے رخصت کیوں نہ ہوں۔ یہی موت کے اندر زندگی کا پیغام ہے اور زندگی میں موت کا۔ میں سوچتا ہوں جس طرح اِس دو کنال کے بیابان ٹکڑے کو بہتر باغبانی سے گلشن میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اِسی محنت اور لگن سے وطن کو رشکِ چمن بنانا کوئی مشکل کام نہیں، بس جگر کا خون دے کر ہی اُمیدوں کا چمن پھولتا اور پھلتا ہے۔

ایک دن میں پیڑ کے نیچے تنہا بیٹھا تھا کہ درخت کا سوکھا پتہ مجھ پر گرا گویا یہ موسم خزاں کی آمد کا اشارا تھا۔ موسموں کے ستم سے پتے گر جاتے ہیں مگر پیڑ کھڑے رہتے ہیں ان خیالوں میں گم تھا کہ جیل کا ایک ملازم قریب آ کر کہنے لگا مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پھولوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی یہ حسین کیاریاں ہمارا پیارا ملک پاکستان ہے اور آپ اس کے مالی ہیں۔ پھر اپنی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا، میرے سمیت قوم کا ہر فرد اس دھرتی سے اُگنے والا پھول ہے اور آپ کی ذمہ داری ہے کہ آپ ہماری نگہداشت ایسے کریں جیسے پھولوں کی کیجاتی ہے۔ مجھے اس کی باتیں بہت اچھی لگیں۔ مالی کو باغ کی مزدوری سے یقیناً خوشی ہوتی ہے مگر جتنی خوشی باغ کی ہری بھری شاخیں دیکھنے سے ہوتی ہے اُسکی کوئی قیمت نہیں۔ اگر ملک کے سیاستدان اپنے لوگوں کے پسینے کی خوشبو سے اپنے دماغ کو معطر کر سکیں تو قوم کو ترقی کی منزلیں طے کرتے دیر نہیں لگتی۔ قیادت کی طرف سے اخلاص اور دستِ شفقت قوم کو اوجِ ثُریا تک پہنچا سکتا ہے۔ میں پیدائشی طور پر رجائیت پسند ہوں، لیکن آجکل شمالی وزیرستان، کوہلو، ڈیرہ بگٹی اور پورے بلوچستان میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ میری راتوں کی نیند اُڑانے کیلئے کافی ہے۔ یہ یقین مجھے جادہ پیمائی پر اکساتا ہے کہ روشنی کی معمولی کرن اندھیروں کو بھگا سکتی ہے۔ جب شور زدہ زمین سے کونپلیں پھوٹتی ہیں تو میرے وجود سے نکلنے والے خیالات کا دھارا مجھے کشاں کشاں منزل کی طرف کھینچتا ہے۔ مجھے اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا احساس ہے۔ لیکن میں جب موت کو زندگی میں بدلتے دیکھتا ہوں تو عالم اِمکان کی وسعتوں کا ادراک ہونے لگتا ہے۔ مجھے اپنی منزل آسمانوں میں نظر آتی ہے۔ دوست اِسے میری مشکل پسندی کہتے ہیں۔ علم طاقت ہے مگر ادراک میں طاقت پرواز ہے جو غلاموں کو شہنشاہیت کی منزل پر پہنچا کر دم لیتی ہے، جہدِ مسلسل ہی زندگی ہے۔ کم کوشی سامانِ موت ہے، فیصلہ ہم نے خود کرنا ہوتا ہے، ہمیں زندگی سے پیار ہے یا موت سے؟

والسلام

تمہارا والد!

جاوید ہاشمی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جیل کے معمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

5 جنوری 2006ء رات ایک بجے۔

بُشی جی!

السلام علیکم!

نیا سال شروع ہوا تو پرانی باتیں یاد آنے لگیں۔ آج عمر رفتہ کو آواز دینے کو جی چاہ رہا تھا سوچا، تمہیں بھی اس خرابے کی سیر کرا دیں۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ 14 جنوری تک میری جیل سروس کو 40 سال ہو جائینگے؟ ویسے تو میں 1964ء میں جب آٹھویں جماعت میں تھا طلبہ کے مطالبات کے حق میں مظاہرہ کرنے پر حوالات تک پہنچ گیا۔ مگر جیل جانے کا اتفاق 1966ء میں اعلانِ تاشقند کے خلاف تحریک چلانے پر ہوا۔ یہ حسن اتفاق تھا کہ میں نے پھر مڑ کر نہیں دیکھا۔ دسمبر 1970ء میں پنجاب یونیورسٹی پہنچ گیا۔ اسی عرصہ میں کوٹ لکھپت میں نئی جیل بنی تھی۔ 1971ء میں مَیں بھی ''لکھ پتی'' بن گیا۔ تب سے اس جیل کے درو دیوار سے ایک رشتہ استوار ہو گیا۔

2 اپریل 2005ء کو جب میں کوٹ لکھپت جیل میں آیا تو جانتا تھا کہ یہاں لمبے عرصے کیلئے رہنا ہے۔ مَیں نے ایک ٹائم ٹیبل بنایا اور اُس پر سختی سے عمل پیرا ہوں۔

صبح نماز کی ادائیگی کے بعد تلاوت قران مجید کرتا ہوں۔ چائے کی پیالی پیتا ہوں۔ جونہی کمرے کا تالا کھلتا ہے، دالان میں جا کر سیر کرتا ہوں، پھولوں اور پودوں کی نگہداشت کیلئے وقت نکالتا ہوں، نہا دھو کر ناشتہ کرتا ہوں ناشتہ سے فارغ ہونے تک اخبارات آجاتے ہیں۔ مجھے بچپن سے اخبارات کے مطالعہ کا شوق رہا ہے۔ جیل ہو یا باہر کی دُنیا، انگریزی اور اُردو کے تقریباً سب اخبار تفصیل سے پڑھتا ہوں، روزانہ تیرہ (13) اخبارات آتے ہیں، ان کے آنے میں تھوڑی سی دیر ہو جائے تو بے چین ہو جاتا ہوں۔ دس بجے تک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قاری سعید صاحب آجاتے ہیں۔ اُن سے عربی گرامر اور قرآن مجید کا ترجمہ پڑھتا ہوں، پھر ملاقاتی آجاتے ہیں۔ ڈیوڑھی میں جا کر اُن سے تبادلہ خیال ہوتا رہتا ہے، ایک بجے کے قریب واپس آ کر کھانا کھاتا ہوں۔ تین بجے تک آرام کرتا ہوں۔ تین سے پانچ بجے تک مطالعہ کرتا ہوں، پانچ سے چھ بجے تک بیڈمنٹن کھیلتا ہوں، شام چھ ساڑھے چھ بجے مجھے کمرے میں بند کر کے تالا لگا دیا جاتا ہے۔ جونہی تالا لگتا ہے اپنے آپ کو آزاد دُنیا میں پاتا ہوں۔ یہاں مکمل تنہائی ہوتی ہے۔ صبح تک کمرے میں کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔ چابیاں مین گیٹ پر جمع کرا دی جاتی ہیں۔ میرے کمرے کے باہر جو جیل ملازمین موجود ہوتے ہیں وہ بھی میری طرح قیدی ہوتے ہیں۔ کیونکہ احاطہ کے دروازہ کے باہر بھی تالا لگا ہوتا ہے اور اُس تالے کی چابیاں بھی مین گیٹ پر جمع ہوتی ہیں۔

رات کو میں اور میری تنہائی ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے رہتے ہیں۔ 7 بجے شام ملحقہ باورچی خانے میں کھانا گرم کرتا ہوں، چائے بناتا ہوں، ریڈیو پر خبریں سنتا ہوں، میز پر کتابیں سجاتا ہوں اور مطالعہ کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ میرے پاس کتابوں کا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے آزاد دنیا میں کتاب دوست ہوتی ہے اور جیل میں نعمت اپنی جہالت کم کرنے اور مطالعہ کو وسعت دینے کے لئے کتاب کا قیدی ہو گیا ہوں۔ یکسانیت کا شکار ہونے لگوں تو کاغذ اور قلم کے کے ذریعے گفتگو کی کوشش کرتا ہوں۔ گذشتہ اپریل سے دسمبر تک باقاعدہ تحریر کا کام موقوف رہا، مگر اخبارات کیلئے روزانہ بیان تیار کرتا رہا، میں چاہتا تھا کہ قومی معاملات کے بارے میں اپنا اور جماعت کا نقطۂ نظر عوام تک ضرور پہنچایا جائے، بے شمار رکاوٹیں ہیں مگر میں کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتا ہوں۔

رات کو 12 بجے سونے کی تیاری کرتا ہوں، البتہ مطالعے میں دلچسپی کی وجہ سے کئی مرتبہ ساری ساری رات جاگتا ہوں۔ کوئی تحریر یا کتاب شروع کروں تو کوشش ہوتی ہے اسے مکمل کر کے چھوڑوں۔ اِس نظام الاوقات کی وجہ سے جیل کی پابندیوں کا احساس کم ہو جاتا ہے۔ "ہاں! میں باغی ہوں" لکھنے کے بعد بہت تھک گیا تھا۔ سوچتا تھا کہ میں سیاسی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کارکن ہوں، مفکر نہیں ہوں، اس لئے مجھے سیاسی کارکن ہی رہنا چاہئے۔ قید کی طوالت نے مجبور کیا تو دوبارہ قلم اور کاغذ کو سہارا بنالیا۔

ایک سال میں کوئی خاص فکری ارتقاء نہیں ہوسکا۔ لیکن جو آڑے ترچھے تصورات ذہن میں گھد بد کررہے تھے انھیں ضبطِ تحریر میں لانے کا سلسلہ خطوط کے ذریعے جاری رہیگا۔ ان خطوط میں بالواسطہ طور پر چالیس سالوں کا تذکرہ بھی ہوتا رہیگا اور ہوسکتا ہے یہ خطوط قوم کیلئے دعوتِ فکر کا ذریعہ بن جائیں لہٰذا میرے اگلے خط کا انتظار کرنا۔

والسلام

تمہارا والد!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جیل کیا ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

میمونہ بی بی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

میرے والد محترم بچپن میں ہمیں چڑیا گھر دکھانے کے لئے بہاولپور کے شیر باغ میں لے جایا کرتے تھے میں آج تک آپ سب کو کہیں سیر کے لئے نہ لے جاسکا۔ میں نے سوچا تمہیں جیل کی سیر کیوں نہ کرادوں جیل بھی ایک چڑیا گھر ہی تو ہے آج اگر قیدیوں کو نکال کر ان پنجروں میں جانوروں کو بند کیا جائے تو کسی قسم کی معمولی سی تبدیلی لانے کی ضرورت نہیں پڑے گی انہیں سلاخوں اور لوہے کے جنگلوں میں شیروں اور گیدڑوں کو بند کرا سے چڑیا گھر کا نام دیا جاسکتا ہے اور اسے شیر باغ بھی کہا جاسکتا ہے حکمران تو ہمیں پنجروں میں بند دیکھ کر محفوظ ہوتے ہیں تم دلگیر نہ ہونا۔

حضرت ابراہیم نے نمرود سے کہا! میرا رب زندگی دیتا ہے اور موت دیتا ہے۔ نمرود نے اپنے وزیر ہامان کو حکم دیا جیل سے قیدی نکال کر لائے جائیں حکم کی تعمیل ہوئی نمرود نے کہا جن قیدیوں کو پھانسی ملنے الی ہے انہیں رہا کردو اور جو رہا ہونے والے ہیں انہیں قتل کردو حکم پر عمل درآمد ہو گیا نمرود نے کہا تم نے دیکھ لیا میں بھی زندگی دیتا ہوں اور موت بھی دیتا ہوں اس لئے مجھے اپنا خدا تسلیم کیوں نہیں کرتے یہ ہزاروں سال پہلے کا قصہ ہے۔

عزیز مصر کی قید میں حضرت یوسف چھ سال تک جیل میں رہے قیدی کا گناہگار ہونا ضروری نہیں ورنہ یوسف علیہ السلام کی بے گناہی تو ثابت ہو چکی تھی۔ فرعون کی قید سے بنی اسرائیل کی رہائی کے ذکر سے تورات، انجیل اور قرآن کے صفحات مزین ہیں حضرت عیسیٰ کو قید میں ڈالا گیا پھر پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔

جب سے انسان کو شعور ملا اس نے معاشرے کی صف بندی شروع کردی۔ یونان کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پانچ ہزار سالہ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ معاشرتی اصولوں کو توڑنے والوں کو سزا دینے کے لئے انہیں جنگی دشمن کی طرح سماج دشمن قرار دیا گیا ان کا ٹھکانہ قید خانہ کو بنایا گیا سقراط کو بھی سماج دشمن قرار دیا گیا اور اسے قید خانہ میں زہر کا پیالہ پینا پڑا۔

ٹیکسلا میں ہندوستان پر حکومت کرنے والے اشوکا کے دور میں پہلا تحریری آئین معرض وجود میں آیا اس میں بھی جیل قیدی اور سزاؤں کا ذکر موجود ہے۔

حضرت محمد ﷺ نے قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرنے کا حکم دیا، قرآن حکیم تو گردن چھڑانے والوں کو جنت کی بشارت دیتا ہے حضور نے جنگی قیدیوں کو کہا جو قیدی دو مسلمانوں کو تعلیم دے اس کو رہا کر دیا جائے گا اس سے تعلیم کی اہمیت بھی واضح ہوتی ہے اور قیدیوں سے حسن سلوک کو بھی مثال بنایا گیا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے باقاعدہ جیل کا نظام متعارف کیا۔ دور حاضر میں میں ترقی یافتہ ممالک نے جیل کو انسانی زندگی سدھارنے کے مراکز میں تبدیل کر دیا ہے۔ سزا کے خوف سے جرائم پر قابو پایا جا سکتا ہے مگر اصلاح معاشرے کے لئے صرف خوف کافی نہیں۔ برطانیہ میں جیب کتروں کو سرعام پھانسی کا رواج تھا مگر پھانسی دیکھنے والے اجتماع میں لوگوں کی جیب تراشی کی واردات ہو رہی ہوتی تھی لہذا برطانیہ نے اپنے قوانین کو تبدیل کر کے اصلاحی رنگ کو نمایاں کر دیا۔

ترقی پذیر ممالک میں جیلیں ابھی تک خوف کی علامت ہیں یہ خوف اب سفید پوش طبقے تک محدود ہے۔ ہمارے سیاستدان جیل کے خوف اور لالچ کی وجہ سے آئین توڑنے والوں کے ساتھی بن جاتے ہیں۔ جیلوں میں بے گناہ افراد کو دھکیل دیا جاتا ہے اور ان پر جیل کے ظالمانہ نظام کا شکنجہ کس دیا جاتا ہے طاقت ور سزا سے بچ جاتا ہے۔ ہماری جیلیں غریب اور متوسط طبقے کے افراد سے بھری پڑی ہیں شاید ہی کوئی باوسیلہ فرد جیل میں ہو۔

اصل سزا قیدی کو نہیں ملتی ان کے خاندان اور پورے معاشرے کو ملتی ہے۔ معاشرے میں توازن برقرار رکھنے کے لئے جرائم پیشہ افراد کو سزا دیئے بغیر چارہ نہیں مگر سزا ایسی ہونی چاہیے جس سے مزید جرائم پیدا نہ ہوں اس مقصد کے حصول کے لئے جیل کے پورے نظام

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کو بدلنے کی ضرورت ہے۔

ازمنہ قدیم سے لے کر اب تک جیلوں میں اصلاحات کا سلسلہ بھی ساتھ ساتھ جاری رہا ہے۔ پرانے وقتوں میں قدیوں کو شہر میں لا کر ان سے اپنا پیٹ بھرنے کے لئے دردر پر بھیک منگوائی جاتی تھی۔ کابل کی جیل پل چرخی میں تو یہ سلسلہ کافی عرصہ تک جاری رہا۔ جیلوں کی ایک قسم ایسی بھی تھی کہ قیدی کو کنوئیں میں ڈال دیا جاتا اور پیٹ بھرنے کے لئے رسی کے ذریعے اسے زندہ رکھنے کے لئے کھانا پہنچایا جاتا۔

فیوڈل اور قبائل ڈھانچے میں جو ذاتی جیلوں کا رواج ابھی تک موجود ہے۔ اگر کوئی سردار یا جاگیردار حکومت کی فرمانبرداری نہ کرے تو ہمارا میڈیا اس کی جیلوں پر خصوصی فیچر چھاپتا ہے اور اسے مہذب معاشرے کی توہین قرار دیتا ہے اگر وہ سردار اور حکومت کی اطاعت قبول کرلے تو سب کچھ برداشت کرلیا جاتا ہے۔

میمونہ بی بی!

چونکہ تمہیں جیل کی سیر کرانی ہے اس لئے مناسب ہوگا کہ تمہیں یہاں کی زبان بھی آتی ہو اگرچہ بے زبانی ہی جیل کی زبان ہے عام زندگی میں جس طرح زبان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا۔ اسی طرح جیل کی اپنی زبان ہے میں روزمرہ کی اس زبان کی لغت کے بارے میں تفصیل میں تو نہیں جاسکتا چند اصلاحات حاضر ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

جیل کی زبان

ملاقات ملاقات ملاقات، دورہ دورہ دورہ، موت موت موت، تلاشی تلاشی، پرچہ پرچہ پرچہ، مشقت مشقت مشقت۔ تم حیران ہو رہی ہو کہ میں نے کس زبان میں گفتگو شروع کردی۔ یہی تو جیل کی روزمرہ کی زبان ہے۔ اگر کوئی دوزخ کے نظام کو سمجھنا چاہے تو اُسے چند روز کیلئے جیل میں ضرور آنا چاہئے۔ کیونکہ جیل دُنیا میں دوزخ کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دوزخ میں پھانسی گھاٹ نہیں ہے اور وہاں کے فرشتے رشوت اور سفارش کے بغیر کام کرتے ہیں۔ جیل میں پتہ بھی رشوت کے بغیر نہیں ہل

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سکتا۔ جیل میں داخل ہوتے ہی جو لفظ اور آوازیں آپ سنتے ہیں اُنکی تفصیل کیلئے ایک الگ کتاب درکار ہے۔ چند اصطلاحات کا ذکر کئے دیتا ہوں، اردلی، نمبردار، دربان، چیف چکر، دھوبی خانہ، قالین بافی، معافی، کمبل، سزائے موت کی ملاقات، پلاسٹک کے برتن، تھپڑ گھونسے، جہاز بنانا، وارنٹ نکالنا، وارنٹی۔ جیل کی جکڑ بندیوں کے نظام سے تمہیں برطانیہ کے نوآبادیاتی نظام کو سمجھنا آسان ہو جائیگا۔ جیل کے اندر معاشرے کے منہ زور لوگوں کو، بغیر اسلحہ کے، اتنا بے بس کر دیا جاتا ہے کہ وہ کسی سدھائے ہوئے جانور کی طرح جیل حکام کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ سپاہی سے لیکر سپرنٹنڈنٹ کے پاس ایک چھڑی کے علاوہ کوئی اسلحہ نہیں ہوتا، مگر جیل سپرنٹنڈنٹ کے اختیارات مغل بادشاہوں سے بھی زیادہ ہیں۔ وہ سپریم کورٹ کی طرف سے دی گئی پچیس سال قید بھی معافیاں دے دے کر آدھی کر سکتا ہے۔ قیدی کی سب سے بڑی خواہش آزادی ہوتی ہے اور آزادی سپرنٹنڈنٹ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ سپرنٹنڈنٹ عام قیدی کی نظر میں ایک مافوق الفطرت چیز ہے۔ ہزاروں قیدی ہر ہفتے دورے کے وقت اس کے قدموں کی چاپ سنتے ہیں۔ وہ ہر ایک کو دیکھ سکتا ہے اُسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ قیدی سالہا سال جیل میں گذار کر چلے جاتے ہیں، مگر اس کی شکل سے نا آشنا ہوتے ہیں۔ کیونکہ دورے کے وقت وہ قطاروں میں زمین پر بیٹھے ہوتے ہیں، انھیں نظر اٹھا کر دیکھنے کی اجازت نہیں ہوتی، اگر انہوں نے اپنی عرضداشت پیش کرنی ہو تو جھکی نظروں سے کرتے ہیں۔ سوال کرنا گستاخی کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے، اور اگر قیدی نظر اٹھا کر دیکھے تو اسے بغاوت سمجھا جاتا ہے، اور پھر بغاوت کی سزا تو تم جانتی ہو۔

دورے سے پہلے مخصوص فضا پیدا کی جاتی ہے۔ صبح سویرے جاگ کر اپنی ہر ایک چیز کی صفائی کرنا پڑتی ہے۔ جیل کے دورے والے حصے کو قیدیوں کی بیگار سے چمکایا جاتا ہے۔ محشر کا منظر ہوتا ہے۔ قیدی کا تمام سامان باہر نکال کر رکھ دیا جاتا ہے۔ اس کا اعمال نامہ بھی سامنے کی دیوار پر لگایا جاتا ہے۔ اس پر اُس کے مقدمات اور سزا کی تفصیل ہوتی ہے۔ گتے کے اِس ٹکڑے کو جیل کی زبان میں ٹکٹ کہتے ہیں۔ اُسے اسمبلی کا ٹکٹ نہ سمجھ لینا، یہ دنیاوی دوزخ کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ٹلک ہے۔ سپرنٹنڈنٹ ڈیوڑھی سے نکلتا ہے تو گھنٹی بجائی جاتی ہے، یہ گھنٹی گویا صُورِ اسرافیل ہے جس کا مطلب ہے کہ دورہ چل پڑا ہے۔ دورے کے وقت سپرنٹنڈنٹ کا نام، سپرنٹنڈنٹ کی بجائے، دورہ ہوتا ہے۔ ہر چیز اپنی جگہ پر رُک جاتی ہے۔ سانس بھی آہستہ لینا پڑتی ہے۔ جس جگہ سے دورہ گذرتا ہے۔ وہاں کے چھوٹے ملازمین پر جان کنی کا عالم طاری ہوتا ہے۔ دورے کا آغاز ہوتے ہی پل پل کی خبریں آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ اب دورہ لنگر میں ہے، اب دورہ بلاک دو میں ہے، اب دورہ پھانسی گھاٹ کے قریب ہے۔ انچارج وارڈر وحشتناک انداز سے پل پل کی خبر سُناتا ہے۔ قیدیوں کی اوپر کی سانس اوپر ہوتی ہے اور تلے کی تلے۔ تین سو افراد کی پوری بارک کو سانپ سونگھ جاتا ہے پتہ بھی گرے تو اُسکی آواز آتی ہے۔ یہ حقیقت ہے، افسانہ نہیں کہ ایک سپرنٹنڈنٹ دورہ کر رہا تھا۔ درخت سے کوے نے بیٹ کردی جو کہ دیوار پر آگری۔ صاحب بہادر کو بہت برا لگا، انہوں نے وارڈر (WARDER) سے کہا! یہ کیا ہے؟ وہ بیچارہ سر جھکائے کھڑا تھا۔ تھوڑی دیر میں اسکی معطلی کا حکم پہنچ گیا اور اسکی بیلٹ اتار لی گئی۔ ایک سپرنٹنڈنٹ کے دورے کے دوران ایک بیل کے ڈکارنے پر بے زبان کو کوڑوں کی سزا سنائی گئی۔ اسے بے ادبی کی جرأت کیسے ہوئی؟ پرندوں کی آواز بھی اگر سپرنٹنڈنٹ کو ناگوار گزرے تو ملازموں کی کارکردگی پر حرف آجاتا ہے۔ صرف ایک آواز گونجتی ہے!

"پریڈ ہوشیار"

یہ آواز بادشاہوں کے "با ملاحظہ ہوشیار نگاہ رو برو بادشاہ سلامت تشریف لاتے ہیں" کا ترجمہ ہے۔ جس احاطہ میں سپرنٹنڈنٹ داخل ہوتا ہے چکر چیف اونچی آواز میں اس کی آمد کا اعلان کرتا ہے۔ سپرنٹنڈنٹ اگر کوئی اعتراض کیے بغیر خاموشی سے اگلے احاطے میں چلا جائے تو چھوٹے ملازمین دورے کی کامیابی پر ایکدوسرے کو مبارکباد دیتے ہیں۔ اِسی طرح کے دورے متعلقہ وزیر اور اعلیٰ حکام بھی کرتے رہتے ہیں مگر سب سے خوفناک دورہ سپرنٹنڈنٹ کا ہی ہوتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جیل کا سٹاف قیدیوں کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ پانچ ہزار قیدیوں کو قابو میں رکھنے کیلئے دو تین سو کا سٹاف کافی سمجھا جاتا ہے۔ باقی تمام کام قیدیوں سے لیا جاتا ہے۔ جب ان کے اندر سے روح آزادی کھینچ لی جاتی ہے تو وہ جیل کے نظام کو چلانے کیلئے بہترین معاون ہوتے ہیں۔ وہی مخبری بھی کرتے ہیں اور اپنے قیدی ساتھیوں کو سزا دینے میں شامل ہوتے ہیں۔ مخبری اور معاونت کرنے والے قیدیوں کو نگران کہتے ہیں۔ ہمارے ملک میں نگران وزیر اعظم کی اصطلاح شاید جیل کے نگرانوں سے لی گئی ہے۔ دفتر چلانے سے لے کر گٹروں کی صفائی تک ہر کام قیدی کرتے ہیں۔ بالکل نو آبادیاتی نظام کی طرح۔ جس طرح دس بارہ ہزار انگریز تیس کروڑ کے ہندوستان کو مقامی ٹوریوں سے کنٹرول کرتے رہے اور عصر حاضر میں فوجی حکمران کو اقتدار پرست سیاستدانوں کا تعاون حاصل ہو تو پورا ملک جیل بن جاتا ہے۔

انگریز کے دور میں جیل سپرنٹنڈنٹس زیادہ تر گورے ہوتے تھے کیونکہ انگریز آزادی کی تحریکوں کو کچلنے کیلئے جیل کو ہیبت ناک جگہ بنا کر خوف کی علامت کے طور پر رعایا کے سامنے لانا چاہتا تھا، تاکہ کوئی سر اٹھا کر چلنے کی جرأت نہ کر سکے۔ بعد میں دیسی حکمرانوں نے بھی اسی نظام کو اپنے عوام کو شکنجے میں کسنے کیلئے جاری رکھا۔ تمام عملے کی تنخواہیں بہت قلیل ہیں اور ڈیوٹی بہت سخت۔ سپرنٹنڈنٹ سے لے کر عام سپاہی اپنے آپ کو حکمران طبقہ سمجھتا ہے اور بڑے سے بڑے قیدی کو (خواہ وہ سابق وزیر اعظم ہی کیوں نہ ہو) اپنی رعیت۔ کم تنخواہوں کی وجہ سے وہ ہر قیدی کا خون نچوڑتے ہیں اور سخت ڈیوٹی انہیں سنگدل بنا دیتی ہے۔ سپرنٹنڈنٹ جو جیل کا بادشاہ ہوتا ہے سترھویں، اٹھارہویں گریڈ سے بڑا افسر نہیں ہوتا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کیا جاسکتا کہ اگر جیل میں انتخابات کرائے جائیں تو سپرنٹنڈنٹ بلا مقابلہ منتخب ہوگا۔ اگر کوئی وزیر اعظم مقابلے میں آجائے تو میرا ووٹ پھر بھی سپرنٹنڈنٹ کے خلاف نہیں ہوگا۔ وردی والے کو انکار کا نتیجہ دیکھ چکا ہوں۔ لہٰذا مزاج دُرست ہو گئے ہیں۔ نو آبادیاتی نظام کے مظہر انگریز نے اپنے ملک کی جیلوں کو فلاحی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اداروں میں تبدیل کر دیا ہے مگر یہاں ابھی تک یہ انسانیت کی تذلیل کے مراکز ہیں۔

کرائم یونیورسٹی

پہلے وقتوں میں جیل کو جرائم کی نرسری کہا جاتا تھا مگر اب اسے جرائم سکھانے کی یونیورسٹی کہا جاتا ہے جو ایک مرتبہ جیل میں آ جاتا ہے اس کا خوف ختم ہو جاتا ہے اسے اپنے ہم پیشہ افراد کے ساتھ رہنے سے جرم کے خلاف نفرت بھی نہیں رہتی بلکہ اسے یہاں آ کر معلوم ہوتا ہے جو جتنا بڑا مجرم یا ڈاکو ہے۔ اس کی اتنی زیادہ عزت افزائی ہو رہی ہے وہ اپنی دولت اور ''شہرت'' کے بل بوتے پر زندگی کی تمام سہولتوں کے ساتھ رہ رہے ہیں اب تو مافیا والے جیل میں رہ کر خود کو محفوظ کر لیتے ہیں اور باہر کی دنیا کے مافیا کو چلاتے ہیں یہاں بیٹھ کر نئے آنے والوں میں سے ''باصلاحیت'' افراد کو بھرتی کرتے ہیں یہیں بیٹھ کر ان کی تربیت کرتے ہیں۔ نئے آنے والے بھی یہ سمجھتے ہیں کہ اب وہ معمول کی زندگی نہیں گزار سکتے نہ ہی معاشرہ انہیں قبول کرے گا اس لئے وہ ان گھاگ جرائم پیشہ افراد کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کر لیتے ہیں جرائم کی تربیت میں P-H-D کرانا ہو تو کسی بچے کو ایک مرتبہ جیل آنے دیں۔

میں نے خط کے شروع میں جیل کی اصطلاحات کا ذکر کیا تھا تمھاری معلومات کیلئے چند ایک کی وضاحت کرتا ہوں تاکہ تمہیں اس زبان سے شناسائی ہو سکے جو چالیس سال سے تمہارے والد کی زندگی کا حصہ ہے۔

ڈیوڑھی

جیل کو اگر الگ ملک تسلیم کر دیا جائے تو ڈیوڑھی بیک وقت اس کا دارالخلافہ اور G.H.Q ہے۔ یہاں سے احکامات جاری ہوتے ہیں۔ سپرنٹنڈنٹ وردی میں ملبوس صدر بھی ہوتا ہے اور کمانڈر انچیف بھی۔ اس کی زبان سے نکلا ہر لفظ جیل کے آئین یعنی جیل مینول پر بھاری ہوتا ہے۔ مرکزی دروازے کے ساتھ ہی جیل کے دفاتر ہیں، اِسی کو جیل کی ڈیوڑھی کہا جاتا ہے۔ جونہی مین گیٹ سے داخل ہوں تو نئے آنے والے کے نام کا اندراج ہوتا ہے۔ ہتھکڑیاں کھول دی جاتی ہیں۔ پولیس والے قیدی کو جیل حکام کے سپرد کر دیتے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں۔ باہر کی دنیا کا رابطہ ختم ہو جاتا ہے۔ ڈیوڑھی کے اندرونی دروازے کی کھڑکی سے گذرتے ہی جیل کے قوانین پر عملدرآمد کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، یہ الگ دنیا ہے یہاں پاکستان کی کرنسی رکھنا بھی جرم ہے۔

ملاحظہ

ڈیوڑھی سے نکلنے کے بعد تلاشی ہوتی ہے اور قیدی کو نئے ملاحظے کیلئے بند کر دیا جاتا ہے۔ اگلی صبح 6 بجے نئے ملزمان کو ملاحظہ کیلئے چکّر سے گذارتے ہوئے ہسپتال میں ان کا قد، وزن، عمر، تعلیم نوٹ کی جاتی ہے۔ آنے بہانے درگت شروع رہتی ہے۔ یہ کام نگران قیدی کرتے ہیں، بعد ازاں ہر ایک کے سینے پر ایک نمبر میڈل کی طرح سجایا جاتا ہے۔ جسے قیدی نمبر کہتے ہیں، گویا، یہ نئی مملکت میں رہنے کا پاسپورٹ ہے، سب کی تصویریں اتاری جاتی ہیں۔ سخت سردی کے موسم میں بھی نئے آنے والے سویٹر اور جوتے اتار کر سر جھکائے خوفزدہ، زمین پر بچھی صفوں پر اپنے نمبروں کی ترتیب سے بیٹھتے ہیں، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اِن سے اِن کے کردہ ناکردہ جرائم سے متعلق پوچھتا ہے۔ اگر اسے کوئی بات ناگوار گذرے تو وہ اپنے ہاتھ میں پکڑی پنسل کو اٹھاتا ہے۔ یہ اس چیز کا اشارا ہے کہ اس قیدی کو اٹھالو۔ نگران قیدی اِس نئے قیدی کو اٹھا کر مارنا شروع کر دیتے ہیں اور انتظار کرتے ہیں کہ کب پنسل نیچے ہو۔ سپرنٹنڈنٹ کے آنے پر ملاحظہ کی باقاعدہ کارروائی شروع ہوتی ہے۔ بعد میں جو ہوتا ہے اس کا اندازہ تمہیں ہو گیا ہوگا۔ یہ سلسلہ کم وبیش 11 بجے تک رہتا ہے۔ ملاحظہ کے بعد کوٹ موقعے کی آسمان سے باتیں کرتی ہوئی دیواروں کے اندر کی زندگی شروع ہو جاتی ہے، جس کی اپنی زبان ہے، جس کا مختصر تعارف کرانا چاہتا ہوں۔

گنتی پڑنا

ملاحظہ سے فارغ ہونے کے بعد آنیوالے نئے قیدیوں کو مختلف بارکوں یا کوٹھڑیوں میں پھینک دیا جاتا ہے۔ گویا اب وہ جیل کے باشندے تسلیم کر لئے گئے ہیں۔ یہ گنتی پڑنا کہلاتا ہے۔ گنتی پڑھنا ایسے ہی ہے جیسے کسی ملک کی شہریت مل جائے اگر کوئی قدی کی بجائے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حوالاتی ہے تو اسے مکمل شہریت کی بجائے ''گرین گارڈ'' جیسے حقوق مل جاتے ہیں۔ جب تک گنتی نہ پڑے قیدی کو راشن نہیں ملتا۔ گنتی پڑتے قیدی کو جیل کے حقوق مل جاتے ہیں اسے کھڈا ملنے کا امکان بڑھ جاتا ہے اگر قیدی کی کسی اچھی جگہ گنتی پڑ جائے تو دوسرے قیدی آ کر اسے مبارکباد دیتے ہیں اس محاورے کی سمجھ بھی آ جاتی ہے کہ فلاں کسی گنتی میں شمار نہیں۔

اُڑتی

اُڑتی سے مُراد ہے کہ ملزم ہر روز اپنے سامان کی گھٹڑی سر پر اُٹھائے رات نئی کوٹھڑی میں نئے لوگوں کے ساتھ گزارتا ہے اور وہ نہیں جانتا کہ آنیوالی رات کس کوٹھری اور کن لوگوں کے ساتھ بسر ہوگی۔ ہماری جمہوریت کو بھی اڑتی لگی ہوئی ہے اسے نہیں معلوم اس نے ہر نئے حاکم کی تبدیلی کے ساتھ کیسے گزارا کرنا ہے. جمہوریت ملزم کی طرح ہر رات اجنبی چہروں کے ساتھ گزارتی ہے کبھی گورنر جنرل، کبھی صدر، کبھی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر، کبھی چیف ایگزیکٹو، کبھی سویلین مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر، کبھی جمہوریت وردی کے ساتھ ہوتی ہے اور کبھی وردی اتار دیتی ہے۔

پیشی

کوئی ملزم یا اہلکار کسی جرم یا غلطی کا مرتکب ٹھہرے یا اس سے کوئی مشتبہ اور غیر قانونی چیز مثلاً منشیات، چاقو، چھری یا موبائل وغیرہ برآمد ہو جائے تو اس کو جیل سپرنٹنڈنٹ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور اسے سزا دی جاتی ہے اس عمل کو پیشی کہتے ہیں۔

قصوری بند

جیل میں اگر کوئی جُرم کرے تو اُسے سپرنٹنڈنٹ سزا سُناتا ہے۔ اِن مجرموں کو ایسی کوٹھڑیوں میں رکھا جاتا ہے جو 24 گھنٹے بند رہتی ہیں۔ اُن کی ملاقاتیں بھی بند کر دی جاتی ہیں۔ انہیں قصوری بند (PUNISHMENT BLOCK) کہا جاتا ہے۔ مجھے بھی بائیس دِن کیلئے فوجی حکمرانوں نے اِس چکی میں رکھا۔ سخت گرمیوں کا موسم تھا چکی تندور بنی ہوئی تھی میں سیمنٹ کے فرش پر ردی کے کاغذ بچھا کر جسم کو جلنے سے بچانے کی کوشش کرتا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تشدد کی وجہ سے جسم زخموں سے چور تھا، تپتا ہوا فرش زخموں میں چلچلاہٹ پیدا کر دیتا، مجھے آج تک نہیں بتایا گیا کہ میں نے جیل کا کون سا قانون توڑا تھا۔ میں جیل ملازموں کو اس کا ذمہ دار نہیں ٹھہراتا، وردی والوں پر دوسری وردی والوں کے حکم کی تعمیل لازم تھی ویسے بھی فوجی حکمرانوں کے دور میں پوری قوم قصوری چکی میں بند ہو چکی ہے۔ میرا شکوہ بے جا ہے۔ جس طرح عام زندگی میں تھانے کا خوف ہوتا ہے۔ قصوری چکی بھی جیل کا تھانہ ہے یہ جگہ جیل کی چار دیواری کے اندر خوف کی علامت ہے اگر جیل حکام کسی کو ڈرانا چاہیں تو کہتے ہیں تمہیں قصوری چکی میں بند کر دیا جائے گا یہ سنتے ہی بڑے سے بڑے مجرم کی جان ہوا ہو جاتی ہے اور وہ اس سزا سے بچنے کے لئے ہر طرح کی خدمت کے لئے تیار ہو جاتا ہے 10x8 فٹ کی تنگ جگہ پر دس سے بارہ قیدی ٹھونس دیئے جاتے ہیں یہی ان کا سونے کا کمرہ ہے، یہی غسل خانہ ہے اور یہی جگہ کچن کا کام دیتی ہے سورج دیکھنا نصیب نہیں ہوتا۔

A...B کلاس قیدی

A کلاس جیل کا وہ حصہ ہے جس میں خاص شخصیات یعنی سابقہ وزراء وغیرہ اور B کلاس میں مختلف درجوں کے افسران اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ رہتا ہے۔ انھیں اُن کے کام کرنے کیلئے مشقتی مہیا کئے جاتے ہیں اور اُن کے رُتبے کے مطابق کچا راشن اور دیگر سہولیات میسر ہوتی ہیں۔ جیل قوانین کے مطابق سپرنٹنڈنٹ جیل میں کسی جگہ کو A یا B کلاس بنا سکتا ہے۔ جب میں کیمپ جیل میں تھا تو مجھے چودہ ہفتے تک موت کی کوٹھڑی میں رکھا گیا۔ اس طرح عدالتی حکم سے ملنے والی "بی کلاس" بھی مجھے مل گئی اور سزا بھی جاری رہی اسی طرح اڈیالہ جیل میں عدالت نے مجھے اے کلاس کی سہولت سے سرفراز فرمایا مگر جیل حکام چونکہ مجھے قید تنہائی میں رکھنا چاہتے تھے انہوں نے سیکورٹی سیل کو ہی اے کلاس کا درجہ دے دیا حالانکہ اڈیالہ جیل، واحد جیل ہے جہاں پر A کلاس قیدیوں کے لئے ایک خوبصورت بلاک بنایا گیا ہے میں ایک سال تک وہاں جانے کی کوشش کرتا رہا مگر مجھے صرف چودہ دن وہاں رکھا گیا یہاں پر سید یوسف رضا گیلانی سمیت پندرہ بیس افراد موجود تھے جو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رات دن ایک دوسرے کو مل سکتے تھے یہ ایک طرح کی ہوسٹل لائف تھی جہاں ہم ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں ویسے تو جیل کی ہر جگہ جیل ہوتی ہے مگر ان تین سالوں میں اڈیالہ جیل کے یہ چودہ دن کافی آرام دہ تھے۔

سیکورٹی سیل

خطرناک قیدیوں کیلئے پھانسی گھاٹ کیساتھ الگ سیل بنایا گیا ہے۔ یہ جیل کے اندر ایک اور جیل ہے، اسکی دیواروں پر خاردار تاریں لگا کر اُس میں بجلی چھوڑ دی جاتی ہے۔ پانچ سو قیدیوں کو کنٹرول کرنے کیلئے جتنا عملہ درکار ہوتا ہے، اُتنا اِس ایک سیل کیلئے مخصوص کیا جاتا ہے۔ اِس سیل میں رہنے والے قیدی کے رابطے پوری جیل سے منقطع کر دیئے جاتے ہیں تاکہ سیل کے اندر کے واقعات مزید خفیہ رہ سکیں۔ اب اِس سیکورٹی سیل پر جدید کیمرے لگا دیئے گئے ہیں اور مواصلاتی نظام کو جام کرنے کیلئے مزید مشینری نصب کر دی گئی ہے۔ میں اسی سیل کا باسی ہوں۔ مجھے اڈیالہ جیل راولپنڈی میں بھی سیکورٹی سیل میں رکھا گیا تھا۔ میرے سیل کے سامنے قصوری چکیاں بنائی گئی ہیں جہاں قیدیوں پر بے پناہ تشدد کیا جاتا تھا میں روزانہ ان کی چیخوں کو سنتا جو نا قابل برداشت تھیں میں نے جیل حرام کو سختی سے منع کیا تو انہوں نے تشدد بند کر دیا۔

میں گزشتہ تین سال سے قید تنہائی میں ہوں۔ پاکستان کا قانون کسی کو تین مہینے سے زیادہ قید تنہائی میں نہیں رکھ سکتا۔ اقوامِ متحدہ بھی قید تنہائی کو دنیا کی تمام سزاؤں سے سخت قرار دے کر اُسکی شدید مذمت کرتی ہے۔ پاکستان کی تاریخ میں تین سال تک کوئی قیدی تنہائی میں نہیں رکھا گیا۔ مجھ سے پہلے ذوالفقار علی بھٹو کو چودہ مہینے الگ تھلگ رکھا گیا، یا پھر کچھ عرصہ کے لئے میاں نواز شریف کو اٹک کے قلعے میں گوشہ تنہائی میسر آیا۔

ہسپتال

جیل کے اندر پانچ ہزار آبادی کا ایک پورا شہر آباد ہے۔ مریضوں کیلئے جیل میں ہسپتال بھی موجود ہے۔ جس میں میڈیکل چیک اپ کا سامان تو موجود ہے، لیکن شاید ہی کوئی چیز

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ٹھیک ہو، اگر کوئی چیز صحیح ہو تو بھی اِسکا کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ ان کا استعمال کسی کو نہیں آتا۔ جیل میں کوئی مستقل ڈاکٹر نہیں ہے۔ مجھے تو اِس ہسپتال میں جانے کی اجازت بھی نہیں ہے۔ میں ایک مرتبہ بغیر اجازت ہسپتال چلا گیا تو ڈاکٹر کے خلاف کارروائی کی گئی۔

بیڑیاں

کچھ ملزمان کو عدالت سے اور کچھ کو جیل میں بیڑیوں کی سزا سنائی جاتی ہے۔ یہ دونوں پاؤں میں کڑوں کی طرح چڑھائی جاتی ہیں اور ان کے ساتھ لگی سلاخیں اوپر بیلٹ کے ساتھ کس کر کمر پر باندھی جاتی ہیں یہ بہت سخت سزا ہے۔ مُسلسل بیڑیوں میں رہنے کی وجہ سے اِنسان اپاہج ہو جاتا ہے۔ ملک کی جمہوریت کو بھی اسی طرح کی بیڑیاں لگی ہوئی ہیں جس کی وجہ سے ملکی معیشت اپاہج ہو چکی ہے۔

پنجہ

مختلف قیدیوں کو جیل کے اندر اور باہر کام کروانے کیلئے بیڑیاں لگائی جاتی ہیں جو کہ "پنجہ" کہلاتے ہیں مختلف کاموں کیلئے مختلف پنجے ہوتے ہیں پنجے میں ان قیدیوں کو شامل کیا جاتا ہے جو سال چھ مہینے میں رہا ہونے والے ہوتے ہیں ان پر اعتماد کرلیا جاتا کہ وہ فرار ہو کر اپنے لئے مزید مشکلات پیدا نہیں کریں گے اس کے باوجود بارہا ایسا ہوتا ہے کہ ''آزادی'' کی جھلک دیکھتے ہی وہ فرار ہو جاتے ہیں ان میں سے اکثر پکڑے جاتے ہیں۔ انہیں دوسروں کے لئے درسِ عبرت بنانے کے لئے سخت سزا دی جاتی ہے۔ وہ لمبا عرصہ جیل کی دیواروں میں گزارتے ہیں مگر آزادی کی کشش ایسی ہے کہ پھر بھی کوئی نہ کوئی پنجے سے فرار ہوتا رہتا ہے۔

بیڑی پنجہ

جیل کے بیرونی حصہ کی صفائی کیلئے جانے والا پنجہ بیڑی پنجہ ہوتا ہے۔ (اسے سنگل والی بیڑی پہنائی جاتی ہے) اسے تم کسی فوجی حکمران کی بنائی ہوئی سیاسی جماعت سمجھ لو جو حکمرانوں کی گندگی صاف کرتی ہے اس کے بدلے میں اسے جیل کے باہر کی دنیا دیکھنے کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

موقعہ مل جاتا ہے۔ان میں سے ایک آدھ فرار ہو جاتا تھا سنا ہے ان کو مزید قابو کرنے کے لئے امریکہ سے جدید بیڑیاں اور ہتھکڑیاں منگوائی گئی ہیں۔

باغیچہ پنجہ

جیل افسران کی کوٹھیوں میں بنے باغات کی دیکھ بھال جیل کے قیدی کرتے ہیں۔ یہ مخصوص قیدی ہوتے ہیں اور باغیچہ پنجہ کہلاتے ہیں۔(ان کی سزائیں مختصر ہوتی ہیں)

مالی پنجہ

جیل کے اندر پھولوں کی کیاریوں اور گھاس وغیرہ کی صفائی ستھرائی کا ذمہ مالی پنجہ کے سپرد ہوتا ہے۔

بوٹی پنجہ

بوٹی پنجہ جیل کے باہر فصلوں میں کام کرتا ہے۔قیدیوں کیلئے اس میں سبزیاں اُگائی جاتی ہیں۔

شیر پنجہ

ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور کھانے کے اور یا اونچی دکان پھیکا پکوان..........
شیر پنجہ کوئی نامی گرامی پہلوان یا طاقتور لوگ نہیں ہوتے بلکہ تمام قسم کے گٹر اور گندگی کو صاف کرنے والے شیر پنجہ ہوتے ہیں۔

کھڈا / چری

بارکوں میں رہنے، یعنی سونے کیلئے قیدیوں کو جو جگہ دستیاب ہوتی ہے اسے کھڈا کہتے ہیں۔ چونکہ جیل میں گنجائش سے زیادہ قیدی ہیں۔ اس لئے ہر کسی کے پاس اپنا کھڈا نہیں ہوتا۔اُڑتی والے روزانہ جگہ بدلتے ہیں، اِسلئے اُن کا اپنا کوئی کھڈا نہیں ہوتا۔جیل میں آئے روز کھڈے کی وجہ سے پھڈا رہتا ہے۔جیل میں ایک بات یہ بھی مشہور ہے کہ جیل میں ایک کھڈا کا مالک ایسا ہی ہے جیسا کہ ڈیفنس میں کوٹھی کا.... بھی۔ چری، کھڈے ہی کی ایک قسم ہے۔کھڈا نسبتاً پکا اور چری مٹی کی بنی ہوتی ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کچھ بارکوں میں چارپائیاں بھی مہیا کی گئی ہیں یہ چارپائیاں کئی منزلہ ہوتی ہیں فرش سے روشندانوں تک قیدی ان پر سوتے ہیں جگہ کی کمی کی وجہ سے قیدی غسل خانے میں بھی سو جاتے ہیں اب ہر بارک میں ایک اضافی غسل خانہ بھی بنا دیا گیا ہے مگر پھر بھی غسل خانے کے باہر لمبی قطار لگی ہوتی ہے اکثر اوقات غسل خانوں میں پانی اور بجلی دونوں غائب ہوتے ہیں جس کی وجہ سے پوری بارک میں بدبو پھیل جاتی ہے۔

بارک اور بلاک

قیدیوں کے رہنے والی جگہ تو بارک ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی قصوری بند، خطرناک افراد، سزائے موت کے قیدی اور ایسے افراد جن کی مخالف پارٹی بھی متعلقہ جیل میں ہی ہو، انہیں علیحدہ چکیوں میں رکھا جاتا ہے۔ اُن کیلئے الگ الگ احاطوں پر بلاک بنے ہوئے ہیں۔ اس نظام کے ذریعے امریکہ کے نیو ورلڈ آرڈر کو باسانی سمجھا جاسکتا ہے۔ امریکہ بھی دنیا کو بارک اور بلاک میں تقسیم کرتا ہے۔ جو بلاک اس کا حکم نہ مانے اسے دہشت گرد کہہ کر الگ کر کے قصوری چکیوں میں رکھا جاتا ہے اس کی نگرانی کے لئے اتحادی فوجیں آجاتی ہیں۔ قوموں کے جھگڑوں میں زبردستی ثالث بن کر اس کے وسائل پر قبضہ کرلیا جاتا ہے۔

حوالاتی/قیدی

جن ملزمان کو سزا نہیں سنائی گئی ہوتی وہ حوالاتی اور سزا یافتہ، قیدی کہلاتے ہیں۔ حوالاتی سے مشقت نہیں لی جاتی اور نہ ہی وہ قیدی کی وردی پہنتا ہے۔

ملاقات

ملاقات سے زیادہ میٹھا لفظ قیدی کی زندگی میں نہیں ہوتا عزیزوں سے ملنے کا منظر دیکھنے والا ہوتا ہے اگرچہ قیدی اور ملنے والوں کے درمیان لوہے کی جالیاں حائل ہوتی ہیں رش کی وجہ سے ایک دوسرے کی آواز بھی صاف سنائی نہیں دیتی، پھر بھی یہ ایک جشن کا سماں ہوتا ہے عزیز و اقارب قیدی کے لئے کھانے پینے کا سامان لاتے ہیں، چوری چھپے کچھ نقدی بھی دے جاتے ہیں جس قیدی کی جتنی زیادہ ملاقاتیں آئیں اسے اتنا بڑا خوش بخت سمجھا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جاتا ہے کئی قیدیوں کی سالہا سال تک ملاقاتیں نہیں آتیں اسے ملازم اور ساتھی قیدی بھی لاوارث ہونے کے طعنے دیتے رہتے ہیں اس کی زندگی قابل رحم ہوتی ہے مگر جیل میں رحم کہاں۔

پرچہ بولنا

جن کی ملاقات آتی ہے، اُن کی فہرست ایک پرچے پر درج ہوتی ہے۔ پھر اس پرچے کو بارکوں میں پکارا جاتا ہے۔ اگر بارکوں میں کسی کی کوئی چیز گم ہو جائے یا کوئی خاص اعلان کرنا مقصود ہو تو کوئی فرد اُٹھ کر اونچی آواز میں پرچہ بولتا ہے۔

ڈاک

عام ڈاک کے علاوہ جیل کے اندر جو کوئی قیدی یا ملازم غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہو یا مخبریاں کرتا ہو وہ ڈاک کہلاتا ہے۔

نگرانی کا نظام پترا

پترا، دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک جیل میں قیدی افواہ پھیلانے کو پترا کہتے ہیں۔ دوسرا جیل کی چار دیواری کے اندر کوٹ موقعے کیساتھ جو ملازم ڈیوٹی دیتے ہیں وہ سب اچھا کی رپورٹ بذریعہ پترا ڈیوڑھی تک پہنچاتے ہیں، جو ایک ملازم سے دوسرے ملازم تک، ایک لوہے کے پترے کے ذریعے ہوتا ہے، جس پر کوٹ موقعے کا نمبر لکھا ہوتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے پترا، ڈیوڑھی میں دیر سے پہنچے تو اس کا سخت نوٹس لیا جاتا ہے۔ یہ پترا چوبیس گھنٹے چلتا رہتا ہے۔ یہی نظام، درحقیقت، جیل کی چوکسی اور نگرانی کا نظام ہے۔ پترے والوں پر کنٹرول کے لئے وائرلیس کے ذریعے نگرانی کی جاتی ہے۔ اسی وائرلیس سے بارکوں اور بلاکوں میں پہرہ دینے والے عملے کی نگہداشت کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ پل پل کی خبر رات کے ڈیوٹی افسر اور اسی طرح دن کے ڈیوٹی افسر تک پہنچائی جاتی ہیں۔

مشقت

عدالت سے قید بامشقت کی صورت میں قیدی کو کوئی نہ کوئی کام کرنا پڑتا ہے۔ اُنکی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مختلف ڈیوٹیاں لگا دی جاتی ہیں۔ کسی کی لنگر خانہ میں، فیکٹری میں پڑھانے، یا صفائی کیلئے، اِس کام کو مشقت کہتے ہیں۔

ٹوری

ٹوری لفظ ٹور یعنی ٹھاٹھ سے ہے، نام سے ہی ظاہر ہے کہ ٹوری لوگ بڑے ٹور سے جیل میں وقت گذارتے ہیں۔ ٹوری بھی دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو جیل میں دُنیا کی ہر چیز دولت سے خرید لیتے ہیں، دوسرے اپنی دھونس سے...... جیل حکام اِنکے ساتھ ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ اُن کے کام کرنے کیلئے مشقتی موجود ہوتے ہیں، جو صرف دو وقت کے کھانے یا سگرٹوں کی ڈبی کیلئے سارا دن ٹوریوں کی خدمت کرتے ہیں۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے ہمیں پھر سارے معاملے کو نیو ورلڈ آرڈر کے تناظر میں دیکھنا ہوگا۔ اگر نیو ورلڈ آرڈر کو جیل سمجھ لیں تو دنیا کے تمام فوجی حکمران ٹوری لگتے ہیں، مصر کے حسنی مبارک سے لے کر ضیاء الحق، صدام حسین، شہنشاہ ایران، معمر قذافی اور ہمارے تمام فوجی حکمران اس میں شامل کئے جاسکتے ہیں۔ یہ ٹور خریدنے کے لئے ٹوری اپنی قوم اور ملک کے مفاد جیلر یعنی سپر پاورز کے ہاتھوں میں بیچ دیتے ہیں قوم ان کی مشقتی بنادی جاتی ہے جو صرف دو وقت کی روٹی یا سگریٹ کی ڈبی کے لئے ساری عمر ٹوریوں کی خدمت کرتی ہے۔ جیل میں جو ٹوری دھونس سے کام کرواتے ہیں ان کا حشر آخر میں صدام حسین، معمر قذافی، انور سادات اور ضیاء الحق جیسا ہوتا ہے یا وہ رام ہوجاتے ہیں یا ان کا وجود مٹا دیا جاتا ہے۔

مشقتی

یہ وہ غریب قیدی ہوتے ہیں جو دوسرے قیدیوں کی خدمت کرکے گذر بسر کرتے ہیں۔ A اور B کلاس کے قیدیوں کی خدمت کیلئے جیل قواعد کے مطابق ایک ایک مشقتی فراہم کیا جاتا ہے۔

سوال

عموماً سوال کرنے والے کو شکایت کنندہ سمجھ کر اس کی ٹھکائی کی جاتی ہے۔ سوال کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مطلب ہے کہ کسی سے کوئی بات پوچھنا۔ جیل خانہ جات میں اگر کسی کو سپرنٹنڈنٹ سے کوئی عرضداشت کرنا ہو تو اسے دورہ کے دوران سوالی بن کر سوال کرنا ہوتا ہے۔

چکر

چکر جیل کا اعصابی مرکز ہوتا ہے، مختلف بارکوں کے دروازے ایک گول سی جگہ پر کھلتے ہیں، اسے چکر کہتے ہیں۔ اس جگہ چیف چکر بیٹھتا ہے۔ جیل کے نظام میں اس جگہ کو مرکزیت کا درجہ حاصل ہے۔ یہاں سے ایک ایک فرد کی نگرانی کی جاتی ہے۔ قیدیوں کو چکر میں سزا دی جاتی ہے اس لئے چکر کا رعب قیدیوں کے ذہن پر ہر وقت مسلط رہتا ہے۔

میٹ

میٹ (MATE) نام سے ہی ظاہر ہے معاونت کرنے والا۔ ہر بارک کے انچارج کا ایک میٹ ہوتا ہے جو کہ قیدی ہی ہوتا ہے۔ اڈیالہ جیل میں قیدی اپنا میٹ منتخب کرتے ہیں مگر منتخب وہی ہوتا ہے جو جیل حکام کا ناؤٹ ہوتا ہے، اسے تم فوجی حکمرانوں کی حقیقی جمہوریت سمجھ لو۔

ٹہلائی

جیل میں چہل قدمی کرنا ٹہلائی کہلاتا ہے۔ باہر کی دنیا ٹہلائی کی اہمیت کا تصور نہیں کر سکتی کیونکہ وہاں چلنے پھرنے پر پابندی نہیں ہوتی جیل میں خواہ محدود جگہ پر ہی سہی ایک گھنٹہ چلنے پھرنے کی اجازت مل جائے تو اسے بہت بڑی عیاشی میں شمار کیا جاتا ہے۔ ٹہلائی بند کر دینا بہت بڑی سزا ہوتی ہے۔ قصوری بند کو کوئی ٹہلائی نہیں ملتی۔ سزائے موت کے قیدیوں کو ایک گھنٹہ صبح اور ایک گھنٹہ شام کو ٹہلائی ملتی ہے۔ بقیہ 22 گھنٹے وہ اپنی کوٹھڑیوں میں بند رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اکثریت بیمار ہو جاتی ہے ہمارے عدالتی نظام کی وجہ سے کئی سالوں میں اپیل کی شنوائی نہ ہونے کی وجہ سے اکثر قیدیوں کی ٹانگیں مفلوج ہو جاتی ہیں۔ چھوٹی سی جگہ پر چلنے پھرنے کیلئے الگ ریٹ مقرر ہیں۔ (مسلسل بند رہنے کی وجہ سے کئی ذہنی مریض بن جاتے ہیں)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لنگر خانہ

جیل کے سارے کھانے کا انتظام لنگر خانہ میں ہوتا ہے۔ پانچ ہزار قیدیوں کے لئے کھانے کا انتظام آسان کام نہیں جیل کام کی ذمہ داری ہے کہ وہ دیکھیں کوئی قیدی بھوکا نہ رہے جیل کے کھانے کو بہتر بنانے کے لئے ہر حکومت کوشش کرتی ہے اور یہ بہتری نظر بھی آتی ہے لیکن جیل انتظامیہ جو کھانا قیدی کو مہیا کرتی ہے وہ عموماً بہت ناقص ہوتا ہے قیدی شوربے کو ڈیزل کہتے ہیں اور چائے کو کچھ اور تقریباً تمام قیدی اپنے کھانے کا انتظام خود کرتے ہیں اور جیل کے کھانے پر انحصار نہیں کرتے اپنا کھانا تیار کرنے کے لئے انہیں بے شمار رکاوٹوں کا سامنا ہوتا ہے۔ جیل کی زبان کی طرح لنگر کی بھی اپنی ہی ایک زبان ہے۔

(a) لانگری

لنگر خانہ میں کام کرنے والا ہر مشقتی لانگری کہلاتا ہے۔

(b) گنڈ مار

آٹا گوندھنے والا۔

(c) پیڑ چی

روٹیوں کیلئے پیڑے بنانے والا۔

(d) ٹوک

آٹے کے پیڑے کو ٹوک کہتے ہیں۔

(e) وزنی

ہر ٹوک کا وزن برابر رکھا جاتا ہے۔ وزن کرنیوالا وزنی کہلاتا ہے۔

(f) پکوا

تندور میں روٹی لگانیوالا۔

(g) گنڈی مار

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تندور میں سے روٹی نکالنے والا۔

(h) تھمب

جیسے جیسے روٹیاں تیار ہوتی جاتی ہیں۔ان کو اکٹھا کرتے ہیں۔جب 40 روٹیاں اکٹھی ہوتی ہیں ان کو تھمب کہتے ہیں۔

(i) تھامی

تھمبوں کو گننے والا تھامی کہلاتا ہے۔

(j) سبزی پنجہ

دوسرے پنجوں کی طرح لنگر میں بھی سبزی کاٹنے کیلئے سبزی پنجہ موجود ہے۔

(k) دیگچی

گھروں میں جس برتن میں کھانا پکاتے ہیں اسے دیگچی کہتے ہیں۔لیکن جیل میں کھانا پکانے والے کو دیگچی کہتے ہیں۔

(L) صفائی پنجہ

لنگر میں برتن، دیگیں اور دیگر صفائی کرنے والا صفائی پنجہ کہلاتا ہے۔

ٹانگہ

جیل کافی بڑے ایریا میں پھیلی ہوئی ہے لیکن اس میں کسی سواری کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ٹانگہ اُس شخص کو کہتے ہیں جو جیل میں سامان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا ہے۔اِس کو معمولی اُجرت مل جاتی ہے، جس سے وہ اپنے اخراجات پورے کرتا ہے۔تم نے ٹانگے کی سواری والی سیاسی جماعتوں کے بارے میں ضرور سنا ہوگا۔پچھلے انتخابات میں ایک پارٹی نے اپنا انتخابی نشان ہی ٹانگہ لے لیا تھا وہ بھی اقتدار کا بوجھ کندھوں پر اٹھائے پھرتی ہے لیکن اس نے معاوضہ بھاری وصول کیا ہے اب دیگر ٹانگہ بانوں سے اس کا اجرت کی تقسیم پر تنازع پیدا ہو گیا۔حق خیر کرے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نفری

نفری کا لفظ خود اپنا معنے بتا رہا ہے..... لیکن جیل میں ملزمان کو جو کھانا دیا جاتا ہے وہ نفری کہلاتا ہے۔ جب لانگری نفری لاتا ہے تو ہر کوٹھری میں پوچھتا ہے کہ کتنی نفری۔ ہر ملزم کی نفری دو روٹی اور ایک ڈلّو پر مشتمل ہوتی ہے۔ سالن ایک بالٹی میں ہوتا ہے جسے نکالنے کیلئے ایک چائے والا ڈونگہ ہوتا ہے جو ڈلو کہلاتا ہے۔

کوٹ موقعہ

جیل پناہ یعنی جیل کی فصیل کو کوٹ موقعہ کہتے ہیں۔

کھڈے وال

لفظ "وال" اصل میں پارٹنر شپ کو ظاہر کرتا ہے۔ جیسا عام زبان میں پارٹنر کو "بھائی وال" کہتے ہیں۔ اِسی طرح جیل میں دو یا اس سے زیادہ قیدی جب ایک ہی کھڈے پر رہتے ہیں، گویا کہ وہ ایک کھڈے کو شیئر کر رہے ہیں، اِس لئے کھڈے وال کہلاتے ہیں۔ اِسی طرح ایک ہی کوٹھری یا چکی میں رہنے والے چکی وال کہلاتے ہیں۔ اقتدار کی بچی کھچی ہڈیوں پر گزارہ کرنے پر فوجی حکمران کی حکومت میں کھڈے وال بن جاتے ہیں اور بعد میں آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔

ہانڈی وال

کھڈے وال جب اپنے کھانے پینے کے اخراجات بھی شیئر کریں تو ان کے درمیان ہانڈی والی ہو جاتی ہے۔ ہانڈی اصل میں مٹی کا سالن پکانے والا وہی برتن ہے۔ جسے دیگچی کہتے ہیں۔

گارد

گارد جیل اہلکاروں کے ایک گروپ کو کہتے ہیں۔ سپاہیوں کی ہر چار گھنٹے بعد ڈیوٹی بدل جاتی ہے۔ جیل ڈیوٹی سے فارغ ہونیوالے سپاہی باہر اپنی بارکوں میں چلے جاتے ہیں اور تازہ دم سپاہیوں کی گارد اندر آجاتی ہے۔ کسی سپاہی کی ڈیوٹی بارہ گھنٹے سے کم نہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بارک بندی

قیدیوں کی ایک بارک سے دوسری بارک آمدورفت پر پابندی ہوتی ہے، اس لئے بارکیں بند ہونے کو بارک بندی کہتے ہیں۔

تلاشی

دوروں کی طرح قیدی تلاشیوں سے بھی تنگ رہتے ہیں۔ تلاشی ہفتہ یا پندرہ دن بعد ہوتی ہے۔

جامہ تلاشی

جامہ تلاشی میں تو جیل حکام کی کوشش ہوتی ہے کہ قیدیوں کی روح بھی نکال کر لے جائیں۔ قیدیوں کے پرائیویٹ کپڑے، شیشے کی کوئی چیز، کاغذ پنسل، موبائل وغیرہ، غیر قانونی تصور کئے جاتے ہیں اور ان کی برآمدگی پر سزا ملتی ہے۔

اسی سے ملتی جلتی تلاش آج کل تیسری دنیا کے ممالک کے وزرائے اعظم اور صدور کی امریکہ کے ہوائی اڈوں پر ہو رہی ہے۔ جس طرح ہم قیدی اس توہین کو دوسرے قیدیوں سے چھپاتے ہیں اسی طرح ہمارے رہنما اپنے ساتھ ہونے والے سلوک یا بدسلوکی کو اپنی قوم سے چھپاتے ہیں۔

ٹکٹ

قیدی کی جیل آمد کی تاریخ، اس کے جرائم، حکومت کی طرف سے یا اسکی اپنی تعلیمی کاوشوں کی وجہ سے حاصل ہونے والی معافیاں، جیل کی پیشیاں، ساری معلومات ایک جگہ پر اکٹھی کی جاتی ہیں۔ جس صفحہ پر یہ تفصیل درج ہوتی ہے، قیدی ٹکٹ کہلاتا ہے۔ یہ قیدی کا آدمیوں کے ہاتھ سے لکھا ہوا اعمال نامہ ہے۔ غالب کو شکایت تھی کہ فرشتوں نے ہمارا اعمال نامہ لکھ کر ہمیں پھنسا دیا اگر کوئی آدمی کراماً کاتبین کی جگہ ہوتا تو ہمارے جذبات کو سمجھ کر اعمال نامے کو سیاہ نہ کرتا ہم اہل قفس کا تجربہ آدمی کے لکھے ہوئے اعمال نامے کے بارے میں خاصا تلخ ہے غالب کی روح سے معذرت کے ساتھ۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چالان

قیدی کا ایک جیل سے کسی دوسری جیل میں منتقل ہونا چالان کہلاتا ہے۔ بعض اوقات قیدی اپنے گھر سے دور کسی دوسرے شہر میں جیل کاٹ رہا ہوتا ہے تو وہ محکمہ جیل کے اعلیٰ افسران یا ہوم منسٹر وغیرہ سے اپنے شہر کی جیل میں چالان کی درخواست کرتا ہے۔ لیکن اکثر جیل انتظامیہ بطورِ سزا قیدی کے رویے یا کسی بڑی پیشی کی وجہ سے اسکا چالان کسی دور دراز شہر میں نکال دیتی ہے۔ بغیر کسی وجہ کے چالان کا نکل جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ قیدی کے ٹکٹ پر صرف انتظامی امور میں دخل اندازی لکھ دیا جاتا ہے۔ حکام سے صاف گوئی کا نتیجہ تو تمہارے والد کی صورت میں سامنے ہے۔ اڈیالہ جیل سے میرا چالان کوٹ لکھپت بطور سزا نکالا گیا ہے۔ جلاوطن سیاستدان کا بھی باہر کا چالان کاٹا گیا۔ تم اب چالان کٹنے کا مطلب سمجھ گئی ہوگی۔

فیکٹری

سزا یافتہ قیدی کو مشقت کرنا ہوتی ہے، اس ضمن میں، جیل کے وسیع ایریا میں فیکٹری موجود ہے۔ جس میں جیل ملازمین کے سامان رکھنے کے لئے لوہے کے بکس بنائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ قالین سازی کیلئے اڈے لگے ہوئے ہیں۔ جیل مینوئل میں قیدی کو فیکٹری میں مشقت کرنے کے معاوضے کا ذکر ہے، عملی طور پر مشقت کا معاوضہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

سب اچھا ہے

جس طرح ہر ملک کی ایک سرکاری زبان ہوتی ہے اسی طرح جیل کی سرکاری زبان "سب اچھا کہلاتی ہے" شام کو جب تمام قیدی بارکوں اور چکیوں میں بند کر دیئے جاتے ہیں تو اس کو سب اچھا کہتے ہیں جب تک سب اچھا کی رپورٹ ڈیوڑھی میں نہیں پہنچتی۔ جیل حکام ڈیوٹی چھوڑ کر گھر نہیں جاسکتے عصر کے بعد سے ہیڈ وارڈر اپنی بارک کے قیدیوں کو اندر کی طرف ہانکنا شروع کر دیتے ہیں قیدی ایک لمحہ باہر رہنے کی بھیک مانگتے نظر آتے ہیں مگر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس وقت ہیڈ وارڈز کا رویہ درشت ہو جاتا ہے اگر کوئی وارڈ ہر وقت سب اچھا کی رپورٹ چکر میں نہ پہنچا سکے تو حکام اس کی سخت بے عزتی کرتے ہیں۔

فوجی اور آمرانہ حکومتوں میں بھی ساری قوم مہنگائی اور بے روزگاری کی چکی میں پس جاتی ہے مگر اوپر سب اچھا ہوتا ہے۔

سب اچھا جیل کے ہر اچھے برے کام میں استعمال کیا جاتا ہے مثلاً اگر کوئی قیدی سہولتوں کے حصول کے لئے جیل والوں کی مٹھی گرم کردے تو کہا جاتا ہے اس کا سب اچھا ہو گیا ہے سزا سے بچنے اور قصوری بند ہونے سے بھی سب اچھا کام آتا ہے۔

پہلے جیل میں رات کی گشت کرنے والا عملہ ایک دوسرے سے نعرہ لگاتا تھا "سب اچھا" دوسری سے دوسرا گروہ جواب میں سب اچھا کہتا تھا اس طرح چوکیدار اور چوکسی کا نظام چلتا رہتا تھا ضیاء الحق کے دور میں سب اچھا کا نعرہ ختم کردیا گیا اب ایک طرف سے آواز آتی ہے یا اللہ خیر دوسری جانب سے یہی جواب آتا ہے اگر کوئی ہنگامی حالت ہو یا باہر کے کسی افسر کے چھاپے کا خطرہ درپیش ہو تو اس نعرے میں یا اللہ خیر کے ساتھ یا محمد خیر کا اضافہ کردیا جاتا ہے جس سے متعلقہ عملہ سمجھ جاتا ہے کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔

تم اندازہ کرسکتی ہو کہ جیل کی تکلیف دہ زندگی میں جب سب اچھا کہا جاتا ہے تو یہ زخموں پر نمک چھڑکنے کے برابر ہوتا ہے اسی طرح ملک کے حکمران جب غربت بیماری نا انصافی اور امن وامان کی خرابی، جمہوریت اور آئین کا قتل کرکے سب اچھا کی رپورٹ دیتے ہیں تو آپ آزاد لوگوں اور ہم قیدیوں کی زندگی میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟

وارنٹی (WARRANTY)

قید کا ریکارڈ رکھنے کے لئے الگ سٹاف مقرر ہے حوالاتیوں کا انچارج الگ ہوتا ہے اور قیدیوں کا الگ۔ یہ انچارج وارنٹی کہلاتا ہے۔ یہ عموماً سات گریڈ کا ملازم ہوتا ہے مگر قیدیوں کے لئے یہ اہم ترین افسر سمجھا جاتا ہے یہ قیدیوں کی رہائیوں کا ریکارڈ رکھتا ہے قیدیوں میں یہ تصور گہرا ہو چکا ہے کہ وارنٹی کسی کو رہا کرنا چاہے تو زیادہ معافیاں ڈال دیتا ہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جس سے قید مختصر ہو جاتی ہے اب اس شعبے کا سربراہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ (لیگل) کو بنایا گیا ہے لیکن عملی طور پر اب بھی وارنٹی ہی موثر سمجھا جاتا ہے قیدی کو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ اسے کب رہا ہونا ہے۔ جب تک وارنٹی کی مٹھی گرم نہ کی جائے عدالتی فیصلے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں اور قید ختم ہونے کو نہیں آتی اس شعبے کو کمپیوٹرائز کرنا انتہائی ضروری ہے تا کہ ہر قیدی کو معلوم ہو کہ اسے کب رہا ہونا ہے۔

جیل خانے سے زندگی سنوارنے کا کام لیا جا سکتا ہے۔ تربیت کے ذریعے ایسا جیل سٹاف تیار کرنا ہوگا جو حسن سلوک سے قیدیوں کے ذہن کو مثبت رویہ اپنانے پر مجبور کر دے سٹاف کے ڈیوٹی اوقات کار کو بہتر کرنے سے مثبت تبدیلی آ سکتی ہے ملازمین کی تنخواہیں نہ ہونے کے برابر ہیں نہ ہی انہیں صحت کا تحفظ حاصل ہے اور نہ ہی ان کے بچوں کے لئے تعلیم کا انتظام ہے جیلوں کو اصلاح خانوں میں تبدیل کرنے کے لئے عدالتی نظام کی اصلاح از حد ضروری ہے اس مختصر سی تحریر سے جیل کی زندگی کے چند گوشے بے نقاب ہو سکتے ہیں باقی پھر سہی۔

والسلام!

تمہارا والد!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ساری دنیا میرا گاؤں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میرا گاؤں مخدوم رشید ایک استعارہ ہے جب میں نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا تو وہاں بچیوں کا پرائمری سکول تھا اور بچوں کے لئے ایک ہائی سکول۔ اب وہاں لڑکیوں اور لڑکوں کے ڈگری کالجز ہیں دو دو ہائی سکول اور کئی مڈل اور ماڈل سکول۔ گاؤں کی ساری گلیاں پختہ ہو چکی ہیں۔ ٹیلی فون، سوئی گیس اور بجلی موجود ہے۔ صحت کے تحفظ کے لئے پورے علاقے میں مثالی ادارے قائم ہیں۔ عالمی ادارہ صحت نے پاکستان میں جو پانچ مراکز قائم کئے ہیں ان میں سے ایک مخدوم رشید میں واقع ہے۔ اردگرد کے علاقے میں مَیں نے ایک سو کے قریب ہائی سکول اور دیگر ادارے قائم کرائے ہیں۔ مخدوم رشید سے جو لوگ سعودی عرب اور خلیج کی ریاستوں میں گئے وہ غربت کے جال سے نکل آئے ہیں۔ ان میں سے کئی ہم سے بھی زیادہ دولت مند ہیں اس ترقی کے باوجود کوئی غیر زمیندار قومی اسمبلی میں تو کجا یونین کونسل کے ناظم کے الیکشن میں حصہ لینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ ایسے لگتا ہے ملک میں ایک غیر تحریری آئین موجود ہے جس نے پاکستان کے چاروں صوبوں کے محنت کشوں کو قومی دھارے میں شامل ہونے سے روک رکھا ہے۔ شہروں میں کچھ تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں مگر دیہاتوں کا غیر زمیندار طبقہ ابھی تک بنیادی انسانی حقوق سے محروم ہے۔ انہیں پاکستان کی آدھی شہریت ملی ہوئی ہے۔

جمہوری عمل تمام طبقات کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں مدد دیتا ہے۔ دنیا کی انقلابی کونسلوں نے بھی مساوات کا دعویٰ تو کیا ہے مگر چند مستثنیات کو چھوڑ کر یہ دعویٰ عمل کی دنیا میں ایک سراب ثابت ہوا وقت نے ثابت کیا ہے کہ ووٹ کی طاقت انقلاب کی گولی سے دیرپا اثر مرتب کرتی ہے، کم از کم میں نے عملی سیاست میں یہی سیکھا ہے۔ جب تک غریب کو فیصلوں میں شریک نہیں کیا جائے گا کوئی معاشرہ فلاحی معاشرہ نہیں کہلائے گا اور جب تک محنت کش کو احترام نہیں ملے گا کوئی نظام کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ گاؤں کے لوگوں کے نام خطوط میں اسی سوچ کو پیشِ نظر رکھا ہے۔

(مصنف)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گلوبل ویلیج کی کہانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

میمونہ بی بی!

السلام علیکم!

میں نے چند خطوط گاؤں کے ان لوگوں کے نام لکھے ہیں جو شب و روز کی محنت سے گاؤں کو خود کفیل بناتے رہے۔ اُن میں سے کچھ لوگ زندہ ہیں اور کچھ اس دنیا سے جا چکے ہیں۔ میں ان میں سے ہر ایک کے حالات سے باخبر ہوں۔ ان میں سے ہر ایک کے پیشے کو اس کی ذات بنا دیا گیا ہے اور پھر ذات پات کی جکڑ بندیوں میں ان کی پہچان گم ہو گئی ہے وہ راجپوت، ٹکھی، بلوچ، بھٹی، ملنہانس کی بجائے صرف کمی بنا دیئے گئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے نام کو اس قدر بگاڑا جاتا ہے کہ ان کے نام کی وجہ سے برگزیدہ ہستیوں کو بھی معاف نہیں کیا جاتا مثلاً خدا بخش صرف خدو یا کھدو بن جاتا ہے غلام مصطفےٰ میتو ہو جاتا ہے عمر امرا اور علی لٹی میں بدل دیا جاتا ہے حسین حسینا اور رسول رسولا پکارے جاتے ہیں۔ یہ صرف ایک گاؤں کی کہانی نہیں بلکہ پاکستان کے ہر گاؤں اور ہر شہر میں رہنے والے کچلے ہوئے طبقوں کی نسلوں کی کہانی ہے۔ اب تو پوری دُنیا گلوبل ویلیج کہلاتی ہے۔ اِس بڑے گاؤں کی کہانی بھی میرے گاؤں مخدوم رشید سے مختلف نہیں۔

یہ ایک ایسے صحرا کی داستان ہے جس میں کوئی شجر سایہ دار نہیں، کڑی دھوپ کے اس سفر میں نہ جانے اور کتنی نسلیں در بدر ٹھوکریں کھاتی رہیں گی۔ گاؤں کے کسان اور چھوٹے زمیندار کی زندگی اپنے جانوروں کی زندگی سے قدرے بہتر ہوتی ہے وہ اکٹھے رہتے ہیں اکٹھے کھاتے ہیں اور ایک تالاب سے پانی پیتے ہیں اور ایک ہی چھپر کے نیچے سو جاتے ہیں۔ پورے ملک میں ایک بھی کسان ایسا نہیں ملے گا جس کی کمر پر قرضوں کا بوجھ نہ ہو۔ وہ سارے ملک کے لئے اناج پیدا کرتا ہے مگر خود بھوکا رہتا ہے اس کے بچے کاشتکاری میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

شریک ہو کر اس کا بوجھ بانٹے ہیں اور تعلیم سے محروم رہتے ہیں۔ غربت اور بیماریوں نے اسے لاچار کر دیا ہے۔ اب تو کسانوں کی خودکشیاں ایک مسئلہ بن گئی ہیں۔ مگر میں خطوط میں صرف ان لوگوں کا ذکر کر سکا ہوں جنہیں بھوک کے ساتھ توہین آمیز زندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

آج بھی ہاتھ سے کام کرنے والوں کی محنت سے دنیا کا نظام چل رہا ہے۔ انقلاب فرانس اور انقلاب روس بھی ہمارے گاؤں کے محنت کشوں کی زندگی کو بھوک اور توہین کے آمیزے کی گرفت سے نکالنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

اسلام سمیت تمام مذاہب کی انسانی مساوات کی تلقین بھی اس سنگلاخ زمین سے برابری اور انصاف کی فصل نہیں اگا سکی۔ جب نظر اٹھا کر پوری دنیا کے مظلوموں کی طرف دیکھتا ہوں تو دل و دماغ جلنے لگتے ہیں۔ ممبئی کی آدھی آبادی فٹ پاتھوں پر سوتی ہے اور کولکتہ میں ایک تہائی کی جھونپڑیاں مٹی کی بنی ہوئی ہیں۔ ان پر ترپال کی چھت ڈال دی جاتی ہے۔ کیا بمبئی کو ممبئی کہنے سے اور کلکتہ کو کولکتہ کہنے سے ان غریبوں کی زندگی میں کوئی تبدیلی لائی جا سکتی ہے؟ میں نے اپنے گاؤں کے لوگوں کی گذشتہ نصف صدی کی زندگی پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ وہاں کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ غریبوں کے سر چھپانے کی جگہ نہیں ہے۔ ہم ان سے تقاضا کرتے ہیں کہ وہ اپنی مٹی سے محبت کریں اور اس سے وفا نبھائیں جو مٹی ان کی ہے ہی نہیں اگر وہ اس سے محبت کیے جا رہے ہیں تو یہ ان کا اس دھرتی پر احسان نہیں تو کیا ہے؟

ہر مذہب نے غریبوں کی خدمت کی تلقین کی ہے بادشاہت کے نظام میں اچھا بادشاہ اُسی کو کہا گیا۔ جس نے نچلے ہوئے طبقے کا خیال رکھا۔ کمیونزم کا تو دعویٰ ہی یہی ہے کہ وہ غریبوں کا نظام ہے۔ نبیوں کی بعثت کا مقصد خدا کی عبادت کے علاوہ مساوات پر مبنی معاشرے کی تشکیل تھی۔ ہر پیغمبر نے اپنے عمل سے محنت کی عظمت کا درس دیا۔ حضرت آدم علیہ السلام کسان تھے، وہ کھیتی باڑی کرتے تھے۔ حضرت ادریس علیہ السلام جولاہے تھے، وہ کپڑا بنتے تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام لوہار تھے، اللہ نے اُنھیں زرہ بکتر اور تلواریں بنانے کا علم دیا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا سارا خاندان ترکھان تھا، وہ بڑھئی کا کام کرتے تھے۔ حضور علیہ السلام

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نے فرمایا کہ تمام انبیاء نے چرواہے کا کام کیا۔کوئی ایسا نبی نہیں جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔ حضور ﷺ نے بھی کئی سال بکریاں چرائیں۔ حضور ﷺ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اپنا رزق اپنے ہاتھ سے کماتے تھے۔ حضرت عمرو بن عاص اور سیّدنا زبیر رضی اللہ عنہما قصاب تھے۔ گوشت بیچتے تھے۔ حضرت سیّدنا حباب رضی اللہ عنہ لوہار پیشہ تھے۔ حضرت ایوب انصاری جولاہے تھے، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ دودھ کا کاروبار کرتے تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ تیر بنا کر بیچا کرتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ مزدوری کرتے تھے اِذحر کی لکڑیاں چُن کر لاتے اور مدینہ میں فروخت کرتے۔

ہمارے معاشرے میں کام کرنے والوں کو نہ صرف معاشی تنگدستی کا سامنا کرنا پڑتا ہے بلکہ اُنہیں حقیر سمجھ کر اُن سے توہین آمیز رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ پوری دُنیا میں کمزوروں کا استحصال صدیوں سے جاری ہے۔کوئی مذہب کوئی نظام اِس معاملے میں قطعی کامیابی حاصل نہیں کرسکا۔ اِن طبقات کی عزت اور توقیر تب ہی بحال ہوگی جب اُنکی رائے کو اہمیت دی جائیگی۔ اُن کے ووٹ کا حق اُنہیں دیدیا جائیگا اور وہ بھیک مانگنے والے کے بجائے احتساب کرنیوالے بن جائینگے۔

انبیاء کرام علیہم السلام نے کمزوروں کا ساتھ دیکر اُنہیں بالا دست کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعونوں کے ظلم سے اِنسان کو نجات دلائی۔ حضرت ابراہیمؑ نے نمرود کی خدائی کو چیلنج کیا۔ تمام انبیاءؑ کا ساتھ دبے ہوئے طبقات نے دِیا اور وہ انبیاء علیہم السلام کے یمین و یسار بن گئے۔ حضور ﷺ نے غلاموں کو آقا کردیا، عورت کی کمزوری کو طاقت میں بدل کر مکہ کے سرداروں کی خدائی کو چیلنج کیا۔ حضرت نوح، حضرت لوط، حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے اردگرد کمزور طبقات کا جمگھٹا تھا، پسے ہوئے طبقات کی خدمت انبیاء علیہم السلام کی سُنت ہے۔ اُن کے حقوق کی جنگ لڑتے ہوئے جان دینا شہادت ہے۔ میں نے جن حضرات کے نام خط لکھے ہیں یہ ہمارے معاشرے کے جیتے جاگتے کردار ہیں اگر اِن طبقات کے دروازے تک تمام سہولتیں نہ پہنچیں تو پاکستان کیسے ترقی کریگا، پاکستان تو نام ہی انہی لوگوں کا ہے۔ ترقی پست کو بالا کرنے کا نام ہے۔ انفرادی ترقی میں امیر امیر سے امیر تر ہو جاتا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے مگر معاشرہ اِس ترقی کی برکات سے محروم رہتا ہے بلکہ انفرادی ترقی معاشرے میں ناہمواری، محرومی اور تلخی پیدا کرتی ہے۔ پست طبقوں کی اجتماعی ترقی ہی ترقی کہلا سکتی ہے۔ اسی ترقی سے کسی ملک یا معاشرے کی ترقی کو ماپا جا سکتا ہے۔

یہاں جیل کی چاردیواری میں بیٹھے ہوئے یہ احساس شدید ہو گیا ہے کہ میں ان لوگوں کیلئے کچھ نہ کر سکا جنھوں نے اپنی ہڈیاں اِس ملک کو بہتر سے بہتر بنانے میں گھلا دیں چونکہ میں اُن تک نہیں پہنچ سکتا اِس لئے یہ ذمہ داری تمہیں دیتا ہوں کہ تم یہ خطوط اُن تک پہنچا دینا، مجھ سمیت جن کا احترام کرنا معاشرہ آج تک نہیں سیکھ سکا۔ اِس بات کا اندازہ تم میری تحریروں سے بھی بآسانی کر سکو گی۔ میں نے اپنے خطوط میں کہیں انھیں آپ کہہ کر مخاطب کیا ہے اور کہیں تو تکار پر اُتر آیا ہوں اگر مجھ جیسے "روشن خیال" کا یہ حال ہے تو معاشرے کے خداوندانِ قضا و قدر کا "حُسنِ سلوک" اُن سے کیسا ہو گا؟

والسّلام!

تمہارا باپ!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

صدرِ پاکستان رانا عبدالوحید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

محترم جناب رانا عبدالوحید صاحب!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

معذرت خواہ ہوں کہ آپ سے کوسوں دور ایک ایسی جگہ پر ہوں جہاں سے آپ تک خود نہیں پہنچ سکتا، اس لئے خط کا سہارا لیا ہے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا، آپ کی منفرد شخصیت میرے سامنے تھی۔ آپ کی بیٹھک کی دیواروں پر قائداعظم، علامہ اقبال، لیاقت علی خان، مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح اور تاج محل آگرہ کی تصویریں فریم میں لگی ہوئی تھیں۔ میرے ذہن میں آپ کی شخصیت کا پہلا تاثر ایک خوش لباس، سوٹ بوٹ میں ملبوس شخص کا ہے جس کے گھر میں پاکستان کی کامیابی کی دعائیں مانگی جاتی تھیں۔ آپ کے والدِ محترم نے تعلیم کیلئے آپ کو علی گڑھ بھیجا۔ میرے دادا مخدوم نُور چراغ شاہ کا تعاون بھی اس سلسلے میں شامل تھا۔ آپ نے قیام علی گڑھ کے دوران خود کو تحریک پاکستان کیلئے وقف کر دیا۔ میری یادداشتوں میں آپ ایک ہمدرد انسان کے طور پر محفوظ ہیں۔ 1955-56ء کی بات ہے آپ کے دماغ سے ابھی قیام پاکستان کا نشہ نہیں اُترا تھا کہ آپ نے گاؤں کے چھوٹے موٹے بہبود کے کاموں میں حصہ لینا شروع کیا۔ آپ نے ایک انجمن رفاہِ عامہ کے نام سے بنائی اور کہنا شروع کیا کہ گاؤں میں میٹھا پانی نہیں ہے اس کا انتظام ہونا چاہیے۔ یہ ایک عجیب و غریب بات تھی کیونکہ ایک پسماندہ علاقے میں ٹینکی کا تصور ہی بعید تھا۔ اُمراء کے طبقے نے اسے دیوانگی کا نام دیا، غریب آدمی تو کڑوے، میٹھے اور آلودہ پانی کا فرق محسوس ہی نہیں کر سکتا۔ باخبر لوگوں کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں آتی تھی کہ دُور دراز سے مٹکوں میں پانی بھر کر لانے والی عورتیں ایک دن ٹونٹی کھولیں گی اور پانی اُن کے چولہے تک پہنچ جائیگا۔ مجھے یاد ہے آپ نے گاؤں کے ہر کنویں سے ماہرین کی نگرانی میں پانی کے نمونے حاصل

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کئے اور لاہور جا کر اِن کا لیبارٹری ٹیسٹ کرایا، یہ پانی مضرِ صحت نکلا۔ آپ اِن رپورٹوں کو اعلیٰ حکام کے سامنے رکھ دیتے۔ پھر آپ نے اِن رپورٹوں کو اخبارات میں شائع کرا دیا۔ آپکی دیوانگی رنگ لا رہی تھی، مجھے یہ بھی یاد ہے کہ اِن سرگرمیوں کیلئے آپ کے پاس وسائل نہ تھے، میں بہت کم عمر تھا۔ آپ کے خلوص نے مجھے بہت متاثر کیا، میں بھی آپکے اِس مشن میں شامل ہو گیا جو کچھ مالی طور پر کر سکتا تھا میں نے کیا۔ آپکے پاس کرایہ تک نہیں ہوتا تھا۔ آپکے پاس اپنے کپڑے بھی نہیں رہ گئے تھے۔ آپ اس کے باوجود ہر جگہ پہنچتے اور حکام کا دروازہ کھٹکھٹاتے۔ میٹھے پانی کی ٹینکی منظور ہو گئی۔ جب پانی کی لائنیں بچھائی جا رہی تھیں تو یہ دنیا کا آٹھواں عجوبہ لگتا تھا۔ پائپ بچھانے والوں نے ہر با اثر فرد کے گھر کے اِرد گرد پائپ بچھا دیئے آپکے گھر میں سب سے آخر میں پانی آیا۔ اِس دوران ایک جانکاہ حادثہ ہوا۔ اِرد گرد بچھائے گئے پانی کے پائپ پھٹ گئے اور آپکا گھر اس پانی کی زد میں آ کر ملبے کا ڈھیر بن گیا۔ آپکے گھر کا ملبہ سالہا سال تک پڑا ہوا میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

آپ نے پھر ایک اور بات کہنا شروع کی کہ اس گاؤں میں بجلی ہونی چاہیے۔ گاؤں کا زمیندار طبقہ آپکا مذاق اُڑاتا تھا۔ کچھ کہتے تھے کہ بجلی آئے گی تو وہی پنکھا ہماری رعایا کو بھی ہوا دے گا اور ہمیں بھی۔ ہمیں نہیں چاہیے ایسی بجلی۔ کچھ کہتے تھے ہمارے گاؤں میں بجلی پہنچنے کا کوئی راستہ ہی نہیں۔ کچھ کہتے تھے ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے، میں خود اُن دِنوں لالٹین کے سامنے بیٹھ کر مطالعہ کیا کرتا تھا۔ آپ ملتان سے 20 کلو میٹر دور واپڈا کی سروے ٹیم کیساتھ پیدل چل کر گاؤں تک آتے۔ کبھی جہانیاں کا 15 کلو میٹر راستہ تاریں کھینچتے ہوئے طے کرتے، کبھی ٹھٹھہ صادق آباد سے آنیوالی واپڈا کی لائن کو ناپتے رہتے۔ آپ کا چہرہ دھول سے اَٹا ہوا ہوتا تھا۔ ایک دم کھمبے آنے شروع ہو گئے، یہ ایک خوش کن منظر تھا۔ جیسے ہر نئی چیز کی خوشی ہوتی ہے، ہم سب خوش تھے۔ کھمبے لگے، بجلی پہنچی، آپ کا گھر بجلی کے بغیر تھا کیونکہ آپ کے پاس بجلی لگوانے کے اخراجات نہیں تھے۔

اس کے بعد آپ نے ٹیلی فون کی بات شروع کر دی کہ گاؤں میں ٹیلی فون ہونا چاہیئے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گاؤں میں ایک ایکسچینج لگ گئی۔ یہ 1973ء کا قصہ تھا۔ آج 2006ء ہے مخدوم رشید کے ہر گھر میں بلکہ ہر فرد کے پاس نئی ٹیکنالوجی کی وجہ سے ٹیلی فون پہنچ چکا ہے، لیکن آپ اب بھی کسی پی سی او (PCO) پر جا کر فون کرتے ہیں۔ اس کے باوجود آپ نے کبھی کوئی شکوہ نہیں کیا۔

آج بھی آپ اُسی طرح قائداعظم کی محبت میں گرفتار ہیں جس طرح علی گڑھ میں اُن کے قافلے کیساتھ ان کے ایک کارکن کے طور پر کام کرتے تھے۔ آپکے پاس بچوں کو تعلیم دلانے کے کوئی وسائل نہیں تھے۔ وہ گاؤں کے سکول میں ٹاٹوں پر پڑھتے رہے۔ آج اُن میں سے کوئی سکول کا چپڑاسی ہے، کوئی کلرک بنا ہے۔ آپکا بیٹا ظفر، جسے آپکے کسی محسن نے نیوی (Navy) میں بھرتی کرایا تھا، وہ بھی آپکے کندھوں پر اپنے بچوں کا بوجھ چھوڑ کر اس دُنیا سے چلا گیا۔ مجھے معلوم ہے آپ بیماریوں کے خلاف ایک طویل جنگ لڑ رہے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ گذشتہ تیس سال سے آپ نے محلے کی مسجد کی تزئین و آرائش اپنے خون و جگر سے کی ہے۔ آپکا شعروں کا انتخاب، آپ کی انگریزی ادب پر گہری نظر، ہم جیسوں کی رہنمائی کیلئے اہمیت کی حامل ہے۔ رانا صاحب، ہم آپ سے شرمندہ ہیں اگرچہ آپ نے آج تک کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائے کسی کا احسان نہیں لیا اور اپنی اَنا کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ لیکن گاؤں کے بڑے لوگ جو پاکستان کے بننے کیوجہ سے اب اور بھی بڑے ہو گئے، وہ آپ کو آپکا مقام دینے کیلئے تیار نہیں، لیکن تاریخ نے آپ کو مقام دیدیا ہے۔ آپ ہم جیسوں کیلئے روشنی کی وہ کرن بنے ہیں جس کا اُجالا منزل کا پتہ دیتا ہے۔ آپ کی جوانی بھی شاندار تھی، آپ کا بڑھاپا بھی شاندار!۔

آپ نے 1964 میں بی ڈی (B-D) کونسلر کا الیکشن لڑا۔ غریب عوام نے آپکا ساتھ دیا۔ آپ جیت چکے تھے، آپ کی بیٹھک میں مبارکباد دینے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ مٹی میں لتھڑے ہوئے لوگوں کے چہروں پر عجیب رونق تھی۔ اُن کے اَنگ اَنگ میں فتح کی سرشاری تھی۔ وہ ناچ کر خوشی کا اظہار کر رہے تھے کہ الیکشن کے عملے نے آپکی شکست کا اعلان کر دیا۔ آپ کے حامیوں کے چہروں پر ایسی کیفیت تھی جو کسی ماں کے چہرے پر اس کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جوان بیٹے کی موت کی خبر پر ہوتی ہے۔ سب پر سکتہ طاری ہو گیا۔ ضبطِ غم سے اُن کے ہونٹ نیلے ہو گئے اور آنکھیں پتھرا گئیں۔ یہ پہلی انتخابی دھاندلی تھی جس سے میں رُوشناس ہوا۔

آپ نے اِس کے باوجود اپنے گاؤں کی خدمت جاری رکھی۔ پندرہ سال بعد جب میں وزارت سے مستعفی ہو کر گاؤں پہنچا تو بلدیاتی انتخاب کا پہلا مرحلہ شروع تھا۔ آپ کونسلر کے الیکشن کیلئے میرے حمائت یافتہ پینل میں شامل ہو گئے۔ اب آپ کے خلاف دھاندلی آسان نہ تھی۔ آپ بی ڈی منتخب ہو گئے، یہ آپکی تیس، پینتیس سالہ خدمات کا اعتراف تھا۔ میں سمجھتا تھا آپ کی صلاحیتوں سے کام لینے کیلئے بڑا فورم ہونا چاہئے۔ ضلعی انتخابات کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا، میں مخصوص نشستوں کے ذریعے آپ کو آگے لانا چاہتا تھا۔ آپ محنت کش طبقے سے تعلق رکھتے تھے جسے احترام ملنا چاہئے۔ مگر فیوڈل نظام میں آپکی علی گڑھ کی ڈگریاں بھی آپ کو کوئی مقام نہ دِلا سکیں۔ آپکی معاشرتی حیثیت پر دو ایکڑ کا زمیندار بھاری ہے۔ آپ نے انتخابی فہرست میں اپنا پیشہ حکمت لکھا کیونکہ آپ نے ہومیو پیتھک کا ڈپلومہ حاصل کیا ہوا تھا، میں نے انتخابی عملے کو کہا کہ یہ حکمت نہیں محنت ہے۔ یہ میری زندگی کی پہلی اور آخری دھاندلی ہے جس پر میں شرمسار نہیں ہوں۔ آپ مزدور کی سیٹ پر ہمارے پینل سے بلا مقابلہ ممبر ضلع کونسل بن گئے، آپ کی ترقیاتی سرگرمیوں کا میدان وسیع ہو گیا۔

آپ قیام پاکستان سے پہلے بھی مسلم لیگی تھے اور آج بھی مسلم لیگی ہیں، آپ اقتدار کا ساتھ دینے والی مسلم لیگ کی بجائے جمہوریت کا ساتھ دینے والی مسلم لیگ کے ساتھ رہے۔ اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ صدر پاکستان یا وزیر اعظم کسے ہونا چاہئے، میں بے دھڑک آپ کا نام پیش کر دونگا۔ آپ جیسے افراد کی بدولت ملکوں کا نظام چلتا ہے بلکہ آپ جیسے لوگوں کی وجہ سے ہی انسانیت کا سر بلند ہے۔

رانا صاحب! میرا سلامِ عقیدت قبول کر لیں، اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

والسلام! آپکا مخلص!

جاوید ہاشمی!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کاش میں نیامت موچی ہوتا!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

جناب شیر محمد "موچی" صاحب

السلام علیکم! مزاج بخیر!

میں نے بچپن میں کئی سال آپ کے گھر بیٹھ کر آپ کو کام کرتے دیکھا، مجھے یہ لالچ بھی ہوتا تھا کہ میری موجودگی میں میرا جوتا جلد بن جائیگا اور خوبصورت بھی ہوگا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ آپ بڑی سوئی میں دھاگہ ڈال کر مہارت سے چمڑے کے سوراخ میں ڈالتے پھر اسکو جوتی کے اوپر والے حصے سے جوڑ دیتے، آپ چمڑے کو پتھر پر رکھ کر تیز رندی سے اِس کی تہیں اتارتے اور جوتے کا نیچے والا حصہ تیار کر لیتے تھے۔ آپکی نظر جوتے کے تلووں پر مرکوز ہوتی تھی۔ آپکے ہاتھ مشینی انداز سے چلتے رہتے تھے۔ اور جب دھاگے سے سیتے تو دھاگے کا ایک حصہ آپ کے منہ میں ہوتا۔ آپ گردن جھکا کر پوری توجہ سے یہ مراحل طے کرتے اور میں بڑے غور سے دیکھتا رہتا۔ آپکی بیوی "انور مائی" آپکی توجہ گھر کی بری حالت کی طرف دلاتی۔ آپکے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی اور آپ کہتے تھے، اللہ مسبب الاسباب ہے۔ آپکا ربّ پر یقین اور اُس یقین کے اظہار کا انداز میں آج تک نہیں بھول سکا۔ مجھے اُس وقت تک اِس بات کا علم نہیں تھا کہ آپ روزانہ قومی خزانے میں اپنے خون پسینے کی کمائی جمع کروا رہے ہیں۔ آپ جو دھاگہ خرید کر لاتے ہیں اُسکا ٹیکس قومی خزانے میں جمع ہوتا ہے۔ آپ جو چمڑا خریدتے ہیں، اُسکا ٹیکس قومی خزانے میں جاتا ہے۔ آپ جس بس پر سفر کر کے جاتے ہیں، اُسکے ڈیزل کا ٹیکس حکومت کے خزانے میں پیشگی جمع ہوتا ہے۔ آپ جو چائے، سبزیاں لاتے ہیں، اس پر ٹیکس دیتے ہیں۔ میں آپ کو ٹیکس دہندہ (Tax Payer) نہیں سمجھتا تھا بلکہ آپ کی غربت کی وجہ سے آپ کو قومی خزانے پر بوجھ سمجھتا۔ آج بھی آپ کا شمار ٹیکس دینے والوں میں نہیں ہے۔ جب میں بڑا ہوا تو اِحساس ہوا کہ آپ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ساری زندگی خزانہ بھرتے رہے ہیں اور بڑے بڑے پیٹوں والے اسے خالی کرتے رہے۔ آپ ووٹ دے کر جب قومی اسمبلی یا مقامی کونسل کا ممبر منتخب کرتے ہیں، تو اِسکا مطلب یہ ہے کہ آپ جو ٹیکس ادا کر رہے ہیں، اِس کی نگرانی خود نہیں کر سکتے، آپ اُن کو چوکیدار بنا کر بھیجتے ہیں، تا کہ آپ کے خون پسینے سے جمع کئے ہوئے پیسے کا استعمال صحیح طور پر ہو سکے، لیکن اگر چوکیدار ہی چوروں سے مل جائے تو چاچا شیر محمد اِس میں تمہارا کیا قصور ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ ہم نے سکولوں کا جال بچھا دیا حالانکہ تمہارے بیٹے اور اب تمہارے پوتے پوتیاں اِن سکولوں کی شکل نہیں دیکھ سکے، مجھے یاد ہے پھر تمہارا بیٹا ''ممی'' تمہارے ساتھ جوتے سینے کیلئے بیٹھ گیا اُسی چھپر کے نیچے جس کے نیچے تم بیٹھتے تھے۔ سردیوں اور گرمیوں میں اسی درخت کے نیچے بدبودار پانی کے تالاب کے کنارے پر آج تک وہ اسی جھونپڑے میں بیٹھا ہوا ہے بلکہ اب تو اُسکے بچے بھی اُسکے ساتھ موجود ہیں۔ تمہارا ایک بیٹا نشہ کا عادی ہو گیا، آتے جاتے لوگوں سے بھیک مانگتا ہے، اُس کے جسم پر پورے کپڑے بھی نہیں ہوتے۔ تم اِس گھر سے کب کے چلے گئے ہو مگر فاقے اب تک اِس گھر سے نہیں گئے۔ مجھے آج بھی چالیس پچاس سال پرانا منظر یاد آجاتا ہے، جب تم خون تھوکتے تھے، بخار میں جل رہے ہوتے تھے، تمہیں مزدوری کرنا پڑتی تھی۔ آج تیسری نسل بھی اُسی طرح خون تھوک رہی ہے، بیماریوں نے انہیں گھیرا ہوا ہے وہ تعلیم کے لفظ سے آشنا نہیں۔ ہم دعوے کر رہے ہیں کہ ہم نے بہت ترقی کر لی ہے۔ انسان چاند پر پہنچ گیا ہے لیکن تمہاری اولاد تو زمین پر رہنے کے بھی قابل نہیں۔ تمہارے گھر میں اتنی جگہ نہیں ہے کہ تمہارے بچے، بچیاں، پوتے، پوتیاں اور بہویں، جو رات دِن مزدوری کرتی ہیں، آرام سے سو سکیں۔ تمہارے کنبے کی وجہ سے مجھے انتخابی جنگوں میں بار بار کامیابی ملی، تمہارے رشتہ دار رب نواز، غلام محمد وغیرہ نے ہر مرتبہ میرا ساتھ دیا، سچ بات تو یہ کہ نہ صرف مخدوم رشید بلکہ اردگرد کی بستیوں کے موچیوں، نائیوں، لوہاروں، ترکھانوں، جولاہوں، کمہاروں، قصابوں، ماشکیوں اور دایوں کا کردار میری کامیابی کی بنیاد بنا اور میں اسمبلی تک پہنچ گیا۔ مجھے شرمندگی ہوتی ہے کہ علاقے کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حالت بدلنے کے اتنے مواقع ملے مگر وہ کچھ نہ کر سکا جو مجھے کرنا چاہیے تھا، میں تو لوگوں کو یہ بھی نہ بتا سکا کہ ہمارے پیارے نبیؐ اپنے جوتے خود گانٹھتے تھے۔ یقیناً اُن کے ہاتھ میں جوتا سینے والی آر ہوتی ہوگی، جب وہ دھاگے کو جوتے سے گذارتے ہونگے تو یہ منظر نہ صحابہؓ سے چھپا رہتا ہوگا اور نہ گھر والوں سے، جو کام دُنیا کی عظیم ترین ہستی نے کیا، چاچا شیر محمد تم بھی وہی کام کرتے رہے۔ جبہ دستار پہننے والے بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اِس سنت پر عمل کرنے کی تلقین کرتے تو کم از کم اِس پیشے سے توہین کا عنصر ختم ہو جاتا اور معاشرے میں آپ کو وہ مقام مِل جاتا جسے طبقاتی نفرت نے آپ سے چھین لیا ہے، دُنیا کے محنت کشوں کی بات کرنے والوں نے بھی صِرف تقریروں میں آپ کے دکھوں کا علاج ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ یہ خط لکھ کر میں بھی اِن گفتار کے غازیوں میں شامل ہو گیا ہوں۔

چاچا شیر محمد! تمہارے ساتھ باتیں کرتے کرتے مجھے اپنا بھائی نیامت موچی یاد آ گیا ہے، میں سوچ رہا ہوں کاش! میں نیامت موچی ہوتا جو بستی چھٹہ سے مخدوم رشید آ کر میرے ماموں الحاج صوفی امیر شاہ کی دکانوں کے سامنے بیٹھ کر تیس سال تک لوگوں کے جوتے چمکاتا رہا، اب اس کا بیٹا بھی اسی جگہ بیٹھ کر وہی کام کر رہا ہے۔

وہ وقت پر نماز پڑھتا تھا۔ بڑے لوگوں کی طرح بجلی چوری نہیں کرتا تھا۔ تمام واجبات وقت پر ادا کرتا تھا، قومی دولت کی لوٹ مار میں ملوث نہیں تھا، ووٹ کی قیمت وصول نہیں کرتا تھا اور اپنے نظریات پر سودے بازی نہیں کرتا تھا۔

وہ کٹر "وہابی" تھا اور میرے ماموں روزانہ دربار شریف پر حاضری دینے والے، محفل میلاد کے اجتماعات کا انعقاد کرنے والے، ہر جگہ وہابیوں کے خلاف تبرا بولنے والے، وہ بااثر مرشد زادہ تھے، تھانہ اور تحصیل کے افسران ان کو جھک کر سلام کرتے تھے، نیامت موچی کی اکثر شاہ صاحب سے اس مسئلہ پر تو تکرار ہو جاتی، نیامت موچی انہیں کھری کھری سنا دیتا، اسے اپنے نظریات، اپنے رزق سے زیادہ عزیز تھے وہ اس بات سے بے نیاز ہو جاتا کہ شاہ صاحب اگر اسے اٹھا دیں تو اس کے بچوں کا کیا بنے گا۔ شاہ صاحب اور نیامت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

موچی اجتماع ضدین تھے،مگر ان کی دوستی بھی مثالی تھی۔ نیامت موچی جماعت اسلامی سے متاثر تھا۔ وہ ہمیشہ انتخابات میں میرا ساتھ دیتا جب جماعت اسلامی کا امیدوار میرے مد مقابل ہوتا تو وہ مجھے ووٹ دینے سے انکار کر دیتا بلکہ جماعت اسلامی کی انتخابی مہم میں میرے خلاف بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا۔

چاچا شیر محمد! انگریز نے ووٹ کا حق ان لوگوں کو دیا تھا جو ٹیکس گذار تھے، نیامت موچی اور آپ دونوں بھی ٹیکس گذار ہیں۔ لیکن ٹیکس دینے کی اس تشریح پر پورا نہیں اترتے جو انگریز نے کی تھی۔ آپ لوگوں نے جب اپنی مرضی سے اپنا ووٹ مجھے دیا تو آپ کو چوہدریوں اور شاہ صاحبان کے عتاب کا نشانہ بننا پڑا کیونکہ آپ ابھی تک Tax Payer کے معیار پر پورا نہیں اترے۔ اس لئے آپ کو اپنا ووٹ آزادانہ طور پر استعمال کرنے کا حق نہیں دیا گیا۔ ہمارے جنرل اور ہمارے فیوڈل اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ حکومت کا حصہ بننے کا حق اسی کا ہے جسے انگریز نے وفاداری کی سند عطا کی تھی اس طبقے کو تمہارے ووٹ نہ بھی ملیں تو اس کا حق حکمرانی ختم نہیں ہوتا، اور اگر آپ کو ووٹ کا حق مل بھی جائے تو آپ کو اسے آزادانہ استعمال کا حق ہرگز نہیں دیا جاسکتا، ان پر لوٹ کھسوٹ کے الزامات بھی انہیں حکومت کا حصہ بننے سے نہیں روک سکتے، وہ ملک اور قوم کے وفادار ہوں نہ ہوں ہر حکومت کے وفادار ہوتے ہیں، حکومت جس کسی کی ہو وہ اسی کے ہوتے ہیں، وہ تمہارے ووٹ کے حق کو دل سے تسلیم نہیں کرتے، وہ جمہوریت کا راستہ روکنے کی سازشوں کا حصہ بن جاتے ہیں تاکہ انہیں تمہاری آنے والی نسلوں کے سامنے جوابدہ نہ ہونا پڑے میں نے یہ عہد کرلیا ہے کہ میں تمہارے بچوں کے اس حق کے لئے آخری سانس تک لڑوں گا۔

والسلام!

خیر اندیش!

جاوید ہاشمی!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مقدر کی تختی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

برادرم محترم عاشق محمد پاولی "جولاہا" صاحب

السلام علیکم!

کئی دنوں سے اسی ادھیڑ بن میں لگا رہا کہ آپ کو خط لکھوں یا نہ لکھوں، بالآخر آج قلم اٹھا ہی لیا۔ میں نے آخری مرتبہ آپ کو اس وقت دیکھا تھا جب آپ ہڈیوں کے ڈھانچے میں تبدیل ہو چکے تھے، بیماری نے آپکا کچومر نکال دیا تھا، آپ چند لمحوں کے مہمان نظر آتے تھے۔ آپکی وفات کی خبر مجھے نہیں ملی نہ ہی میں آپکے جنازے میں شریک ہو سکا۔ جسکا مجھے آج تک دکھ ہے۔ آپ جس وقت کپڑا بُن رہے ہوتے تھے، میں پہروں بیٹھ کر یہ عمل دیکھتا تھا۔ بھائی عاشق محمد، آپکی ساری زندگی ایک قبر میں گذری۔ ساتھ والے کھڈے پر بھابھی فاطمہ بھی یہی عمل دُہرا رہی ہوتی تھی، آپکے دونوں پاؤں اور دونوں ہاتھ مصروف کار ہوتے تھے، آپکی نظریں دھاگے پر جمی ہوتی تھیں، آپکے ہاتھوں کے بنے ہوئے کپڑے میں نے بچپن میں پہنے، آپکے ہاتھوں کی بنی ہوئی رنگین کھیسیاں مجھے سردی سے بچاتی تھیں۔ بستر کی چادریں اور چاندنی بنانے میں تو آپ کو ملکہ حاصل تھا۔ آپکی بیوی، بچے قبرستان کی وسیع جگہ پر دھاگوں کو لکڑی کے بنائے ہوئے سٹینڈ پر پھیلاتے تھے، اس سٹینڈ کو گھوڑی کہتے تھے۔ دھاگے کو مضبوط کرنے کیلئے اُس پر پان چڑھائی جاتی تھی، یہ گندم کا گودا ہوتا تھا جو دھاگے میں تناؤ پیدا کرتا تھا، سارا دن آپ کے خاندان کے افراد رچھ ہاتھ میں لئے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بھاگتے رہتے۔ یہ عجیب منظر ہوتا کہ سب اپنی دُھن میں ایسے بھاگتے جیسے یہ اُن کی زندگی کی آخری دوڑ ہے، مگر یہ تو نہ ختم ہونے والی میراتھان تھی۔ خواتین گنگناتی رہتی تھیں، لگتا تھا کہ وہ کچے دھاگوں کیساتھ اپنے دُکھ سُکھ بانٹ رہی ہیں۔ لوگ اِنکے بالکل قریب مُردے دفنانے کیلئے آتے مگر یہ مرد، عورتیں اپنے خیال میں گم ہوتے۔ اُنہیں ایک دُھن سوار ہوتی کہ وہ اتنے کپڑے بُن لیں کہ اپنے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بچوں کو پال سکیں۔ آپ کے گھر کے سامنے مسجد تھی، آپ اکثر کنوئیں سے پانی نکال کر مسجد کے سقاوے میں ڈالتے دکھائی دیتے تھے، تاکہ نمازیوں کو وضو میں آسانی ہو، آپ ہمیشہ جماعت کی پہلی صف میں ہوتے تھے، آپکو معاشرے کی ناہمواریوں سے کوئی گلہ نہیں تھا، آپکے بچے آج بھی اُسی مکان کے اندر ہیں، آپ کے پوتے پوتیوں کا طرزِ زندگی بھی وُہی ہے۔ نئے قائم ہونے والے سکولوں کے دروازے اُن پر نہیں کھل سکے، وہ فکرِ مُعاش سے باہر نہیں آسکے۔ تمہارا بیٹا خان محمد ملتان سے سبزیاں لاکر بیچتا ہے۔ زندہ درگور ہونے کی بجائے دُکان کے تھڑے پر بیٹھتا ہے، قبر سے نکل کر ایک تھڑے پر بیٹھ کے سبزیاں بیچنا اسکی ترقی ہے، آپ کے والد اور اس کے دادا غلام محمد نے بھی گنڈیریاں بیچنے سے مٹھائی بنانے تک سب کاروبار کیے۔ قیام پاکستان سے پہلے ہمارے گاؤں میں تمام دوکانیں ہندوؤں کی تھیں چاچا گامن ہمارے گاؤں کا پہلا مسلمان تاجر تھا۔ تمہاری پوتیاں، تمہاری نواسیاں کولہو کے بیل کی طرح اپنے معاش کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ آپکی بیٹیاں جب کپاس چننے کیلیے جاتی تھیں تو اُنہیں کھیت مالکان کی جھڑکیاں سُننا پڑتی تھیں اور اگر اپنی بکری کیلیے تھوڑا سا گھاس اُٹھا لیتیں تو اُنہیں دشنام طرازی کا سامنا کرنا پڑتا۔ اچھا ہوا تمہارا بیٹا حسن جوانی میں مرگیا ورنہ اس کا انجام بھی یہی ہوتا جو باقیوں کا ہو رہا ہے۔

اب تم اِس دُنیا میں نہیں ہو، تمہاری بیوی فاطمہ بھی نہیں ہے۔ مجھے دھاگے کی بُنت اور وہ مشقت، جسکے نشانات تمہارے ہاتھوں پر تھے اچھی طرح یاد ہیں۔ ایک ایک لمحہ میرے حافظے میں محفوظ ہے۔ سوچتا ہوں قومی سطح کے فیصلے کرنے کے قابل ہو گیا ہوں، ملک کی تقدیر سنوارنے کی باتیں کرتا ہوں، میرے بچے اچھے سکولوں میں پڑھ گئے ہیں، میرے اور میرے تمام رشتہ داروں کے بچوں کے تعلیمی معیار میں یقیناً اضافہ ہوا ہے۔ صرف اِس بات پر پورے پاکستان کو تعلیم یافتہ کہہ دینا اور اِسی کو ترقی کا نام دے دینا منافقت نہیں تو کیا ہے؟ یہ سفید جھوٹ نہیں تو کیا ہے؟ میں واپس گاؤں کیسے آؤں؟ تمہارا سامنا کیسے کروں؟، تمہاری وہ ساری خدمات جو والد محترم کیلیے تُم رات دِن سرانجام دیتے تھے مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ تُم ساری ساری رات جاگ کر ہمارے لئے سوہن حلوہ بناتے تھے۔ ہمارے گھر اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بازار کے سارے کام تم نے اپنے ذمہ لئے ہوئے تھے مگر میں اِس کے بدلے میں تمہارے خاندان کیلئے کچھ بھی نہ کر سکا۔

والد محترم کے مریدین میں آپ کو خاص مقام حاصل تھا۔ آپ نے اُن کے حلقہ ارادت کی زنجیر اپنے گلے میں ڈالی ہوئی تھی اور اُن کے ہر حکم کی تعمیل کو اپنے ایمان کا حصہ سمجھتے تھے۔ نہیں عاشق محمد میں نہیں آنا چاہتا، میں آنکھیں چُرا رہا ہوں تم سے، تم زندہ ہوتے ہوئے بھی قبر میں تھے، اب تمہارے گھر سے تمھاری قبر کا فاصلہ چند سو گز سے زیادہ نہیں۔ جو پیچھے بچے ہیں کیا وہ زندہ ہیں؟ کیا اُن کا حق زندگی پر اُسی طرح ہے؟ اُن کو سر چھپانے کیلئے چھت جو تم بنا کر دے گئے تھے وہی موجود ہے۔ پاکستان ترقی کر گیا ہے۔ یہ بات میں کہوں تو تم عقیدت کی وجہ سے اپنے لب سی لو گے، میں تمہاری اِس عقیدت کا فائدہ اُٹھانا چاہتا ہوں، تمہاری زبان بند کرنا چاہتا ہوں، میں تمہارا مرشد زادہ ہوں، میرا کہا غلط نہیں ہو سکتا، کیا تم احتساب کرو گے میرا؟ ہاں اب تم مرنے کے بعد میرا احتساب کر سکتے ہو۔ مجھے جیل میں بیٹھے ہوئے تمہارے سوالوں کا جواب تلاش کرنا ہے، یہی چبھن مجھے چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ جب تک میں ملک کے ہر بچے کے ہاتھ میں کتاب نہ دیکھ لوں ہر بچے کے چہرے پر مسکراہٹ نہ دیکھ لوں، جب تک اُسکے معاشی مستقبل کو محفوظ نہ کر سکوں، میں سکون سے نہیں بیٹھوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے، اب میں نے وعدہ کر لیا ہے، تمہیں اپنے مرشد زادے کے وعدے پر یقین کرنا ہوگا۔

اگر قائداعظم محمد علی جناح کے دادا پونجا بھائی، اُنکے چچا ولی بھائی نتھو بھائی اور والد جناح بھائی کاٹھیاوار میں پنیلی کے گاؤں میں کھڈیوں پر اپنے ہاتھوں سے کپڑا بُنتے ہوئے ایک ایسا فرزند پیدا کر سکتے ہیں جو بابائے قوم ہے، تو تم اور تمہاری نسلیں کپڑا بُننے کی وجہ سے معاشرے میں باعثِ احترام کیوں نہیں ہیں۔ رانا عبدالوحید علی گڑھ میں پڑھنے کے باوجود وہ مقام کیوں حاصل نہیں کر سکا جو اُسکا حق ہے۔ تمہارے مقدر کی تختی پر تو وہ کچھ نہیں لکھا ہوا تھا جو تمہاری موت کے بعد تمھاری قبر کی تختی پر لکھ دیا گیا ہے۔

خدا حافظ!

تمہارا مخلص! جاوید ہاشمی!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

احساس جرم کی صلیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

چاچا خیر محمد "کمہار" صاحب

السلام علیکم!   مزاج بخیر!

مجھے معلوم ہے کہ آپ اب اِس دُنیا مین نہیں ہیں۔ میں بھی کئی سالوں سے اُس دُنیا میں نہیں ہوں۔ جہاں آپ سے ملاقات ہوتی تھی، آپ اور آپ کے تمام رشتہ داروں کے گھروں کے اردگرد ہماری زمینیں تھیں، میں اکثر آپ کے گھر سے گذرتا، آپکے صحن میں بیریوں کے تین گھنے درخت تھے، برابر میں سرکنڈوں کی ایک چھپر بنی ہوئی تھی جس کے نیچے بیٹھ کر آپ چاک کو پاؤں سے گھماتے ہوئے نظر آتے، گھر کے شمالی حصے میں آپکی اور آپ کے بھائیوں کی رہائش تھی اور گلی کے مغرب میں جانور باندھنے کا باڑہ۔

آپ کی سفید داڑھی اور سر پر بغیر کلف کی سفید پگڑی آپ کی شخصیت کا حصہ تھی، گرمیوں میں کام کرتے ہوئے آپ کے گلے میں قمیض نہیں ہوتی تھی، مگر سر پر پگڑی ہر وقت موجود رہتی۔ آپکے خاندان کی اکثریت کا رنگ گورا تھا اور آنکھیں سبز اور نیلی، آپ کا چھوٹا بھائی غلام رسُول گدھوں پر مٹی اور کچی اینٹیں ڈھو کر جو کچھ کماتا آپ کی تلی پر رکھ دیتا، آپ اور آپ کے تمام بھائی نماز کے وقت، اپنا سب کام چھوڑ کر، مسجد میں اکٹھے ہو کر با جماعت نماز ادا کرتے۔

میں انہماک سے آپ کو کام کرتے دیکھتا رہتا۔ چاچا خیر محمد! میں اب بھی دیکھ رہا ہوں، تمہارا بھائی شیر محمد، تمہاری بیوی، تمہاری بھابھیاں، تمہارے کام میں شریک ہو گئی ہیں، تمہارا بیٹا غلام محمد، بھتیجا خدا بخش، عاشق محمد سارے مل کر تمہاری مدد کر رہے ہیں۔ مٹی میں پانی ڈال کر اسے گوندھا جا رہا ہے۔ ریت ملا کر اس میں لچک پیدا کی جا رہی ہے۔ اب مٹی کو چاک پر چڑھایا جا رہا ہے۔ تمہارے پاؤں چاک کو چلا رہے ہیں، دونوں پاؤں زمین کے گڑھے میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں، دونوں ہاتھ مٹی کو مختلف برتنوں میں ڈھال رہے ہیں۔ کہیں پیالہ بن رہا ہے، کہیں لوٹا اور گھڑے بنائے جا رہے ہیں، کہیں آٹا گوندھنے کی پراتیں، سالن پکانے کی ہانڈی بن رہی ہے اور مٹی کئی روپ اختیار کر رہی ہے۔ مٹی کا یہ رُوپ اب مٹی نہیں کہلا رہا۔ اب یہ لوٹا، گھڑا، پیالہ ہے، اس کے کئی نام ہیں۔ اس کو پکانے کیلئے مختلف جگہوں سے ایندھن جمع کیا جا رہا ہے۔ ہمارے کھیتوں سے بھی کچھ لکڑی، بطور امداد آپ کو دی گئی ہے، جس کی وصولی کئی طریقوں سے کر لی جائیگی۔ مٹی کے کچے برتنوں کو ایندھن کے نیچے ڈھانپ کر آگ لگا دی جائے گی، کئی مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ قبل از وقت برتن نکال لئے گئے جو کچے رہ گئے کئی مہینوں کی محنت ضائع ہو گئی۔ ایسا بھی ہوا کہ ابھی برتن آوے میں رکھے جا رہے تھے کہ بارشوں کیوجہ سے وہ دوبارہ مٹی ہو گئے مگر میں نے کبھی تمہیں حوصلہ ہارتے نہیں دیکھا تھا، تمہارے بھائی شیر محمد کے چہرے پر بھی ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔

تمہاری خواتین ہمارے گھروں میں کام کاج کرتی تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ اُن کا احترام کیا جاتا تھا لیکن دوسرے گھروں میں جا کر برتن دھونا، کپڑے دھونا، صفائی کرنا آسان کام نہیں، پھر کھیتوں میں جا کر کپاس کی چنائی کے دنوں میں اضافی مزدوری کرنے سے خواتین کا کام مردوں سے بھی بڑھ جاتا تھا اور آج بھی یہ محنت مزدوری جاری ہے۔ میں نے سنا ہے کہ اب آپ کے بچوں نے برتن بنانے چھوڑ دیئے ہیں۔ اُن تمام بچوں نے سکول کا منہ نہیں دیکھا۔ تمہارے خاندان کے چند ایک افراد کے پاس گدھے موجود ہیں۔ جن پر وہ بار برداری کا کام کرتے ہیں، مگر ٹریکٹر ٹرالیوں نے اُن کی اِس مزدوری کو بھی محدود کر دیا ہے۔ پلاسٹک کے برتنوں نے تمہاری مٹی کے برتنوں کو ہماری زندگیوں سے باہر کر دیا ہے۔ تمہارے بچے بیروزگاری کے عفریت کا سامنا کر رہے ہیں۔ مجھے سارا ماحول اور سارے مراحل اچھی طرح یاد ہیں۔ میں پانچ مرتبہ رکن منتخب ہونیوالا، کئی مرتبہ وفاقی وزیر بننے والا آپ کا ہمسایہ ہوں۔ آپ کے گھر کو دیکھتا ہوں، جہاں کا ایک بچہ بھی تعلیم یافتہ نہیں ہے تو میرے دامن میں سوائے شرمندگی کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ میری ان تمام کوتاہیوں کے باوجود تمہارے تمام بچے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تمہارے بھتیجے تمہاری خواتین، تمہارے پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں مجھے اسمبلی تک پہنچانے کیلئے اپنے ووٹ کا استعمال میرے حق میں کرتے ہیں، میں ان کیلئے کیا کرسکا ہوں؟ میں اُن کی محبتوں کا جواب نہیں دے سکا وہ میری ہر انتخابی مہم کا ہراول دستہ ہوتے ہیں۔ وہ میری سیاست کا ایندھن ہیں یا مٹی کے کچے برتن جن پر بارش برس جاتی ہے اور وہ مٹی میں مل کر پھر مٹی ہو جاتے ہیں، اُن کی معاشی حالت اِس سے بھی اَبتر ہے جو پچاس سال پہلے تھی۔ ترقی کا قافلہ اُن کی دہلیز سے گذر کر ہماری حویلیوں تک پہنچتا ہے۔ اُن کے دروازے کھلے رہتے ہیں، مگر ترقی وہاں داخل نہیں ہوتی، اُن کی بیٹیاں اُسی طرح لوگوں کے گھروں میں کام کرتی ہیں، زمینداروں کی زمینوں پر کام کرتے ہوئے جھڑکیاں سنتی ہیں۔ روشنی کی کرن راستہ بھول کر بھی اُن تک نہیں پہنچتی اُن کی قسمت کی خرابی کا ذمہ دار کون ہے؟ اُن کا مسیحا کہاں ہے؟ آپ کی بھابھی ماسی حیات آج بھی بڑھاپے کے باوجود ہمارے گھروں میں مزدوری کر رہی ہے۔

چاچا خیر محمد! مجھے تم سے آنکھیں چرانے کا یہ راستہ ملا ہے کہ میں خاموش رہوں، میری خاموشی کو میرا اعترافِ جُرم سمجھ لینا۔ اِس جُرم کی سزا میں پہلے ہی کاٹ رہا ہوں، مزید سزا بھی دو گے تو میں اِس کا مستحق ہوں، میں نے اگرچہ تختہ دار پر قدم نہیں رکھا مگر احساسِ جرم کی صلیب پر لٹکا ہوا ہوں اور اُس وقت تک لٹکا رہوں گا جب تک اپنی کوتاہیوں کی تلافی نہیں کر لیتا۔

چاچا خیر محمد! تم جسے سچ سمجھتے تھے، مُنہ پر کہہ دیتے تھے۔ تُم بڑے انسان تھے، تمہارے چہرے پر آج بھی وہی مسکراہٹ ہے جس مسکراہٹ کی میں تمنا کرتا ہوں، جس خوشی کی تلاش میں در بدر ہوں، جس خوشی کو حاصل کرنے کیلئے قید میں ہوتے ہوئے محسوس کرتا ہوں جیسے میں جنت میں داخل ہو رہا ہوں۔ یہ معمولی سی قربانی دے کر اگر میں اس نظام کی تبدیلی کے عمل میں اپنا حصہ ڈال لوں تو پھر تمہاری قبر پر پھول چڑھانے ضرور آؤنگا۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ اب اِس ملک میں کوئی اَن پڑھ نہیں رہیگا، کوئی ظالم نہیں آئیگا، جبر کے نام پر لوگوں کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گردنوں میں طوق ڈالنے والا کوئی نہیں ہوگا، انتظار کرنا چاچا خیر محمد، دیر ضرور ہوئی ہے لیکن میں بھٹکا ہوا مسافر نہیں ہوں۔ میں اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوں، مقاصد میری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوئے، اس ملک کے کونے کونے میں تعلیم کے دیئے روشن کرنے ہیں، ہر گھر کو بھوک اور افلاس سے نجات دلانی ہے۔ لوگوں پر لوگوں کی بالادستی کو ختم کرنا ہے، رات کے دو بجے بیٹھ کر اِس ملک کے بچوں کے بارے میں جو درد محسوس کر رہا ہوں، دعا کرو یہی درد میرا سرمایہ بن جائے اور اِس سرمائے کیساتھ میں تعمیرِ وطن کرسکوں، میرے لئے دُعا ضرور کرنا! میں جو خواب بن رہا ہوں اسکی تعبیر مل گئی تو یہ میری خوش بختی ہوگی اور میرے لئے ایک بے پناہ مُسرت کا سامان بھی۔ یہ عجیب واقعہ ہے کہ پاکستان بنانے والوں میں فکری مواد فراہم کرنیوالے اکثر افراد کچلے ہوئے طبقات میں سے تھے۔ دولت مندوں نے پاکستان بنتے وقت انگریز اور ہندوؤں کا ساتھ دیا، تمہارے قبیلے کے ایک فرد مولانا ظفر علی خان نے اپنے افکار سے انگریز اور ہندو کو للکارا۔

والسلام!

خیر اندیش!

جاوید ہاشمی!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ماضی سے نجات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

چاچا خیر محمد "کمہار" صاحب

السلام علیکم! مزاج بخیر!

چاچا خیر محمد! میں اِسوقت یونان کے دارالحکومت ایتھنز کے اس حصے میں کھڑا ہوں جہاں مٹی کے برتنوں کی بڑی بڑی دکانیں ہیں، یہ تمام برتن پہلے زمانے کے ہیں، انہیں آثارِ قدیمہ کہتے ہیں، اُن برتنوں کو دکھانے والی ایک لڑکی نے جب "پاٹری"(Pattery) کا نام لیا تو مجھے فوراً آپکے ہاتھوں کے بنائے ہوئے برتن یاد آئے جسکو گاؤں میں پاتری کہتے ہیں۔ اِس میں آٹا گوندھا جاتا ہے، برتنوں کی یہ مماثلت مجھے کہیں دُور لے جارہی ہے میں اُس لڑکی کو کہتا ہوں کہ یہ برتن جو تمہارے لئے آثارِ قدیمہ ہیں ہمارے گاؤں کے ہر گھر میں آج بھی استعمال ہو رہے ہیں تمہاری بیٹی نوراں، اللہ وسائی اور یونان کی گلیوں میں چلنے والے لوگوں کی شکلوں میں کتنی مماثلت ہے نوراں کی ساری زندگی میرے سامنے ہے تم نے اسے اپنے بھتیجے خدا بخش سے بیاہ دیا جس کی شکل واجبی تھی مگر عمل کی دُنیا میں وہ مردِ درویش تھا وہ کئی بچے چھوڑ کر اس دُنیا سے چلا گیا، اسے واپسی کی جلدی تھی، نوراں بیوہ ہوگئی وہ ہمارے گھروں میں برتن دھو کر اپنے بچوں کا رزق تلاش کرتی ہے اس کی گہری سبز آنکھیں اور سرو جیسا قد اس کے کردار کی بلندی کی مثال بن گیا ہے۔ خدا بخش کے بچے اب جوان ہو رہے ہیں نوراں کے دُکھ ٹل جائیں گے۔ ایک مرتبہ میں نے نُوراں اور اس کی بہنوں کو کپاس کی چنائی کے دنوں میں کوئی سخت بات کہہ دی مجھے کہنے لگیں سائیں "تہاں کوں اے نئیں ٹھاہندی" (جو بات آپ کر رہے ہیں یہ آپ کے شایانِ شان نہیں ہے) یہ فقرہ میری پوری زندگی پر اشتہار بن کر چسپاں ہوگیا میں ساری عمر یہ سوچتا رہتا ہوں کہ کوئی ایسی بات نہ کروں جو مجھے "نئیں ٹھاہندی" ہو یعنی میرے شایانِ شان نہ ہو۔ مجھے عزت نفس (Self

www.iqbalkalmati.blogspot.com

Respect) کا یہ سبق بہت ساری کجیوں سے اور بہت ساری کم ہمتیوں سے بچا لیتا ہے۔ ہر کام کرنے سے پہلے دیکھتا ہوں کہ یہ کوئی گری ہوئی بات تو نہیں ہے، اللہ وسائی اور نوراں کا تصور میرے بارے میں کیا ہوگا، اِس ایک بات نے مجھے ہر کام میں توازن اور عزتِ نفس کو برقرار رکھنے کا سبق دیا ہے۔

چاچا خیر محمد! کبھی کبھی تو میں سمجھتا ہوں کہ میرا جیل میں بیٹھنا بھی عزت نفس بچانے کی واردات ہے۔ میں ایتھنز (یونان) سے پھر واپس اپنے گاؤں آگیا ہوں، سُنا ہے اب یہاں کوئی پراتیں بھی نہیں بناتا، پلاسٹک کے برتنوں نے مٹی کے پیالوں کی جگہ لے لی ہے اور تمہارے بچوں کا روزگار اب اس فن میں نہیں رہا جو صدیوں سے تمہارے پاس تھا۔ ایتھنز میں جو لڑکی مجھے مٹی کے برتنوں میں تین ہزار سال کی تاریخ دکھانے کی کوشش کر رہی تھی اس کو دیکھ کر لگتا تھا تمہاری بیٹی نوراں اپنی بیوگی کے دکھوں کے مداوے کے لئے تین ہزار سال پیچھے چلی گئی ہو۔ میں نوراں کو تمھارے مٹی کے برتنوں سمیت ایتھنز میں دیکھ سکتا ہوں، مخدوم رشید میں نہیں دیکھ سکتا۔ کیونکہ ہم اپنے ماضی سے نجات حاصل کرنے کی جلدی میں ہیں اور ایتھنز والے اپنے ماضی کو سرمایہ افتخار سمجھتے ہیں۔ ہم زندہ فن کو دفن کرنا چاہتے ہیں اور وہ مردہ دفینوں کو زندہ جاوید بنانا چاہتے ہیں۔

اللہ حافظ!

آپکا مخلص!

جاوید ہاشمی!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

غریب نواز سلامت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

ماما پیر بخش "حجام" صاحب!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

آپ اکثر صبح سویرے میرے والد محترم کی حجامت بنانے کیلئے ڈیوڑھی پر موجود ہوتے تھے۔ بیشتر اوقات صبح سے شام تک حجامت کے ہتھیار سجا کر بیٹھے رہتے، اِس انتظار میں کہ مخدوم صاحب زنانخانے سے نکلیں اور اُن کے بال تراشے جائیں۔ پانی گرم کرنے کیلئے کنستر چولہے پر رکھا ہوتا تھا۔ شام ہو جاتی اندر سے پیغام آتا پیر بخش کل آئے۔ آپ دُوسرے دن پھر آتے۔ والد صاحب باہر نکلتے تو گھنٹوں بالوں کی خراش تراش جاری رہتی۔ آپ کے حجامت بنانے کے سامان والا چمڑے کا بکس، رچھانی پرانی ہو کر جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ آپ ہر دروازے پر جا کر زمینداروں کی حجامتیں بناتے تھے، جس کا معاوضہ طے شدہ نہیں تھا۔ سال کے آخر میں کچھ گندم اور سردیوں میں تھوڑی سی کپاس مل جاتی تھی اور وہ بھی اس طرح جیسے آپکو بھیک دی جا رہی ہو۔ کسی گھر سے روکھی سوکھی مل جاتی تھی تو آپ خوشی سے کھا لیتے، وگرنہ سارا دن کام کرتے اور کھانا گھر جا کر کھاتے۔ ماما پیر بخش! شادی کے موقع پر لوگ آپ کو پیسے یوں دیتے تھے جیسے آپ کی عزتِ نفس خریدی جا رہی ہو اور آپ اونچی اونچی آواز میں اُن کا نام لے کر کہتے تھے" دو روپے دیتا ہے فلاں محترم صاحب رہنے والا مخدوم رشید کی نگری کا غریب نواز سلامت"۔ مجھے غریب نواز سلامت کے معنی نہیں آتے تھے اب مجھے سمجھ آئی ہے کہ دو روپے دینے والا غریب نوازی کر رہا ہوتا تھا اور تم اُسکی سلامتی کی دُعائیں مانگا کرتے۔ آج تم اِس دُنیا میں نہیں ہو، تمہارے بعد تمہارے دونوں بیٹوں نے بھی یہی پیشہ اختیار۔ کیا ایک ایک دروازے پر جانا، کام کرنا، خون پسینہ ایک کرنا اور اگر کوئی سال بعد اِس کی مزدوری دے دے تو اِس مزدوری کو پا کر خوش ہونا، مجھے یہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سارے مناظر یاد ہیں۔

میں نے سنا ہے تمہارے دونوں بیٹے چند روز قبل فوت ہو گئے ہیں، وہ تو پہلے ہی مرے ہوئے تھے۔انھوں نے کسی سکول کا منہ دیکھا نہ کبھی اپنے تن کو اچھی طرح ڈھانپ سکے، صبح سے شام تک تلاشِ مُعاش میں بھاگتے رہتے۔ بڑے زمیندار حجامت بنوانے کیلئے ان پر یوں احسان کرتے جیسے وہ تمھارے بیٹوں کا مقدر سنوار رہے ہوں۔تمہارے پوتے پوتیاں تمہارے نواسے نواسیاں اسی طریقے سے لوگوں کے گھروں میں کام کر رہے ہیں جیسے تمہاری بہو، بیٹیاں، بیوی، بہنیں کیا کرتی تھیں۔

ماما پیر بخش! میں کبھی کبھی خواب دیکھتا ہوں کہ تمہارے بیٹے کالج میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، کرکٹ کھیل رہے ہیں، کالج کی یونیفارم پہن کر اٹھکیلیاں کر رہے ہیں، کمپیوٹر کی تعلیم حاصل کر کے معاشرے کا مفید حصہ بن گئے ہیں۔تمہارے گھر میں اُجالا ہی اُجالا دیکھتا ہوں۔ یہ ہنستے مسکراتے، صحت مند چہرے، اُن منہ بسورتے، روتے بچوں کی جگہ لے لیتے ہیں جو تمہارے گھر میں آج بھی ہیں۔ جن کی معصومیت چھن گئی ہے، جن پر جوان ہوئے بغیر جوانی کا بوجھ ڈال دیا گیا۔ جب میں اِن بچوں کو تمہارے آنگن میں اس حالت میں دیکھتا ہوں تو میری آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے بھیگ جاتی ہیں مگر یہ تو ایسے خواب ہیں جو ابھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوئے۔

ماما پیر بخش! تمہارے دَرد کی کہانی اس پورے ملک کے درد کی کہانی ہے۔تمہاری عورتوں کی کہانی بھی پورے ملک کی عورتوں کی کہانی ہے۔ جن کے سر پر دکھوں کے بوجھ کی گٹھڑی روز بروز بھاری ہوتی جا رہی ہے۔کون کہتا ہے کہ آج کے زمانے میں لوگ اپنی بچیوں کو زندہ دفن نہیں کرتے، جس بیٹی کو آنکھیں کھولتے ہی دوسروں کے دروازں پر کام کرنا پڑے، جو بیٹی علم کے تصور کو بھی نہ پا سکے، جو بیٹی ماں باپ کی طبقاتی نفرتوں کا بوجھ وراثت میں پائے، جو جہیز نہ لانے پر زندہ جلا دی جائے جو اپنے خاوند کی خدمت کر کے بھی جسمانی تشدد کی حقدار گردانی جائے، وہ بیٹی کب زندہ ہوتی ہے؟ اسکا بیٹی ہونا ہی جرم ہے۔تمہارے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تو بیٹوں کی زندگی کو بھی زندگی کہنا زندگی کی توہین ہے۔ غُربت میں پیدا ہونیوالے بیٹے بیگار کیمپ میں پیدا ہوتے ہیں، اُن کو اغوا کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ پیدا ہوتے ہی یرغمال بن چکے ہوتے ہیں اُنھیں دُور کسی خرکار کیمپ میں لے جانے کی کیا ضرورت؟ وہ جائے پیدائش کے خرکار کیمپ میں جبر کے سائے میں اپنا خون نچوڑ کر خود پیش کر دیتے ہیں۔

ماما پیر بخش یہ صرف تمہارے بیٹے بیٹیوں کا قصہ نہیں ہے، یہ صرف پاکستان کے غریب بچوں کی کہانی بھی نہیں ہے ہم سب بین الاقوامی خرکار کیمپوں میں رہ رہے ہیں۔ ہم بڑی طاقتوں کے ادنیٰ کارکن ہیں جو غریب ملکوں کو بچی ہوئی روٹی کے ٹکڑے اور کچھ چھیچھڑے پھینک دیتے ہیں۔ اور یہ مُلک نعرے لگاتے ہیں، "غریب نواز سلامت"

ماما پیر بخش! مجھے یاد ہے کہ سلطان ایوب قتال کے میلے پر تم ہمیں شیشہ دکھاتے تھے جس میں چہرہ نظر نہیں آتا تھا۔ سب اس شیشے کو اندھا شیشہ کہا کرتے تھے۔ لگتا ہے تم نے جان بوجھ کر ایسا آئینہ رکھا ہوا تھا۔ دراصل شیشہ اندھا نہیں ہوتا ہم ہی اپنا سامنا نہیں کرتے۔ ہمارے حکمران اور قوم کے محافظ بھی اندھے شیشے رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ قوم کی آنکھیں روشنی کھو چکی ہیں لہٰذا وہ کھل کھیلتے ہیں۔

ماما پیر بخش! ہم نے کبھی تمہیں شیشہ بدلنے کو کہا اور نہ آپ نے کبھی اندھے آئینے کو تبدیل کیا۔ آج مجھے اس اندھے آئینے کی اہمیت کا احساس ہو رہا ہے، کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی آئینے کا سامنا نہیں کرنا چاہتا، میرا جی تمہیں مبارکباد پیش کرنے کو چاہتا ہے، کہ تم نے ہمیں سچائی کا سامنا کرنے سے بچائے رکھا۔ اب تو تمہارے اندھے شیشے کی طلب بین الاقوامی سطح پر بڑھ گئی ہے۔ عظیم طاقتیں اِس کی تلاش میں ہیں۔ لگتا ہے تمہاری آنیوالی نسلوں کے دِن پھرنے والے ہیں۔ ساری دُنیا کے مدبر اِس آئینے کو پا کر اپنا سامنا کرنے سے بچ جائینگے۔ بصیرت سے وہ پہلے ہی محروم ہیں۔ اب بصارت کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ اِسی کو تو روشن خیالی کہتے ہیں۔ تمہاری طرح ہمارے حکمران بھی مغرب کی طرف منہ کر کے نعرہ لگاتے ہیں۔

غریب نواز سلامت!!

خدا حافظ! آپکا مخلص!

جاوید ہاشمی!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تاریخ کا نیا رخ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

چاچا خیرن "قصاب" صاحب!

السلام علیکم!

میں نے آپ کو چلتے پھرتے کم دیکھا آپ ہمارے گھر کھانا لینے آتے تھے کہ اچانک آپ کا آنا جانا بند ہو گیا فالج زدہ ہونے کے بعد آپکی زندگی چارپائی تک محدود ہو گئی تھی۔ اس کے باوجود میں نے آپکے چہرے پر ہمیشہ مُسکراہٹ دیکھی۔ آپ کی بیوی بُوا بکھاں آپ کی خدمت کیلئے ہر وقت موجود رہتی تھی، جب تک آپ کے ہاتھ پاؤں چلتے تھے، آپ نے بہت کوشش کی کہ اپنے پیشے کو تبدیل کر لیں، آپ نے کاشتکاری بھی کی، آپ میرے والد صاحب کے مزارعے بھی تھے، ان کی ملازمت بھی کی۔ لیکن پھر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دوبارہ اپنے پیشے میں آ گئے۔ آپ نے اپنے بیٹے غوث بخش کو دو تین جماعتیں تعلیم دلوائی۔ وہ جوان تھا متحرک تھا، اُسے زندگی سے محبت تھی، وہ میرے بڑے بھائی کا بھائی بن گیا۔ اُسے جوانی میں موت نے آلیا، آپ کا پوتا رفیق، چوتھی جماعت تک میرے ساتھ تھا۔ میری اُس سے دوستی تھی۔ اُس نے بھی سکول سے منہ موڑ لیا۔ بُوا بکھاں میری والدہ کی مشیر تھی، شادی بیاہ کی خریداری ہو یا ملتان سے کوئی اور خریداری، وہ ہر وقت میری والدہ کے ساتھ ہوتیں۔ سارا شہر ان کو ماسی بکھاں کہتا تھا اور ہم اسے بُوا بکھاں کہتے، وہ دانا عورت تھی، پے در پے مصیبتوں کا مقابلہ ہمت سے کرتی رہی، تقریبات کے موقع پر ہمارے گھر میں اُن کے پکائے ہوئے کھانوں کا اپنا مزہ ہوتا تھا، وہ صبح شام میری والدہ کی مصاحبت کیلئے موجود ہوتی تھیں، پھر آپ اِس دُنیا سے چلے گئے، بہو بھی بیوہ تھی، ساس بھی بیوہ ہو گئی۔ آج رفیق اُسی پیشے کو اپنائے ہوئے ہے، جس سے آپ نے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ محنت مزدوری کرنے میں کوئی عار نہیں۔ حاجی رفیق بھی مزدوری کر رہا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اب اللہ نے اس کا رزق فراخ کر دیا ہے اس کے ایک بیٹے نے سعودی عرب میں جا کر گوشت کے کاروبار سے اچھا خاصا پیسہ کما لیا ہے سیٹھ حسین بخش اور رحیم اللہ کے بچوں نے بھی محنت سے اپنی معاشی حالت ٹھیک کر لی ہے مگر فیوڈل معاشرے میں انہیں وہ مقام مل سکتا ہے جو حق انہیں اسلام یا ترقی یافتہ معاشروں نے دیا ہے؟ میرا جواب نفی میں ہے۔ اس کی انفرادی ترقی کا فائدہ تو اس وقت ہو گا جب معاشرتی سوچ میں ترقی کا پہلو نمایاں ہوں گا۔

چاچا خیرن! مجھے ایک اور بزرگ چاچا خدا بخش یاد آ رہے ہیں جو آپ کی برادری سے تھے، مجھے وہ ہمیشہ باوقار لگے انہوں نے قصاب کا پیشہ اختیار نہ کیا، وہ ہمارے مزارعے تھے، ان کی بیٹوں کو ہم اپنا بھائی کہتے ہیں اور ان کے پوتے ہمیں اپنا چچا کہتے ہیں۔ ان کے پڑپوتے اور پڑپوتیاں مجھے جیل میں ملنے آئے تھے انہوں نے میری جدوجہد پر نظمیں لکھ کر خراج تحسین پیش کیا مجھے چھوٹے چھوٹے بچوں کی یہ کوشش اچھی لگی ملک خدا بخش کے بیٹے ملک دلدار نے بزرگوں کا پیشہ اپنایا پیر بخش اور محمد بخش نے چھوٹے موٹے کاروبار کیے ان کے پوتے ملک نواز نے کپڑے کی دکان کھول لی ان کے دیگر رشتہ دار غفور اور حاجی عبدالرحمان معمولی کاروبار کر کے زندگی بسر کر رہے ہیں میں ان کی زندگیوں میں خوشحالی کے رنگ دیکھنا چاہتا ہوں اور یہ بھی چاہتا ہوں کہ معاشرہ ان کی محنت اور ہمت کو تسلیم کر کے ان کا احترام کرے مگر فیوڈل ڈھانچے میں یہ کیسے ممکن ہے؟

چاچا خیرن! تعلیمی اداروں کے بڑھ جانے کا کوئی فائدہ ہوا نہ ہسپتالوں کا، صدیوں کی محنت مزدوری کو فیوڈل ڈھانچے نے صدیوں کی بھوک دی ہے۔ زمیندارہ نظام میں انسانیت کے احترام کا کوئی خانہ ہی نہیں ہے۔ یہاں سب کی ہیں جو صرف ایک طبقے کی خدمت کیلئے پیدا ہوئے ہیں، یہ غلام بنانے کا مہذب طریقہ ہے۔ وہ غلامی جو افریقہ، امریکہ اور یورپ میں پہلے تھی، مشرق وسطی میں آج بھی ہے وسطی ایشیاء ہندوستان میں اس طرح کی غلامی کا کوئی تصور نہیں رہا، یہاں تو افراد کی بجائے پورے ملک کو صدیوں تک غلام

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بنا کے رکھا جاتا تھا۔ انفرادی آزادی کو جکڑنے کیلئے ذات پات کا نظام آج تک مسلّط ہے۔ کئی نسلیں ہزاروں سال سے خدمت کیلئے پیدا ہو رہی ہیں اور کئی نسلیں ہزاروں سال سے کمزوروں سے خدمت کرا رہی ہیں دونوں طبقوں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھا دی گئی ہے کہ وہ پیدائشی طور ہی ایسی قسمت لے کے آئے ہیں۔ اِس ظالم نظام کی جڑیں بہت گہری ہیں ان جڑوں کو کھود کر باہر نکالنے کیلئے تیشۂ فرہاد کی ضرورت ہے، تیشۂ فرہاد ہی دودھ کی نہر بہا سکتا ہے، ایسی نہر جو صدیوں کے پیاسوں کی پیاس بجھا سکے یہ نہر کھودنے کیلئے جان کا نذرانہ پیش کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایسی نہر ہو جو پرویز کے محل تک جا کر ختم نہ ہو۔ اور نہر بہانے والے اپنے تیشے سے ہی اپنا سر نہ پھوڑ بیٹھیں۔ تاریخ ہمیشہ اپنے آپکو دہراتی ہے لیکن تاریخ رقم کرنے والے بھی آخر انسان ہی ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ تاریخ سیاہی سے لکھتے ہیں اور کچھ اپنے خونِ جگر سے۔ تاریخ لکھنے والوں کے نام بھی موجود رہتے ہیں اور تاریخ بنانے والوں کے بھی، اِس مرتبہ تاریخ کو نیا رُخ دینے کیلئے بالا و پست کا فرق مٹا کر دیکھیں اور دیکھیں کہ اِس کے نتائج کیا نکلتے ہیں؟

خدا حافظ!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سچائی کے بیج

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

جناب غلام محمد "ایم گاماں" صاحب!

السلام علیکم!

محترمہ فاطمہ جناح، نوابزادہ لیاقت علی خاں نے آپ کے جذبات عشق کی حدوں کو چھو رہے تھے اور جنرل اعظم خان بھی آپ کے پسندیدہ ترین شخصیت تھے۔ گاؤں والے ایک ناخواندہ فرد کی اس جسارت کو پاگل پن کہہ کر آپکا مذاق اُڑاتے، جب بھی کسی اخبار میں محترمہ فاطمہ جناح، لیاقت علی خاں یا اعظم کا نام آتا تھا، آپ کو فوراً پتہ چل جاتا۔ آپ الف ب بھی نہیں پڑھ سکتے تھے، آپ یہ خبریں کیسے سونگھ لیتے تھے؟ کیا آپ کو محترمہ کے نام کے لفظوں میں خوشبو محسوس ہوتی تھی؟ جو بھی پڑھا لکھا شخص آپ کے ہاتھ لگ جاتا آپ اُس کے دروازے پر پہنچ جاتے اور اس تحریر کو اپنی کاپی میں درج کرا کر دم لیتے، کاپی اور پنسل کیلئے پیسے کہاں سے آتے تھے کیونکہ آپکا کوئی ذریعہ معاش تو تھا ہی نہیں اور پھر یہ بھی عجیب بات تھی کہ کوئی پانچ سال پرانا قصہ بھی پوچھتا تو آپ بڑے آرام سے کاپی کے اُسی صفحے پر ہاتھ رکھ کر کہتے تھے کہ یہاں دیکھئے یہیں کہیں درج تھا۔ آپکا اندازہ سو فیصد دُرست ثابت ہوتا، آپ کی ریکارڈر رکھنے کی عادت سے بہت لوگ تنگ آئے ہوئے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ آپ صبح سویرے اُن کے دروازے پر کھڑے ہوں اور بے معنی باتیں کاپی میں لکھنے کیلئے کہہ رہے ہوں۔ میں نے رضاکارانہ طور پر آپ کا منشی ہونے کا اعلان کر دیا تھا اور آپ نے اس حق کو ہمیشہ وقت بے وقت خُوب استعمال کیا۔ جب بھی آپکو کسی اخبار کا کوئی چھوٹا سا ٹکڑا ملتا جس میں مادرِ ملت یا آپکی دیگر پسندیدہ شخصیات کا ذکر ہوتا۔ آپ صبح سویرے ڈیوڑھی پر آ کر بیٹھ جاتے اور پیغام بھجواتے آ کر اپنی ڈیوٹی ادا کریں۔

آپکو اپنے بھائی فیض بخش اور بھتیجے فقیر محمد سے، جو میرا بھائی بنا ہوا ہے، سخت شکایت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تھی۔ کہ وہ آپکی شادی کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہیں۔ آپکی عمر اس وقت پچاس سال سے اوپر ہو چکی تھی مگر آپ کی خواہش تھی کہ آپ کے گھر میں بیوی ہو جو آپ کے لئے اور آپ کے مہمانوں کیلیے روٹی پکاتی نظر آئے۔ آپ نے شادی کیلیے سارا سامان جمع کر رکھا تھا۔ برتن، زیور وغیرہ ہر ایک کو گھر بلا کر دکھاتے تھے کہ میں نے یہ سارا اہتمام کیا ہوا ہے لیکن میرا بھائی دلچسپی لینے کو تیار نہیں۔ گاؤں والے آپ کو چھیڑ کر آپ سے لمبی داستانیں سنتے اور مزا لیتے تھے۔ ایم گاماں صاحب آپکا یہ اصرار تھا کہ آپ کو ایم گاماں ہی کہا جائے اور میں آپکو ایم گاماں ہی لکھ رہا ہوں کیونکہ میں اب تک اپنے آپ کو آپ کا منشی سمجھتا ہوں۔ میں آپ کی وفات کے بعد بھی اس عہدے سے ریٹائر نہیں ہونا چاہتا کیونکہ ریٹائرمنٹ ہمارے قومی مزاج کے خلاف ہے۔ میری وفاداری دیکھیے کہ میں مر کر بھی یہ عہدہ نہیں چھوڑنا چاہتا میں ایم این اے بھی رہنا چاہتا ہوں اور منشی بھی میرے دونوں عہدے رکھنے سے کون سا آئین ٹوٹ جائے گا؟ اگر ملکہ برطانیہ کا دور ہوتا تو وہ میری وفاداری کی قدر کرتیں۔ انہوں نے اس دھرتی کے چپڑاسیوں، اردلیوں اور منشیوں کو اتنا نوازا کہ ان کی اولادیں آج تک ہم پر حکمرانی کر رہی ہیں۔ آپ نے وہ گانا تو ضرور سنا ہو گا، جس میں محبت کی انتہا بیان کی گئی ہے۔ وہ کچھ یوں ہے کہ

زندگی میں تو سبھی پیار کیا کرتے ہیں
میں تو مر کر بھی مری جان تجھے چاہوں گا

میری بات کا یقین کریں، میں عہدے کی محبت میں ہرگز مبتلا نہیں ہوں

تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

یہ تو جملہ معترضہ تھا آپ یہ بتائیں کہ آپکے ذہن میں یہ بات کہاں سے گھس گئی کہ محترمہ فاطمہ جناح کی جنگ، جمہوریت کی جنگ تھی، پاکستان کو بچانے کی جنگ تھی، قائداعظم کی بہن حق پر تھی اور ایوب خان غاصب اور ڈکٹیٹر تھے۔ آپکا کیا تعلق تھا ان چیزوں سے؟ آپ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک کچی کوٹھڑی میں رہتے تھے۔ جسکی چھت معمولی بارش سے ٹپکتی رہتی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آتی آپ ایسی جگہ پر کیسے پیدا ہو گئے جہاں پر حکومتوں کیخلاف حرفِ اختلاف کی روایت ہی نہیں تھی۔ آپکی کاپی، آپکی پنسل کیا چیز تھی یہ؟ میں سوچ رہا ہوں، آپ کیوں ہر وقت محترمہ فاطمہ جناح کا ذکر کرتے تھے، نہ آپکا تعلق کتابوں سے تھا نہ شہر داروں سے......... پتہ نہیں آپ کیسی باتیں کرتے رہتے تھے، آپ پر یہ کیا جنون طاری تھا؟ مادرِ ملت، مادرِ ملت، مادرِ ملت۔ آم کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر سوچ رہا ہوں کہ جتنی شدت سے آپ نے محترمہ فاطمہ جناح کا نام لیا تھا اس کی وجہ سے میرے اندر بھی مادرِ ملت سے اُنسیت پیدا ہوئی تھی، لگتا ہے آپکا یہ پاگل پن اب میرے اندر منتقل ہو گیا ہے۔

آخری عمر میں جب آپ بیماری میں گھرے ہوئے تھے رینگتے ہوئے دروازوں پر آکر بیٹھتے تھے، آپ دوا کیلئے پیسے مانگنے کی بجائے کاپی نکالتے پنسل آگے کرتے اور چاہتے تھے کہ اُس دن کے ہر اہم واقعہ کو ضبطِ تحریر میں لایا جائے۔ مجھے یاد ہے جب آپکے کانپتے ہاتھوں سے کاپی گر پڑی تو آپ نے میری طرف بے بسی سے دیکھا اور کہا! مخدوم صاحب شاید میری یہ آپ سے آخری ملاقات ہے اور اسکے بعد ایم گاماں تم مر گئے۔ میں تو تمہارے جنازے میں بھی شریک نہ ہو سکا۔ آج بیٹھا ہوا تمہارے بارے میں سوچ رہا ہوں، تمہارا شکر گذار ہوں کہ اگر تمہارا جنون نہ ہوتا اور تم محترمہ فاطمہ جناح کا نام اِس طرح نہ لیتے تو مجھے جمہوریت کے معنی سمجھنے میں مزید کئی سال لگتے۔ تم میرے گاؤں کے ایسے دانشور تھے جو حرف سے ناآشنا تھے۔ سچائیوں کے اظہار کیلئے لغت ہائے حجازی کا قارون ہونا ضروری تو نہیں۔ تمہیں جہاں سچائی ملتی۔ تم فوراً اسے تاریخ کا حصہ بنانا چاہتے تھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ تم سچائی کے محافظ تھے۔ تم ایک دن کیلئے بھی حکمرانوں سے متاثر نہیں ہوئے۔ مجھے تو ایوب خان کے باپ اور دادا کا شجرہ بھی آپ نے بتایا تھا۔ ہر آدمی آپ کو بھولا سمجھتا تھا لیکن آپ کتنے دانا تھے۔ آپ بنیاد کو سمجھتے تھے، لوگ شاخوں کی طرف بھاگتے ہیں۔ بنیادی کام آپ نے کر دیا۔ محترمہ فاطمہ جناح کی وہ تمکنت، وہ وقار جو میں نے رانا عبدالوحید کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بیٹھک کی تصویر میں دیکھا تھا تمہاری باتوں سے سمجھا تھا۔ گاؤں کے کسی بڑے زمیندار کے ہاں اس کا کوئی وجود نہ تھا، وہ تو ایوب خان کے گن گا رہے تھے، مفادات کی دنیا میں مگن تھے، تم ایسے درویش تھے جو معاشرے میں سچائی کے بیج بو کر اس طرح غائب ہو جاتا ہے جیسے اس کا وجود کبھی تھا ہی نہیں۔ سچائی کا بیج اب شجرِ سایہ دار بن چکا ہے اور اِس سے تمہارے وجود کی خوش بو آ رہی ہے۔ آپ جیسے لوگ مر جائیں تو معاشرے بانجھ ہو جاتے ہیں، آپ جیسے لوگ کسی نہ کسی شکل میں زندہ رہتے ہیں، سچائی کی فصل تیار ہو چکی ہے۔

والسلام!

آپکا مخلص!

جاوید ہاشمی!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نقارے پر چوٹ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

برادرم اللہ ڈیوایا "مراثی" صاحب!

السلام علیکم!

حالات کی دھندلی سی تصویر میرے ذہن میں موجود ہے کہ آپکے والد اللہ بخش جب مرنے لگےتو انھوں نے میرے والد محترم سے ملنے کی خواہش کی، اُنکی آخری خواہش کے احترام میں میرے والد انھیں ملنے گئےتو آپکے والد نے آپکے بھائی فیض بخش اور آپکا ہاتھ انکے ہاتھ میں دے دیا، آپکی دونوں بہنیں بھی موجود تھیں۔ کہنے لگے کہ میں انھیں آپکے سپرد کر کے جارہا ہوں۔اِس کے بعد اُنھوں نے آخری ہچکی لی اور ملک عدم کی طرف روانہ ہو گئے۔آپ نے اپنا خاندانی پیشہ اختیار کیا اور اسی کو اپنا روزی روٹی کا ذریعہ بنایا،آپ ہر شادی غمی کا حصہ ہوتے ،جب آپ ڈھول بجاتے تھےتو اِس میں کوئی خاص ردھم نہیں ہوتا تھا،آپ نے نہ اسے کسی سے سیکھا نہ آپ کو بجانے کا سلیقہ آیا،اسے آپ گلے میں پڑا ہوا ڈھول سمجھ کر بجائے جارہے تھے،توتی کی آواز سے لگتا جیسے آپ پر تشدد کیا جارہا ہو مگر اِس میں درد کی رمق موجود ہوتی تھی ،تمہاری زندگی پھٹے ڈھول کی طرح تھی اور زندگی کا ساز بے آواز تھا۔آپ کے بھائی فیض بخش نے گھوڑوں کو سدھانا شروع کیا،وہ سائس بن گیا اور فیض بخش سوار کہلانے لگا،اِس نے ہمارے گھوڑوں کو دلکی اور رقص کی تربیت دی۔ جب وہ سونے اور چاندی سے لدے پھندے پر گھوڑے پر کلف لگی پگڑی باندھ کر بیٹھتا تو توتی اور ڈھول کی تھاپ پر گھوڑوں کے رقص سے ایک سماں بندھ جاتا،فیض بخش کے فن کو داد دینے کے لئے نوٹوں کی بارش ہونے لگتی،فیض بخش کے چہرے پر بھی مسکراہٹ رقص کرنے لگتی۔فیض بخش زیادہ عرصہ زندہ نہ رہا اور اپنی بیوی بھراواں اور بچوں کو بے یارو مددگار چھوڑ کر اس دنیا سے منہ موڑ گیا۔

آپکا اُٹھنا بیٹھنا گاؤں کے اُن لوگوں کے ساتھ تھا جو گاؤں کے زمینداروں کی زیادتیوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے خلاف خفیہ میٹنگز کرتے، اِسی لئے زمیندار طبقہ آپ کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ ماحول درباری تھا، مگر آپ کو" درباری راگ" نہیں آتا تھا، نہ ہی آپ" راگ ایمن" سے واقف تھے اور نہ " مالکونس" سے" بہار اور ملہار" گانا بھی آپ کے بس کی بات نہ تھی، " بھیرویں اور راگ جوگ" سے آپکا واسطہ نہ تھا، آپ میدان میں رہنے والے تھے۔ " پہاڑی راگ اور تلنگ راگ" سے آپکی جان پہچان ہو ہی نہیں سکتی تھی۔" راگ جوگ" البتہ آپ کے مزاج کے قریب تھا، لیکن اُس میں بھی آپ دسترس حاصل نہ کر سکے۔ البتہ "راگ دکھشنی ، راگ جے جے ونتی اور باگشیری" میں آپ تکا بازی کر لیتے تھے، آپ کی برادری کے لوگ آپ کا مذاق اُڑاتے تھے، ویسے بھی آپ ہر ایک کے مذاق کا نشانہ بنتے رہتے تھے۔

آپ کو بخوبی یاد ہو گا ملک کے مایہ ناز گلوکار شہنشاہ غزل مہدی حسن جب بھی مخدوم رشید میں اپنے سسرال والوں کے پاس آتے تو مجھے بھی اکثر ملنے آجاتے تھے۔ وہ شام تم بھولنا بھی چاہو تو نہیں بھول سکتے، جب مہدی حسن مجھے ملنے آئے ہوئے تھے۔ انہیں کراچی جانے کے لئے ملتان ایئرپورٹ پہنچنا تھا۔ اتفاق سے میرا ڈرائیور چھٹی پر تھا۔ میں نے اپنے دوست چوہدری اقبال گجر سے درخواست کی کہ وہ مہدی حسن کو اپنی کار پر ملتان چھوڑ آئیں۔ تم اس واقعے کے چشم دید گواہ ہو، چوہدری صاحب نے اسے اپنی توہین سمجھا کہ ایک زمیندار تمہاری برادری کے فرد کا ڈرائیور بنے۔ مہدی حسن کی پرواز چھوٹ جانے کا خطرہ تھا میں ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھنے لگا تو چوہدری صاحب کو اور بھی برا لگا۔ انہوں نے بادل نخواستہ خان صاحب کو کار میں بٹھالیا، وہ تو شکر ہے مہدی حسن کی ٹیکسی بروقت پہنچ گئی، ورنہ چوہدری صاحب نے ساری عمر مجھے کوستے رہنا تھا۔

اللہ ڈیوایا صاحب تم مہدی حسن تو کبھی نہیں بن سکتے بلکہ اس فن کے قریب بھی نہیں جا سکتے۔ جس معاشرے میں ذات پات کی وجہ سے اس شخص کے لئے احترام نہیں جس کے بارے میں کہا گیا کہ اس کے گلے میں بھگوان بولتا ہے تو تمہاری کیا حیثیت؟

مخدوم رشید کے غریبوں کی بغاوت کی تاریخ روس کے انقلاب اور کمیونزم کی آمد سے پرانی ہے۔ گاؤں کے ہندو اور کمی دونوں زمیندار طبقے کی رعایا سمجھے جاتے تھے، انہوں نے مل

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کر 1906ء اور 1918ء کے درمیان عدالتوں میں اپنے حقوق کی جنگ لڑی، اس جنگ میں مذہبی تفریق نہیں تھی۔ اگرچہ زمینداروں کو بالادستی حاصل ہوئی مگر اس جنگ کی چنگاری دَب نہ سکی بلکہ عرصہ دراز تک سلگتی رہی۔ رِزق کی مار بہت سخت ہوتی ہے، آپ کو زندگی زمینداروں کے ٹکڑوں پر گذارنا تھی اور آپ کی اولاد کو بھی۔ میں آپ لوگوں کی جدوجہد کو دیکھتا رہتا تھا، میری دلی ہمدردیاں آپ کے ساتھ تھیں۔

آپ کے رشتہ داروں میں سے قادر بخش اور میں میٹرک تک اکٹھے تھے۔ میں نے اُسے بھائی کا درجہ دیا ہوا تھا، قادر بخش اپنے رنگ اور اپنے ناک نقشے سے بالکل افریقہ کا رہنے والا لگتا ہے اور سچی بات یہی ہے کہ پاک و ہند کے اصل حکمران آپ لوگ ہیں۔ حالات کی ستم ظریفی دیکھیے کہ آپ بالکل اجنبی لگتے ہیں اور ہم باہر سے آئے ہوئے، اس سرزمین پاک و ہند کے مالک بن گئے۔ اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تخصیص نہیں، ہندوؤں میں بھی راجپوت ہوں یا براہمن، اکثریت باہر سے آئی اور آپ لوگوں کو اپنا غلام بنا کر اپنی خدمت کیلئے آپکی درجہ بندی کر دی۔ آپ صدیوں سے اس درجہ بندی کی دیواروں میں قید ہیں، جن کو توڑنے کی آپ سرتوڑ کوشش کرتے ہیں، مگر صدیوں کا بنا ہوا جال پھر آپ کو شکار کر لیتا ہے۔ اس جال کا ہر سوراخ مکر و فریب کی چالوں سے بُنا گیا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کی پسماندگی کا سبب یہی ذات پات کا نظام ہے۔

آپکے بیٹے محمد نواز نے میرے والد محترم کی آخری دنوں میں بہت خدمت کی اور یہ منظر بھی عجیب تھا کہ جب ہم ہیلی کاپٹر میں والد محترم کو اسلام آباد سے ملتان لا رہے تھے، ان کی زندگی کی چند ساعتیں باقی تھیں، انہوں نے آپکے بیٹے محمد نواز کا سر اپنے سینے پر رکھا اور اس کو بھرپور پیار کیا، کافی دیر تک اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے رہے۔ والد صاحب کے اندر کروٹ لینے کی سکت نہیں تھی، وہ آنکھوں سے نواز کی خدمات کی ستائش کر رہے تھے، ان کی آنکھوں میں ہمدردی اور تشکر کا جذبہ تھا۔ مجھے وہ منظر یاد آ گیا جب آپ کے والد صاحب نے سفر آخرت کے وقت آپ کے تمام بھائیوں بہنوں کے ہاتھ میرے والد صاحب کے ہاتھ میں دے کر آنکھیں موند لیں تھیں۔ ایک نسل سے دوسری نسل کا سفر شروع ہو گیا،

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جکڑ بندیوں کا جال اسی طریقے سے قائم ہے، تمہارے بچوں کے بچے اب ہمارے بچوں کے بچوں کی خدمت پر مامور ہو چکے ہیں۔ خلیج گہری ہوتی جا رہی ہے، ندی کے دو کنارے، دو انسانی طبقے، کبھی نہ ملنے کیلئے، ایکدوسرے کیساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ یہ صدیوں کا سفر ہے، ایک طرف بالا دستی ہے اور آسائشات ہیں، حکم دینے کی طاقت ہے، دوسری طرف بھوک کی آگ ہے، محکومیت کا طوق ہے اور محنت جسم و جان کا خون۔

اس دن تم کتنے خوش تھے جب تمہاری زندگی میں ایک معجزہ رونما ہوا تھا، تمہاری اس خوشی کا تو میں ذکر کرنا ہی بھول گیا جب تمہارے بیٹے آصف نے ایم اے کر کے پورے گاؤں کو حیران کر دیا تھا تمہاری بیوی اور تمہاری بیٹی اس دن ہمارے گھر میں آکر ہر ایک کو مبارک باد دے رہی تھیں'' سائیں! آپ کے غلام نے سولہ جماعتیں پاس کر لی ہیں''۔ سولہ جماعتیں آصف کی غلامی کی زنجیریں نہ کاٹ سکیں اس کی ماں، بھرجائی جندن اور بہن بخشو اسی طرح ہمارے گھر کے کام میں جتی ہوئی ہیں بڑی مشکلوں سے آصف ویکسی نیٹر ہو گیا ہر وقت شرم و حیا میں ڈوبا رہتا ہے اس کی کمائی سے تمہارے بیٹے نواز کی کمائی زیادہ ہے حالانکہ وہ بھی ٹھری اور دادرے کے علم سے بے بہرہ ہے کہتا ہے سائیں آصف کی پڑھائی کا کیا فائدہ اس سے تو میں اچھا ہوں۔

میں خط لکھنے بیٹھا تو مجھے معلوم نہ تھا آپ ہسپتال میں زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہے ہیں، آج گاؤں سے آنیوالوں نے بتایا کہ موت نے یہ جنگ جیت لی ہے اور آپکے کوچ کا نقارہ بج گیا ہے، میں ہنس دیا، موت بھی مرے ہوؤں کو مارنے میں عجلت دکھاتی ہے۔ اللہ ڈیوایا تم تو پیدا ہوتے ہی مر گئے تھے تمہارے مقدر میں بار بار مرنا کیوں لکھا گیا۔

اب یقیناً تمہارے بیٹوں نے دربار شریف کے دروازے پر نوبت بجانے کا کام سنبھال لیا ہوگا، جس کو سننے کے لئے میرے کان ترس رہے ہیں۔ جب تمہارے بیٹے نقارے پر چوٹ لگاتے ہوں گے تو کانوں میں امرت رس گھلتا ہوگا۔ تمہاری موت پر بھی میں اپنی محرومیوں کا ماتم کرنے لگا ہوں، تمہاری زندگی اور موت کا ذکر تو بس زیب داستان کے لئے تھا۔

خدا حافظ! آپکا مخلص جاوید ہاشمی!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

غلاموں سے بڑھ کر غلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

برادرم محترم محمد رمضان رمضٰی صاحب!

السّلام علیکم!

تمہارے ساتھ دُکھ سُکھ بانٹنے کو جی چاہ رہا ہے۔ تم مجھ سے دو سال بڑے تھے، تم نے بطورِ یتیم زندگی کے سفر کا آغاز کیا اور یہ عجیب سفر محلّہ "صدر آٹا" سے شروع ہوا، جہاں پر آپ اور آپ کے خاندان کے پندرہ بیس گھر تھے۔ ہمیں بتایا یہی گیا کہ آپ کے دادا یا پر دادا کے کنبے کے لوگوں نے اسلام قبول کرلیا تھا، اس لئے آپکو مسلم شیخ کہا جانے لگا۔ آپ کا تعلق ہندوستان کی قدیمی نسلوں دراوڑ اور بھیلوں سے تھا، جو ہندوستان کے اصل باشندے ہیں۔ یہ لوگ صدیوں تک اس سرزمین پر حکمران تھے، آہستہ آہستہ آنیوالوں نے اُنکا اقتدار چھینا، امریکہ میں (Red Indian) ریڈ انڈین موجود ہیں، آپ لوگ (Black Indian) بلیک انڈین کہلا سکتے ہیں۔ ہندوؤں نے آپ کو مذہبی درجہ بندی میں شودر کا مقام دے کر "اَن ٹچ ایبل" (Un-Touchable) قرار دے دیا۔ آپ کسی ہندو کو ہاتھ لگاتے تو وہ پلید ہو جاتا، آپکا سایہ کسی پر پڑ جاتا تو اُس ہندو کو پاک ہونے کیلئے غسل کرنا پڑتا تھا۔ اعلیٰ نسل کے ہندوؤں کی غلامی آپ پر لازم تھی، صدیوں کا یہی بوجھ آپ کے پیدا ہونے سے پہلے آپکا منتظر تھا۔ آپ مسلمان ہو گئے تو بھی اس بیماری سے افاقہ نہ ہوا، یہ وہ گھڑی تھی جس میں تضحیک اور توہین (Insult) کے سوا کچھ نہ تھا۔ اب تک آپ اور دوسرے مسلمان ایک برتن میں نہیں کھا سکتے۔ بچپن سے ہی آپ نے محنت مزدوری کا کام شروع کیا۔ ہماری گائیں، بھینسوں کی رکھوالی کے لئے آپکو بھرتی کرلیا گیا۔ مجھے یہ بات سمجھ نہیں آتی تھی کہ آپ بھی انسان ہیں، ہم بھی انسان ہیں، پھر کیوں ہر بات پہ آپ کو حقارت سے دیکھا جاتا ہے۔ ایک دِن میں نے یہ اعلان کر دیا کہ میں نے رمضٰی کو اپنا بھائی بنا لیا ہے۔ میرے اِس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اعلان سے آپکی زندگی میں کوئی بہتری نہیں آئی۔اب تو آپ زندگی کے آخری حصے میں ہیں یہ دردناک سفر بھی ختم ہونے والا ہے۔مگر آپ وہیں کھڑے ہیں جہاں سے یہ سفر شروع ہوا تھا۔آپکا بھائی غلام سرور جو ہمارے کھیتوں میں کام کرتا تھا۔اندھا ہو گیا تھا۔آپ کے بھائی الٰہی بخش نے بھی ساری عمر ہمارے فارم پر کام کرتے گزار دی،آپ کا سب سے بڑا بھائی غلام رسول بھی محنت مزدوری کرتا رہا۔آپ کی نوجوان نسلیں اور اولادیں بھی اسی طرح دھکے کھا رہی ہیں جس طرح عمر بھر تم نے دھکے کھائے۔تمہارے بھتیجے قادر بخش نے قرآن مجید حفظ کر لیا تھا یہ تمہارے خاندان کے لئے اعزاز کی بات تھی بیس پچیس سال سے اسے کسی مسجد میں مستقل امامت کا اہل نہیں سمجھا گیا وہ کبھی ایک مسجد میں ہوتا ہے اور کبھی دوسری مسجد میں قصبے کے برہمن اس کے حفظ کو بھی وہ تکریم دینے کو تیار نہیں جو خدا اور خدا کا رسول کسی کو دیتے ہیں اسلام کی یہ درجہ بندی نہ قرآن میں ہے اور نہ حدیث میں۔جب ذات پات کی بات ہو تو ہم اسلام کو بھی اپنی مرضی کے مطابق چلانا چاہتے ہیں۔برصغیر میں غلاموں سے بڑھ کر غلاموں کا نظام اتنی شدت سے مسلط ہے کہ اسلام بھی اُسکے سامنے بے بس ہو گیا، تمہیں انسان تسلیم کرنے کا جو درس پیغمبر اسلام نے دیا تھا وہ بھی رد کر دیا گیا۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم سب سے بڑے مسلمان ہیں اور اسلام کا نظام ساری دنیا میں قائم کرنا چاہتے ہیں۔جو نظام ہم مخدوم رشید میں قائم کرنے کیلئے تیار نہیں وہ پوری دنیا میں کیسے قائم کرینگے؟اسلام تو اپنے وقت کے غلاموں کو پیغمبر کے خاندان میں بطور رشتہ دار قبول کرتا ہے، غلاموں کو سپہ سالاری کا حق دے کر قبیلہ قریش کے سرداروں کو اُن کے زیر نگیں کر دیتا ہے۔اسلام کا پیغام ابھی تک مخدوم رشید کیوں نہیں پہنچ سکا۔یہی کہانی پوری قوم کی ہے، ہر شہر کی ہے۔میں جو باتیں کر رہا ہوں رمضی بھائی تم انہیں سمجھ سکتے ہو۔تمہیں محترمہ فاطمہ جناح کا پورا نام بھی نہیں آتا تھا،تم کبھی انہیں فاطمہ جانا کہتے تھے کبھی فاطمہ جینا کہتے تھے مگر جب تم مجھ سے یہ سوال کرتے کہ قوم نے قائداعظم کی بہن کو کیوں شکست دی تو میں لاجواب ہو جاتا تھا میں کہتا تمہیں یہ باتیں کرنی کہاں سے آ گئی ہیں؟تمہارے طبقوں کو پیدا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوتے ہی سیاسی معاملات سے لاتعلق کر دیا جاتا ہے، تمہیں تو ریاستی معاملات کے بارے میں جاننے کا حق ہی نہیں، تمہارے کانوں میں اگر ایسی باتیں آئیں تو اِن میں پگھلا سیسہ ڈال دیا جاتا تھا کیونکہ رموزِ حکومت ''خسرواں دانند'' سچی بات یہ ہے کہ سیسہ ڈالنے کا یہ عمل آج بھی جاری ہے مگر اب یہ کام کرنے کیلئے جدید طریقے اختیار کئے گئے ہیں۔

تمہیں صرف اپنے پیٹ کی بھوک کی آواز سنائی دیتی ہے اور اس کو بھرنے کا ایندھن تلاش کرتے ہوئے پوری زندگی گزار دیتے ہو۔ تمہیں پیٹ کے دھندے سے نکلنے کا کوئی راستہ ہی نہیں دکھایا جاتا، تمہاری سوچوں کو پیدا ہوتے ہی مصلوب کر دیا جاتا ہے۔ میں تمہیں ایک دفعہ لاہور لے آیا تھا تاکہ تم مزدوری کر کے اپنے بچوں کیلئے کچھ بھیج سکو، میں نے کوشش کی تھی تمہیں اچھا کھانا ملے، اچھی رہائش ملے۔ مگر تمہیں ہر وقت اپنی بیوی بچوں کی یاد ستاتی تھی، وہی بچے جواب بڑے ہو کر در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں، بیماریوں میں جکڑے ہوئے ہیں، تمہاری محبت اُنکے کس کام کی؟ جب تک معاشرہ اپنے لئے ایسا نظام تشکیل نہیں دے دیتا، جس میں پیدا ہونے والے ہر بچے کیلئے معاشی تحفظ موجود ہو، محبت احترام اور یگانگت کے جذبات کی فراوانی ہو، حکومت کا مطلب خدمت ہو، اُس وقت تک اکیلے رمضی کی محبت نہ اپنے بچوں کو متوازن بنا سکتی ہے اور نہ معاشرے کو۔ گاؤں کی محبت نے تمہیں ترقی کیوں نہیں کرنے دی، یہ کیسی محبت ہے جو ترقی کے راستے میں کھڑی ہو جاتی ہے۔ اب میں بھی تمہاری طرح سوچنے لگا ہوں۔ مخدوم رشید مجھے اپنی طرف کھینچتا ہے، میرے دماغ میں ترقی اور محبت، ترقی اور بھوک، ترقی اور جاہلیت سارے الفاظ گڈمڈ ہو رہے ہیں، میں خود کو مزید کنفیوژ (Confuse) نہیں کرنا چاہتا، نہ تمہیں کچھ سمجھانے کی پوزیشن میں ہوں۔

برادرم رمضی صاحب اگلے روز میں ملاقات کے کمرے میں گیا تو بارہ تیرہ سال کا ایک لڑکا گاؤں والوں کے ساتھ آیا ہوا تھا وہ بالکل تمہارا ہمزاد لگ رہا تھا میں نے اس کے بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا وہ تمہارا نواسہ ہے۔ اس کی شکل اور لباس کو دیکھ کر لگتا تھا کہ تمہارا بچپن لوٹ آیا ہے۔ میں نے اس سے تمہارے گھر کے حالات پوچھے اسے اپنے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ساتھ بٹھایا کچھ لوگ میرے لئے میکڈونلڈ سے برگر لائے تھے میں نے اسے بھی کھلائے وہ چپ چپ تھا ایک لفظ بھی نہیں بولا گاؤں والوں کے ساتھ واپس چلا گیا۔ تم ہر وقت بولتے رہتے تھے شاید تمہارا انجام دیکھ کر وہ سمجھتا ہے کہ خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔ بہر حال تمہیں اب خوش ہو جانا چاہیے کہ تم اب "برگر" فیملی بن گئے ہو کیا یہ ترقی کم ہے؟۔

خدا حافظ!

تمہارا بھائی!

جاوید ہاشمی!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھٹی کا ایندھن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

محترم چاچا محمد حسین "لوہار" صاحب!

السلام علیکم!

میں تمہاری بھٹی پہ آکے بیٹھ گیا ہوں، چشمِ تصور سے دیکھ رہا ہوں کہ حضرت داؤدؑ بھی بھٹی پر بیٹھے زرہیں اور تلواریں بنا رہے ہیں، وہ لوہا کوٹ رہے ہیں۔ اللہ نے اُنہیں نبوت عطا کی ہے اور لوہے کا علم بھی ودیعت فرمایا ہے۔ میں دیکھتا ہوں اب وہ بھٹی سے اُٹھ کر تختِ داؤد پر جا بیٹھے ہیں۔ علم سے انسانیت کو فیض پہنچا رہے ہیں۔ ایک اور لوہار اپنی دھونکنی پر کپڑا باندھ کر ایران کے بادشاہ ضحاک کے ظلم کیخلاف اعلانِ بغاوت کر رہا ہے یہی درفش کاویانی انقلاب کی علامت بن گئی ہے۔

رُوس کے انقلابیوں نے بھی اپنے پرچم پر درانتی اور ہتھوڑے کو ایک عرصہ تک سجائے رکھا اور تازہ خبر یہ ہے کہ ایران میں ایک لوہار کے بیٹے نے صدرِ مملکت بن کر امریکہ کو لوہے کے چنے چبانے پر مجبور کر دیا ہے۔

گرمیوں کی صبح ہے، جُون کا مہینہ، سورج طلوع ہوتے ہی آگ برسا رہا ہے اور تم نے بھی آگ سے کھیلنا شروع کر دیا ہے۔ تم بھٹی میں کوئلے جھونکتے ہو۔ تمہارا ایک بیٹا پنکھے کی ہتھی چلاتا ہے، تمہاری دھونکنی سے کوئلوں کو ہوا لگتی ہے تو وہ دہکنے لگتے ہیں۔ کوئلے انگارے بنتے ہیں تو تم اُن انگاروں کے درمیان لوہے کا ایک ٹکڑا رکھ دیتے ہو اور کچھ دیر بعد وہ بھی انگارے کی شکل اختیار کر لیتا ہے، تم اسے اٹھا کر لوہے کے مگدر (ہتھوڑا) سے اُس پر ضربیں لگانا شروع کر دیتے ہو۔ تمہارے سرخ و سپید چہرے سے پسینے کے شرارے چھوٹتے ہیں۔ ساتھ والی دکان پر تمہارا بھائی غلام نبی بھی یہی کام کر رہا ہے۔ اُسکا رنگ قدرے سانولا ہے، اسکے چہرے پر بھی پسینہ تیزی سے بہہ رہا ہے، تم دونوں نے اب اپنی داڑھیاں بھی بڑھالی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں اور اللہ سے تعلق قائم کرلیا ہے۔تمہارے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے اور تمہارے بھائی کے چہرے پر غصہ دھرا رہتا ہے۔تمہارے پاس لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے اور تمہارے بھائی کے پاس کوئی نہیں بیٹھتا۔تم خندہ پیشانی سے اپنے کام میں جتے ہوئے ہو اور وہ پیشانی پر سلوٹیں لئے ہوئے ہے، دونوں رزق حلال کی تگ و دو میں ہو۔اور پھر تمہارے بڑے بیٹے اللہ بخش نے بھی تمہارے ساتھ بیٹھ کر لوہا کوٹنا شروع کردیا ہے۔

تمہارے لوہے سے کسانوں کیلئے درانتیاں بن رہی ہیں، کھرپے اور میخیں بن رہی ہیں، زمین کھودنے کیلئے کسیاں بن رہی ہیں، ہل چلانے کیلئے پھالے بنائے جارہے ہیں، جو زمین کا سینہ چیر کر رزق اُگانے کے کام آتے ہیں۔تمہارا کام لوہے کو نرم کر کے موم بنانا ہے۔اس سارے کام میں تمہارا خون شامل ہے، تمہاری پسلیاں گرم لوہے کی حدت سے پگھل گئی ہیں تمہاری کمر میں خم آگیا ہے، تم نماز پڑھنے کیلئے جاتے ہو تو سیدھے ہو کر نہیں چل سکتے۔اب تمہاری بلغم میں خون آنا شروع ہوگیا ہے، دمہ کیوجہ سے سانس لینا بھی مشکل ہوگیا ہے، تمہارا چہرہ اب پیلا رہنے لگا ہے، تم صبح کی نماز میں موجود ہوتے تھے اور عشاء کی نماز میں بھی، جیل میں یہ خبر آگئی ہے کہ تم اب اِس دُنیا سے روانہ ہو گئے ہو۔تمہارا بیٹا احمد بخش جو میرے ساتھ دو تین کلاسوں تک جا سکا، کبھی ریڑھی پر پھل بیچتا ہے اور کبھی تمہاری دکان پر جا کر کام شروع کرنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن اس کے پاس اب کوئی گاہک نہیں ہے۔ہل چلانے کا کام ٹریکٹروں نے سنبھال لیا ہے۔تمہارے گاہک اب مشینوں کی ترقی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔پہلے بھی تمہاری مزدوری طے شدہ نہیں تھی۔سال کے بعد زمیندار اپنی مرضی سے جو کچھ تمہارے پلے میں ڈال دیتے تم خوشدلی سے لے لیتے۔

سُنا ہے تمہارا بیٹا اللہ بخش اب شہر چلا گیا ہے۔وہاں اسے کوئی خاص مزدوری نہیں ملی۔ احمد بخش تو زندگی کی چکی کے دونوں پاٹوں کے بیچ پس رہا ہے، اسکی آنکھیں بینائی سے محروم ہوتی جارہی ہیں، تم انہیں وراثت میں غربت اور افلاس کے سوا کچھ دے کر بھی تو نہیں گئے، یہی وراثت تم نے اپنے والد سے پائی تھی۔تمہارے بچے تعلیم سے کوسوں دور تھے۔اب

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تمہارے بچوں کے بچے بھی سکول سے نا آشنا ہیں اور معاشرے کی بھٹی کا ایندھن بننے کیلئے تیار ہو چکے ہیں۔ اُنکا جسم انگارے کی طرح جل اٹھا ہے اور یہ انگارہ بجھ کر راکھ بننا چاہتا ہے، اپنی دھرتی کی اسی راکھ کا حصہ جس نے اسے جنم دیا تھا۔ اس راکھ کو کریدنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں، مگر میں نہ جانے کیوں اس راکھ کو بار بار کرید رہا ہوں۔ عجیب بات یہ ہے کہ میرے والد صاحب آپ کو بھی اپنا بھائی کہتے تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ غریب لوگوں سے پیار مجھے اپنی ماں کی طرف سے ملا۔ بندی خانہ میں بیٹھ کر سوچنا شروع کیا تو ہر فرد کے بارے میں عجیب انکشاف ہوا، کہ میرے والد محترم نے اُن تمام محنت کشوں کو جو اُن کی عمر کے تھے، اپنا بھائی کہا اور جو چھوٹی عمر کے تھے اُنہیں بیٹا بنالیا۔ یہ سارا ورثہ میرے والد نے میرے لئے چھوڑا ہے۔ اِس کی حفاظت کرنا چاہتا ہوں۔ جب آپکے بال بچوں بیٹوں، پوتوں کو اسی حالت میں دیکھتا ہوں، جس حالت میں آپکے والد اور دادا تھے۔ تو مضطرب ہو جاتا ہوں۔ درد کی ٹیسیں اُبھرتی ہیں۔ یہ بیماری نا قابل علاج نہیں اس کا علاج کیا جا سکتا۔ میں سمجھتا ہوں اگر کوئی چارہ گر مل جائے تو درد کی انجمن راحت کی محفل میں بدل سکتی ہے۔ اس چمن کے پھول مہک سکتے ہیں اور انگارے لوہے کو موم بنا سکتے ہیں! خدا حافظ!

آپکا مخلص

جاوید ہاشمی!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہم سب بھٹہ مزدور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

جناب خدا بخش "نک" صاحب!

السلام علیکم!

آپ کو اِس دُنیا سے رخصت ہوئے تیس سال سے زیادہ عرصہ گذر چکا۔ آپ ماموں ہدایت شاہ کے ملازم تھے اور ایک طاقتور مالک کی بھینسوں کی نگرانی کرنے کی وجہ سے آپ کا اردگرد کے غریبوں پر بہت رُعب اور دبدبہ تھا۔ آپ اس بات کو اپنی خوش قسمتی سمجھتے تھے۔ آپ کا اس طرح اِترانا ایک حد تک بجا بھی تھا۔ آپ کا ایک ہی بیٹا تھا۔ آپ کی بیوی اِس دنیا سے جا چکی تھی۔ بیٹے کو آپ نے ماں کا پیار بھی دیا اور باپ کا بھی۔ آپ کا یہ لاڈلا اللہ ڈیوایا جب بڑا ہوا تو اس نے اپنی آزاد دنیا پیدا کی۔ کسی ایک فرد کا ملازم ہونے کی بجائے اس نے آزاد پیشے کا انتخاب کیا۔ ان دنوں لوگ پکی دیواریں بنواتے تھے، اُس نے اِسی کو اپنا کسب معاش بنایا۔ جب اُس کی ہڈیاں اِس جان لیوا مشقت کو برداشت نہ کرسکیں تو اُس نے اپنے پیشے کو بدل لیا اور اب مٹی کی پکی اینٹیں بنانے لگا۔ اُس نے قبرستان کے درمیان اپنی کٹیا بنالی۔ یہ جھونپڑی شہر کے بڑے لوگوں کیلئے نا قابلِ برداشت تھی کیونکہ گاؤں کی زمین پر تمہارا کوئی حق نہ تھا۔ اِس جھونپڑی کو برقرار رکھنے کیلئے اُس نے رات دن ایک کر دیا۔ وہ بااثر زمینداروں کے پاس پہنچ جاتا ان کے چھوٹے موٹے کام کرتا اور وہ اُس کی مدد کرتے۔ اُسکی چھوٹی سی گستاخی جھونپڑی پر قہر بن کر گرسکتی تھی، اِسلئے وہ تمام ڈیروں کے طواف کرتا رہتا۔ کبھی بھولا بن کر، کبھی مسخرہ بن کر اِس جھونپڑی کا تحفظ کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ جب اُس کے بیٹے پیدا ہوئے تو اُس نے جھونپڑی کے گرد ایک پکی دیوار کھینچ لی اور اس طرح قبروں کے درمیان ایک نئی قبر بن گئی۔ اُس کے بچے بڑے ہوئے تو انھوں نے بھی پکی اینٹیں بنانا شروع کیں۔ لیکن اب پکی اینٹوں کا گاہک سوائے تازہ قبر بنانے والوں کے کوئی نہ تھا۔ اللہ ڈیوایا کے دونوں بیٹے بھٹہ مزدور بن گئے، گویا انہوں نے ترقی کا ایک اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

زینہ طے کرلیا، (بھٹوں کو چلانے والوں میں میرے عزیز، رشتہ دار اور اقربا بھی ہیں)۔ ہمارے گاؤں کے اردگرد پندرہ بیس پکی اینٹوں کے بھٹے ہیں جنکی چمنیوں سے نکلنے والا دھواں پورے علاقے کی ہوا کو مسموم کررہا ہے۔ وہاں پر کام کرنے والوں کی غلاموں کی طرح خرید وفروخت ہوتی ہے، غلاموں کی طرح یہ سلسلہ کئی نسلوں تک چلتا ہے۔ بیشمار خاندان بھٹے پر پیدا ہوتے ہیں اور وہیں کام کرتے کرتے مرجاتے ہیں۔ اِس غلامی میں اُن کی بہنیں، بیویاں، بیٹیاں، مائیں، بچیاں، خالائیں سب ان کیساتھ شریک ہوتی ہیں۔ وہ اپنے اخراجات کیلئے بھٹہ مالکان سے مزدوری پیشگی کے طور پر لیتے رہتے ہیں۔ پیٹ کی بھوک نہیں مرتی تو مزید پیشگی لے لیتے ہیں، مالکان کی بھی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ان سے زیادہ سے زیادہ پیشگی لے لیں۔ جب وہ مقروض ہوں تو محکوم اور مغلوب ہوجاتے ہیں۔ اِن مزدوروں میں سے اگر کسی کے اندر آزادی کی تڑپ بیدار ہوجائے تو دوسرے بھٹہ مالکان سے جاکر کہتا ہے کہ آپ میرے پیسے ادا کردیں، میں پہلے مالک سے آزاد ہونے کیلئے تیار ہوں۔ دوسرا مالک اِس بات کو قبول کرلیتا ہے اور ایک سے دوسرے آقا کی غلامی کا طوق گلے میں پڑجاتا ہے۔ آقاؤں کے طور طریقے ایک جیسے ہیں۔ نئے مالک کے ہاں زیادہ کڑی شرائط پر کام کرنا پڑتا ہے، مزدور کی بہو، بیٹیاں بھی بھٹہ مالکان کی ملکیت سمجھی جاتی ہیں۔ جب کوئی بھٹہ مزدور اس ملکیت پر اعتراض کرتا ہے تو اُسے تیسرے بھٹہ مالک کی غلامی میں جانا پڑتا ہے اور یہ سفر ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کا نہیں ہے بلکہ پورے ملک کے طول وعرض میں جاری رہتا ہے۔ بہت سارے جھگڑے مقدمات جو میرے سامنے پیش کیے جاتے تھے، اُن میں ایسے واقعات سامنے آتے تھے، جنھیں سن کر دِل دہل جاتا تھا۔ اگر بھٹہ مزدور بھاگ کر کوئٹہ چلا جائے تو غلامی اس کا پیچھا کرتی ہے۔ کبھی کوئٹہ، کبھی راولپنڈی، کبھی ملتان سے لاہور، کراچی تک دُور دراز علاقوں میں اُن کے سودے ہوتے ہیں۔ بھٹہ مالکان کے اصولوں کے مطابق نئے مالک کو بھٹہ مزدور کے تمام واجبات سابقہ مالک کو ادا کرنے پڑتے ہیں۔ زندگی میں بار ہا وہ نئے مالک کے نئے غلام ہوتے ہیں لیکن ہر نیا آقا پرانے آقا سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ اگر مزدور مرجائے تو اس کی اگلی نسل اس قرضے میں کام

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کرنے کی پابند ہوتی ہے۔ منڈیاں بکتی ہیں، غلام بیچے اور خریدے جاتے ہیں۔ اُنہیں اِردگرد کی دُنیا کے بارے میں کوئی تصور بھی نہیں ہوتا۔ جس طرح مقروض ملک اور مقروض قومیں امیر ملکوں کی یرغمال بنی ہوتی ہیں۔ ان کی کئی نسلیں قرضوں میں جکڑی ہوتی ہیں۔ میں سوچتا ہوں ہم بھی بھٹہ مزدوروں کی طرح ورلڈ بنک کے قرضے میں جکڑے جاتے ہیں، ورلڈ بنک کے قرضوں سے بچتے ہیں تو ایشیائی بنک کے قرضوں میں جکڑے جاتے ہیں، ایشین بنک کے قرضوں سے جان چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں تو مقامی منڈیوں کے ساہوکاروں کے غلام بن جاتے ہیں۔ ہم سب بھٹہ مزدور ہیں، ہماری کوئی عزت نہیں، ہماری کوئی غیرت نہیں، ہمارے مالک ہمیں اِس بات کی اجازت دینے کو تیار نہیں ہیں کہ ہم اپنی مرضی کا راستہ اختیار کریں یا اپنی مرضی کی معیشت کھڑی کریں یا اپنی مرضی کا طرزِ زندگی اختیار کریں یا اپنی مرضی کے حاکم چن سکیں۔ ہمارے حاکموں کی پوزیشن بھٹہ مالکان کے منشی جیسی ہوتی ہے جو بھٹہ کے اندر مزدوروں پر بادشاہت کر رہا ہوتا ہے۔ چار آنے زیادہ مزدوری دے کر ان کو اپنا محکوم بناتا ہے۔ اُن میں سے کچھ لوگوں پر نظرِ عنایت کر کے اپنی پارٹی بناتا ہے جو بھاگنے والے مزدوروں کی مخبریاں کرتے ہیں اور انہیں پکڑ وا دیتے ہیں وہ بیچارے بھٹہ مالکان کی جیلوں میں سڑتے رہتے ہیں۔ جو منشیوں کے ساتھ تعاون کرتے ہیں، منشی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں اور منشی کی خواہش پر اپنی تمام غیرت اور عزت قربان کرنے پر تیار رہتے ہیں۔ وہ بھٹے کے اندر برسرِ اقتدار پارٹی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ یہی منشی مالک کے ایک فون پر بھٹہ مزدوروں پر ظلم کے پہاڑ توڑتا ہے۔ بھٹہ مزدور اپنی آواز بلند نہیں کر سکتے نہ ان کی آواز کوئی سننے والا ہوتا ہے۔ ہم سب بھٹہ مزدور کی زندگی گذار رہے ہیں، خدا بخش! ہمارے بھٹہ مالکان سات سمندر پار بیٹھے ہم پر حکمرانی کر رہے ہیں۔

اگر ہم آقا کو بدلنے کی کوشش کریں تو پہلے سے سخت آقا آتا ہے۔ آقا کے بھیجے ہوئے منشی پہلے سے زیادہ سختی کرتے ہیں۔ ہم اپنی مرضی کا منشی لگانے کا تصور نہیں کر سکتے۔ ہم چاہیں کہ منشی تبدیل کروالیں تو یہ دیوانے کا خواب معلوم ہوتا ہے۔ یہ بھٹہ مزدور یورپ اور دیگر ترقی یافتہ ملکوں میں کیوں نہیں ہیں، وہ ترقی جو دوسرے ملکوں میں ہے اگر وہ ترقی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پاکستان میں ان بھٹہ مزدوروں تک پہنچ پاتی تو مٹی کو پکی اینٹوں میں ڈھالنے کیلئے مشینیں ہوتیں، انسانوں کی توقیر ہوتی۔ اگر بھٹہ مزدوروں کیلئے بھی معاش کے دوسرے طریقے موجود ہوتے تو وہ اِس غلامی پر رضامند نہ ہوتے۔

جو قومیں آزادی کی لطافتوں اور برکتوں سے آشنا ہو چکی ہیں وہ آزادی برقرار رکھنے کیلئے جانیں قربان کرنے کیلئے بھی تیار ہیں۔ مگر جو قومیں ایک منشی کی جکڑ بندی میں کولہو کے بیل کی طرح آنکھوں پہ پٹی باندھ کر ایک ہی دائرے میں چلتی رہتی ہیں آزادی اُن کے قریب نہیں آتی۔ بھٹہ مزدوری کوئی جرم نہیں ہے لیکن مزدوری کو غلامی اور بے حرمتی میں تبدیل کرنا جرم قرار دیا جانا چاہیے۔ اس منشی اور بھٹہ مالک کو اٹھا کر پھینک دینا چاہئے جو اپنی جکڑ بندیوں سے بھٹہ مزدور کی عزت نفس بھی چھین لیتا ہے اور اس کی خوشیوں کو کچلنا چاہتا ہے۔ میں اگر بھٹہ مزدور بن کر اللہ ڈیوایا کے بیٹوں کیساتھ بیٹھ کر اینٹیں بناؤں تو اِس سے میری انا کو کوئی ٹھیس نہیں پہنچتی۔ اگر قانون میرا محافظ ہے، میرے بچوں کیلئے تعلیم کے مواقع موجود ہیں، ریاست اور حکومت میرے بچوں کے لئے میرے دروازے پر تعلیم کا پیغام لئے کھڑی ہے، تو مجھے بھٹہ مزدور ہونے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی۔ صرف "تعلیم سب کیلئے" کا نعرہ لگا دینا کافی نہیں ہے۔ میرے بچوں کیلئے ایک ایسا ملک چاہئے جو صحیح معنوں میں مادر وطن ہو۔ ایسی ماں جو صبح سویرے اپنے بچوں کو تیار کر کے سکول بھیجتی ہے، ایسی ماں جو بیمار بچے پر قربان ہو جاتی ہے، ایسی ماں جو اپنے بچوں کیلئے ناشتہ تیار کرتی ہے، ایسی ماں جو اپنے بچوں کا تن ڈھانپنے کیلئے اچھے سے اچھا کپڑا لاتی ہے، ایسی ماں کی ضرورت ہے۔ ہر وطن ماں ہوتا ہے۔

خدا بخش نک صاحب! آپ کو نک اس لئے کہتے تھے کہ آپ بہت نک چڑھے تھے، ہم تو نک چڑھے بھی نہ رہے۔ ہم تو تابعدار قسم کے مزدور ہیں۔ ہم نئے عالمی نظام میں اپنی ملکی آزادی کو گروی رکھ چکے ہیں۔ تمہارے پوتے ہی بھٹہ مزدور نہیں، ہم سب اس بین الاقوامی نظام میں بھٹہ مزدور کی شکل میں کھڑے ہیں اور بھٹہ کا منشی، کاتب تقدیر بن چکا ہے۔ وہ ہمارا مقدر لکھتا ہے اور ہم سر جھکا کر اسی کو تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خدا بخش تک صاحب! اب تو نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ تمام کھیت مزدور بھی مزدور نہیں رہے بلکہ غلام بن رہے ہیں۔ ایک مالک سے دوسرا مالک انہیں خرید لیتا ہے اور ان کے مرنے پر ان کی نسلیں غلامی کا طوق اپنے گلے میں پہن لیتی ہیں۔ Market) (Economy مارکیٹ اکانومی نے فیکٹری مزدوروں کو بھی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لیا ہے۔ ان کے حقوق غصب ہو چکے ہیں، جو حقوق انہیں پوری دنیا نے دے رکھے ہیں، پاکستان میں وہ اُس کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتے اور اگر بھول کر مطالبہ کر بیٹھیں تو بیروزگاری کا اژدھا انھیں ہڑپ کر لیتا ہے اور وہ بھوک کے سامنے سر خم کر دیتے ہیں۔ اِس آبادھاپی کے دور میں اُن کسانوں کی مراعات کی بات کرنیوالوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔ معاشی غلامی سے آزادی کے بغیر سیاسی آزادی بے معنی ہوتی جا رہی ہے اور سیاسی آزادی کا عدم وجود معاشی غلامی کا باعث بن رہا ہے۔ اِس چکر میں گھومتے ہوئے زندگی گذر جاتی ہے اور نئی نسل اس طوق کو اٹھا کر اپنے گلے میں ڈال لیتی ہے جو پرانی نسل کے مرنے پر ان کے گلے سے اتارا جاتا ہے۔ بہر حال خدا بخش تک صاحب آپ کو مبارک ہو کہ اب آپ کے پڑپوتے ننگے پاؤں چائے کے کھوکھے پر مزدوری کر رہے ہیں تم بھینسوں کی خدمت کرتے تھے وہ انسانوں کی خدمت کر رہے ہیں، یہ ترقی نہیں تو کیا ہے؟

اللہ کے حبیب ﷺ نے کہا:

"الکاسب حبیب اللہ"

(مزدور اللہ کا حبیب ہے)

اللہ کے حبیب ﷺ کی خوشنودی کا تقاضا ہے کہ ہم اللہ کے حبیب (مزدور) کی خوشنودی حاصل کریں۔ آخرت کی نجات کے لئے ہی سہی، مزدور کا نظام نافذ کرنا ہوگا، ورنہ نہ دین کے رہیں گے نہ دنیا کے!۔

خدا حافظ!

آپکا مخلص!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

علامہ ابوالخیر اسدی صاحب!

السلام علیکم!

آپ کو دنیا چھوڑے ہوئے ایک عرصہ بیت گیا ہے۔ آپ ہمارے خاندان کے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ علم کے حصول کے لئے آپ نے ایران، عراق، شام، بیت المقدس، حجاز اور مصر کا طویل سفر کیا اور جامعہ ازہر سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد واپس گاؤں تشریف لے آئے۔

آپ نے ایک چھوٹی سی مسجد میں بیٹھ کر وعظ و نصیحت اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا پھر تصنیف اور تالیف کے ذریعے اس سلسلہ کو آگے بڑھایا۔ آپ نے مسلمانوں کے عقائد میں پیدا ہونے والی خرابیوں کو اپنا موضوع بنایا۔ آپ کا یہ قدم جرأت مندانہ تھا کیونکہ ہم میں سے اکثر اکابر پرستی کا شکار تھے اور اپنے بزرگوں کی نیک نامی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے اور ان کے نام کو اپنے مفادات کے لئے استعمال کرتے تھے۔ آپ کے خیالات ''پیران حرم'' کے لئے ناقابل برداشت تھے۔ آپ نے دین کا استحصال کرنے والے طبقہ کو ہر قدم پر للکارا، آپ کے اردگرد ایک جماعت کھڑی ہوگئی۔ غریب طبقات کو آپ کی انقلابی باتیں بہت پسند آئیں۔ مسجد کے اردگرد کی عمارتیں خرید کر مسجد کو وسیع کر دیا گیا۔ آپ نے اس میں بچوں کے ساتھ بچیوں کی تعلیم کا سلسلہ بھی شروع کرایا۔ میری بیٹی میمونہ بھی اسی درس کے اساتذہ کی محنت سے گھر میں بیٹھ کر قرآن حکیم کی حافظہ بن سکیں۔ یہ سعادت ہمیں آپ کے طفیل نصیب ہوئی۔

آپ کی لائبریری کی شہرت دور دور تک تھی۔ آپ نے زندگی عسرت اور تنگدستی میں گزاری۔ آپ کا کھانا بہت سادہ ہوتا تھا۔ آپ کے عقیدت مند آپ کی بہت خدمت کرتے مگر جب تک آپ ان پیسوں کو خرچ نہیں کر لیتے آپ کو آرام نہ آتا۔ آپ یا تو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کتابیں خریدتے یا ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کر دیتے۔آپ کے بچوں نے بھی بہت مشکل وقت گزارا۔آپ نے ان کے مستقبل کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔آپ کا بیٹا ابوبکر شروع سے میری سیاسی معاونت میں پیش پیش رہا ہے، اب وہ پرائمری کا استاد ہے، اور آپ کا پوتا چھوٹا سا ٹیکنیشن۔آپ کی دوسری اولاد بھی چھوٹے موٹے کام کر کے گزر بسر کر رہی ہے۔آپ کا کردار ہم سب کے لئے روشنی کا مینار ہے۔آپ نے بے شمار کتابیں تصنیف کیں مگر مجھے آپ سے گلہ ہے کہ آپ نے اسلام کا محدود تصور پیش کیا۔

چھوٹی موٹی معاشرتی برائیوں پر آپ نے ہزاروں تقریریں کر ڈالیں مگر جو معاشرتی حل اسلام پیش کرتا ہے، آپ نے اس کے بارے میں کوئی تصور لوگوں کے ذہن میں جا گزیں نہ کیا۔آپ کی اور مولانا نور احمد فریدی کی تقریروں سے تصادم کی فضا پیدا ہوتی تھی۔ سارا گاؤں عقائد کی بنیاد پر ایک دوسرے کو ہیچ سمجھتا تھا ایسے لگتا تھا کہ دونوں فرقوں میں سے ایک ضرور گمراہ ہو چکا ہے۔حالانکہ آپ دونوں فقہ حنیفہ کے پیروکار تھے۔آپ کی تقریروں سے محسوس ہوتا تھا کہ دونوں میں سے ایک فرقہ ضرور جہنم میں جائے گا۔ایسا کیوں تھا؟۔

میں نے گذشتہ نصف صدی میں بارہا آپ کی امامت میں نماز پڑھی ہے۔اور آپ کی تقریروں سے رہنمائی حاصل کی ہے، پیغمبر اسلام اور خلفاء راشدین کے عمل سے، جو اسلام سامنے آتا ہے، معاشرہ کو ترقی کے راستے پر گامزن کرنے کا نام ہے، انسان کے مسائل کا حل پیش کرتا ہے، وہ انصاف فراہم کرتا ہے اور امن کے ساتھ زندگی گذارنے کا ڈھانچہ بنا کر دیتا ہے۔کمزور طبقات کو بالا دست کرنے کا ہنر بتاتا ہے۔انسانی تفریق و تقسیم کے خاتمے پر زور دیتا ہے، انسان کی تکریم اور تعظیم کرتا ہے، اسلام انسان کو معراج پر پہنچانے کیلئے زمان و مکان کی پابندیوں سے بے نیاز کر دیتا ہے اور انسانی معاشرے کو پستیوں سے نکال کر بلندی پر لے جاتا ہے۔سارے نظام کے تانے بانے فرد کی آزادی کیلئے اور اسکی زندگی کو بہتر بنانے کیلئے بُنتا ہے، وہ کہتا ہے بھوک کفر کے قریب لیجاتی ہے اور پھر بھوک ختم کرنے کا حل بتاتا ہے۔اپنے آپ کو ایک محدود حلقے کے اندر قید کر لینے کا تصور مجھے اسلام

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں کہیں نظر نہیں آیا میں نے آپ کو کبھی کسی مصلی یا کم درجے کی ذات والوں کے ساتھ بیٹھ کر اکٹھے کھانا کھاتے نہیں دیکھا۔ کاش آپ زندہ ہوتے اور اس بات کا جواب دیتے، شاید میں ماحول کی وجہ سے سوال کرنیکی جسارت ہی نہ کرتا، کیوں؟ آخر کیوں؟ پیغمبر ﷺ سے سوال کیا جا سکتا ہے، صحابہ کرامؓ سے سوال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن آج کے عالم دین سے سوال کرنے کی جرأت میرے جیسے آدمی کے اندر بھی نہیں ہے، میں آپ کے سامنے سوال نہیں کر سکتا تو کون کرے گا۔ آپ سے سوال؟ مگر اسلام اور قرآن تو بار بار کہتا ہے کہ پوچھیے! صرف موسیٰ کو خضر نے پابند کیا تھا کہ سوال مت کرو۔ ہمارا ہر عالم دین خود کو خضر راہ بنا کر پیش کرتا ہے مگر دوسروں کو موسیٰ جتنی آزادی نہیں دیتا ایسا کیوں ہے؟۔

والسلام!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

حضرت مولانا نور احمد فریدی صاحب! السلام علیکم!

جناب والا! میں آج کچھ گذارشات کرنے کی جسارت کر رہا ہوں اُمید ہے آپ مجھے اِس گستاخی پر معاف فرمائیں گے۔ جناب والا میں نے جب ہوش سنبھالا تو جامعہ مسجد کو ویران پایا۔ فرش اُکھڑا ہوا تھا، وضو کرنے کی جگہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی، اَبابیلوں نے ڈیرے جما رکھے تھے، نمازی اپنے امام کی طرزِ زندگی کے شاکی تھے۔ اِس دوران آپ کو اِس وسیع وعریض پانچ گنبد والی مسجد میں امامت کا فریضہ سونپا گیا۔ اہل شہر نے آپ کو خوش آمدید کہا۔ آپ کے آتے ہی مسجد میں رونق ہوگئی۔ آپ نے مدرسہ قائم کیا، میں نے بھی قرآن حکیم آپ سے پڑھا، پھر لاؤڈ سپیکر آ گیا، اس میں اذان کہنے اور اللہ کا پیغام آگے پہنچانے کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ آپ کے خطبات میں جوش اور ولولہ ہوتا تھا، آپ کی علمیت کا رعب لوگوں کے دِلوں پر بیٹھ گیا۔ میں نے آپکی تقاریر کے ذریعے مثنوی مولانا روم سنی، عبدالرحمٰن جامی کا کلام سنا، سعدی شیرازی کی نصیحتیں سنیں، آپکی تقاریر کے ذریعے صحاح ستہ کو سمجھنے کا موقع ملا۔ عموماً آپکا موضوع مقام مصطفیٰ ﷺ رہا۔ اِس موضوع پر آپ نے بہت محنت کی اور حضور ﷺ سے محبت کی خوشبو کو چار سُو پھیلایا۔

مجھے جب بھی موقع ملا جمعہ کی نماز آپ کی امامت میں ادا کی۔ آپکے اندر دولت جمع کرنے کی خواہش نہ تھی۔ آپ شمعِ رسالت ﷺ کے ایسے پروانے تھے جو جل مرنے کیلئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ آپکے بچوں میں ایک بیٹا پرائمری سکول کا ٹیچر ہے، دوسرا بیٹا انوارالحق میرے پاس ڈرائیور کے طور پر کام کرتا ہے۔ دنیاوی طور پر آپ نے کچھ بھی حاصل نہیں کیا نہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلایا۔ آپکے کئی ایسے شاگرد موجود ہیں جو پاکستان ٹیلی ویژن پر پورے ملک کو اسلام کے بنیادی اصولوں سے روشناس کراتے رہتے ہیں۔ اس سب کے باوجود مجھے قید خانے کے اندر کچھ سوالات کرنے کی جرأت ہو رہی ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پہلی بات تو یہی ہے کہ میں نے آپ کو اسلام کی معاشرتی زندگی کو عملی طور پر پیش کرتے ہوئے کبھی نہ دیکھا۔ میں نے ابوالخیر اسدی (شاہد صاحب) کی طرح آپ کو بھی کسی غریب مصلی کے ساتھ ہم مجلس ہوتے نہیں دیکھا، اسلام انسان کو مساوات کا سبق دیتا ہے، اسلام کہتا ہے کہ صفائی آدھا ایمان ہے، آپ کو صفائی کے اوپر تقریر کرتے ہوئے کبھی نہیں سُنا۔ اسلام کہتا ہے کہ لوگوں کی، یتیموں کی، بیواؤں کی مدد کی جائے، اِس کیلئے میں نے آپ میں عملی طور پر کوئی تنظیم بنانے کی تحریک نہیں دیکھی۔ اسلام یتیموں، بیواؤں کے علاوہ کام کرنے والے مزدوروں کیلئے فلاحی ادارے بنانے کا حکم دیتا ہے، میں نے کبھی آپ کو گاؤں میں یہ کام کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ آپ کا مقام اور آپ کا ادب اپنی جگہ لیکن مجھے ایک عالمِ دین، ایک پنڈت یا ایک پادری کی زندگی میں فرق نظر آنا چاہیئے۔ ذاتی زندگی میں مَیں نے دیکھا ہے کہ ایک پادری کے کردار پر بھی اُنگلی نہیں اُٹھائی جاتی، میں نے ایسے پنڈت بھی دیکھے ہیں، جن کا ذاتی کردار بھی بہت بلند ہوتا ہے۔ تقریر میں بھی وہ انسان کی عزت اور عظمت کی بات کرتے ہیں، اللہ کی وحدانیت کیلئے لوگوں کو تیار بھی کرتے ہیں۔ مگر وہ مذہب کو نظریہ حیات کے طور پر پیش نہیں کرتے۔ جبکہ اسلام تو آیا ہی مکمل زندگی کا نمونہ پیش کرنے کیلئے ہے۔ آپ کے ہاں مسجد میں بیٹھ کر اسلامی طرزِ معاشرت کیلئے کوئی پیغام سنائی نہیں دیتا۔ ایک روایتی انداز سے عبادات کو عملی زندگی سے علیحدہ کر دیا گیا۔ روزمرہ کے معاملات میں آپ کی رائے کی کوئی اہمیت نہیں۔ کیونکہ آپ خود کو الگ تھلگ رکھ کر صرف واعظ کا کردار ادا کرتے ہیں۔ میں نے فلسفیانہ موشگافیوں پر آپکی سینکڑوں تقریریں سنی ہیں جن کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ آپ لوگوں کو یہ نہیں بتاتے کہ قرآن دنیا میں چلنے پھرنے کی تلقین کرتا ہے اور بار بار کہتا ہے!

"افلا تدبرون افلا یتفکرون"

(وہ غور فکر کیوں نہیں کرتے)

پھر کہتا ہے:

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"سیرو فی الارض فینظر و کیف کان عاقبت الذین من قبل کم"

(زمین میں چلو پھرو تا کہ پہلے والوں کی عاقبت دیکھ سکو)

آپ کی تقریر کے دوران کوئی بھی کھڑا ہو کر سوال کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ آپ کرسی پر بیٹھے ہوتے ہیں اور سارے لوگ، وسیع جائدادوں کے مالک، وزرا، آفیسرز آپ کے سامنے دوزانوں ہو کر زمین پر بیٹھے ہوتے ہیں، آپ کا یہ مقام آپ سے بہت ساری چیزوں کا تقاضا کرتا ہے۔ اِس کا یہ مطلب نہیں کہ لوگ گونگے ہو کر بیٹھ جائیں اور صرف آپ کی باتیں سنیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خطبے میں بار بار مداخلت ہو سکتی ہے تو آپ سے سوال کیوں نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام تو عمل کی دنیا کا مذہب ہے، عقیدے پر زور دیتا ہے اور عمل کیلئے تیار کرتا ہے، دنیا کیلئے بھی اور آخرت کیلئے بھی۔

ہمارے علماء معاشرے سے کٹے ہوئے افراد ہیں حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

لا رهبانية في الاسلام

"اسلام میں رہبانیت نہیں"

دُعا بھی سکھائی ہے کہ

"ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الآخرۃ حسنۃ"

(اے رب میری دُنیا بھی بہتر بنا اور آخرت بھی)

عیسائی مشنری انسان کو بنیاد بنا کر اس کی خدمت کرتے ہیں اور اسی وجہ سے عیسائیت کے عقائد لوگوں کے اندر اگرچہ اتنے گہرے نہیں گئے، لیکن عیسائیت کا نام پوری دنیا میں پہنچا ہوا ہے۔ عیسائیت دُنیا کا سب سے بڑا مذہب ہے، اس کے باوجود کہ عیسائیت میں رہبانیت کی تبلیغ کی جاتی ہے۔ ہمارے منبر و محراب پر رہنے والے لوگوں نے رہبانیت کا اثر زیادہ لے لیا ہے، وہ گندگی صاف کرنے کیلئے خود گندگی میں اتر کر اپنے کپڑوں کو ناپاک نہیں کرنا چاہتے، تو پھر گندگی صاف کون کرے گا؟ گندا آدمی۔ دین کا فہم ابھی تک نظریئے سے گزارا جا رہا ہے، تجربے کی لیبارٹری سے نہیں گزارا جاتا۔ مولانا صاحب! میں نے آپ کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تقاریر چالیس پینتالیس سال سنیں، عمل اور نظریے میں فاصلہ ہے۔ نظریہ دو قدم آگے بڑھ کر عمل میں کیوں نہیں ڈھلتا، مجھ پر گستاخ ہونے کا فتویٰ نہ لگا دیجئے گا اور نہ ہی مجھے بدعقیدہ کہنے کا عمل شروع کرا دیجئے گا، میں آپ کے مقتدیوں سے بہت ڈرتا ہوں، میں نے تو ان سے ووٹ لینے ہیں، اگر آپ نے مجھے ان کی نظر میں بدعقیدہ قرار دے دیا تو میرے لئے مشکلات کا دور شروع ہو جائیگا مگر میں کیا کروں میں چپ نہیں رہ سکتا، پوچھنا چاہتا ہوں کہ کب ہمارا عالم دین نظریہ سے عمل کی تجربہ گاہ میں داخل ہوگا۔ جب یہ نظریہ تجربہ گاہ میں داخل ہوتا ہے تو کربلا برپا ہو جاتی ہے یہ کربلا آنیوالی صدیوں کے خدوخال ذہن میں واضح کر دیتی ہے، اِس ایک عمل سے اتنی روشنی پھوٹتی ہے کہ دور صدیوں تک پڑی ہوئی چیزوں سے گرد ہٹ جاتی ہے، آنکھ رکھنے والا ہزاروں سال تک کے واقعات کو دیکھ سکتا ہے۔ صدیوں سے آگے تمام زمینوں اور آسمانوں کے اُوپر پڑے ہوئے پردے آنکھوں سے ہٹا دیئے جاتے ہیں لیکن یہ عمل کی بھٹی بہت سخت بھٹی ہے۔ ابوجہل کو اس میں کچھ نظر نہیں آتا حالانکہ وہ حکمت کا باپ سمجھا جاتا تھا۔ مگر بلال کو ایران اور روم کی مٹتی ہوئی سلطنتیں بھی نظر آجاتی ہیں شاید اقبال نے اسی لئے کہا تھا:

ملا کی اذاں اور ہے مجاہد کی اذاں اور

والسلام!

آپ کا نیاز مند

جاوید ہاشمی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گیلی لکڑی کے آنسو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

محترمہ زینب "دائی" صاحبہ! السلام علیکم!

مجھے بتایا گیا کہ میرے پیدا ہونے کے بعد آپ نے بطور دائی اماں مجھے پالا پوسا، ایک دن تمہارے گھر میں داخل ہوا تو ایک میت چارپائی پر پڑی تھی اور تم زور زور سے رو رہی تھیں۔ تمہارے نالہ و فریاد اور آہ و شیون نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا، پتہ چلا کہ تم بیوہ ہو گئی ہو۔ یہ میت تمہارے خاوند کی ہے۔

خدا بخش تمہیں شہر سے بیاہ لایا تھا۔ اس کی اور تمہاری عمر میں بہت فرق تھا۔ تم بمشکل آٹھ نو سال سہاگن رہی تھیں۔ اس دوران تمہاری چار بیٹیاں اور دو بیٹے ذوالفقار اور عبداللہ پیدا ہوئے۔ خاوند کی موت کے بعد تمہارے سر پر چھ بچوں کا بوجھ تھا۔ گاؤں میں تمہارا کوئی رشتہ دار نہ تھا، تمہارے خاوند کے کنبے نے خدا بخش کے مرتے ہی تم سے منہ موڑ لیا۔ تم نے والدہ محترمہ کے ہاں پناہ لی اور ہمارے گھر کو میکہ بنا لیا۔ تمہارے شہر کے رشتہ داروں نے بھی کبھی پلٹ کر تمہاری خبر نہ لی۔

تمہاری بیٹیوں نے ہمارے گھر کام کرنا شروع کیا۔ وہ وہاں قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرنے لگیں۔ شام کو وہ اپنے گھر جاتیں تو اپنا اور تمہارا کھانا ساتھ لے جاتیں۔ تم نے تنور بنا لیا اور اپنے ہاتھوں سے کما کر بچوں کو کھلانے لگیں۔ گرمیوں میں گاؤں کی عورتیں تمہارے تندور سے روٹی پکوا لیتیں تو تمہاری اور تمہارے بچوں کی گزر بسر ہو جاتی۔ سردیاں آتے ہی جہاں تمہارا تندور سرد ہو جاتا تمہارے گھر کا چولہا بھی سرد ہو جاتا۔ جب تک خدا بخش زندہ رہا تمہارے بچوں کو روکھی سوکھی ملتی رہی۔ وہ زمینداروں کے ہاں کام کرتا، ان کی شادی غمی کا بوجھ بانٹتا، شادیوں پر دیگوں کے لئے سارا سارا دن کلہاڑے سے لکڑیاں پھاڑتا۔ شادی کے مہمانوں کو کھانا کھلاتا، موت کی رسومات سرانجام دینے کے لئے ایک ایک دروازے پر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جا کر اطلاع کرتا۔ تم بھی کپاس، مرچوں اور سبزیوں کی چنائی کی مزدوری سے اس کا ہاتھ بٹاتیں۔ گاؤں کے بے شمار بچے تمہارے ہاتھوں میں پیدا ہوئے، وہاں سے بھی کچھ نہ کچھ مل جاتا تھا۔ جو کام دونوں مل کر رہے تھے وہ سارا بوجھ اب تمہیں تنہا اٹھانا تھا۔

تمہاری دونوں بڑی بیٹیاں ہمارے گھر میں پل کر جوان ہوئیں۔ اب ان کی شادیوں کا مسئلہ درپیش تھا۔ اس فکرمندی میں تمہارے سر کے بال سفید ہو گئے۔ ان کی شادیاں ہو گئیں مگر بدقسمتی ابھی راہ تک رہی تھی۔ تمہاری بڑی بیٹی کے میاں نے دنیا سے منہ موڑ لیا اور شموں کو پہاڑ جیسی زندگی تنہا گزارنے کے لئے چھوڑ کر قبر میں جا سویا۔ اس واقعے کے بعد تمہارے چہرے پر ہر وقت رہنے والی اداسی نے وحشت کا روپ دھار لیا۔ تم تندور پر روٹی پکوانے والیوں سے الجھنے لگیں۔ میں نے کئی بار یہ منظر دیکھا۔ تم میری والدہ کے کندھے پر سر رکھ کر زار زار رونے لگتیں۔ میری والدہ تمہیں دلاسہ دیتیں مگر ان کی آنکھیں بھی بھیگ جاتیں۔

اماں زینب تمہارے دونوں بیٹے اب اپنے والد کے جانشین ہیں، وہ شادیوں پر لکڑیاں چیرتے ہیں۔ گاؤں میں سوئی گیس آ گئی ہے، اس کے باوجود دیگوں میں کھانا پکانے کے لئے لکڑی ہی سستی پڑتی ہے۔ تمہارے بچے سکول کا منہ نہیں دیکھ سکے۔

اب ان کے بچوں کی عمریں بھی سکول جانے کے لائق ہیں مگر میں نہیں سمجھتا کہ وہ اپنے بچوں کو سکول بھیج سکیں گے کیونکہ ابھی تک یہ ہو نہیں سکا کہ دایوں کمہاروں، لوہاروں اور مصلیوں کے بچوں پر تعلیم کے دروازے کھولے جائیں۔ عبداللہ اور ذوالفقار کے بچے کوئی الگ مخلوق تو ہیں نہیں۔

میں بچپن میں تمہارے خاوند خدا بخش کو دیگوں کے نیچے ایندھن جھونکتے دیکھتا رہتا تھا۔ لکڑیاں اگر گیلی ہوتیں تو جلتے ہوئے ان میں سے پانی نکلنا شروع ہو جاتا تھا۔ دھوئیں سے خدا بخش کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے، میں سوچتا تھا کہ گیلی لکڑی سے نکلنے والا پانی دراصل لکڑی کے آنسو ہیں، جو جلائے جانے پر وہ بہا رہی ہے۔ اب سوچتا ہوں تمہاری زندگی بھی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گیلی لکڑی کی طرح تھی جو جلتی رہی اور آنسو بہاتی رہی۔ عبداللہ، ذوالفقار کے بچوں کی زندگی بھی اسی طرح چولہوں میں آگ جھونکتے گزرے گی۔ اس بات کا تصور ہولناک ہے لیکن یہ تصور نہیں تلخ حقیقت ہے، مگر نہ جانے میں کیوں اس حقیقت کا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔ سنا ہے اب ذوالفقار نے ٹریکٹر چلانا سیکھ لیا ہے اور وہ رات دن زمینداروں کے ٹریکٹر چلا کر اپنے بچوں کا پیٹ پال رہا ہے۔ اماں زینب! اتنی شاندار ترقی پر میری طرف سے دلی مبارک باد قبول ہو!!۔

والسلام

تمہارا والد

جاوید ہاشمی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھیانک تصویر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

برادرم محمد اقبال "درزی" صاحب

السلام علیکم!

آج آمنہ نے بتایا کہ آپکی بیٹی کی شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی لیکن اُس کے جہیز کا ابھی تک بندوبست نہیں ہو سکا اور نہ ہی جو قرض تم چھوڑ کر گئے ہو اُسکی قسطیں ادا ہو رہی ہیں۔ آمنہ کوشش میں لگی ہوئی ہے، خدا کوئی نہ کوئی انتظام کر دیگا۔

برادرم اقبال صاحب! آپ مجھ سے ایک جماعت پیچھے تھے، آپکے والد ماسٹر غلام رسول اور اُنکے دوسرے بھائی ہندوستان سے آ کر مخدوم رشید میں آباد ہو گئے، اُنہوں نے مل کر درزی خانہ بنایا۔ میرے ماموں نے اُنہیں اپنی دُکانوں میں سے ایک پر بیٹھنے کی اجازت دیدی۔ جب تک آپ کے والد کی آنکھوں میں بینائی موجود رہی وہ راتوں کو جاگ کر بھی محنت مزدوری کرتے رہے۔ آپکے چچا شیر محمد ڈاک لیکر روزانہ دس بارہ میل کا سفر پیدل کرتے اور نواحی بستیوں تک ڈاک پہنچاتے، اُنہیں اِسکا حقیر معاوضہ ملتا مگر وہ اسی پر مطمئن تھے۔ تمہیں تعلیم کا شوق تھا، تمہارے والد تمہیں نکھٹو اور محنت سے جی چرانے والا کہتے تھے، کیونکہ تم انہیں کچھ کما کر نہیں دیتے تھے۔ تمہیں ساری عمر والد سے جھاڑیں پڑیں مگر تم انتہائی فرمانبرداری سے سب کچھ برداشت کرتے رہے، مگر تعلیم سے مُنہ نہیں موڑا۔ آپ ہر وقت خوف میں مبتلا رہتے تھے کہ آپ کے والد کسی وقت بھی تعلیم کے حصول سے منع کر دیں گے۔

آپکے والد نے آپکا نام محمد اقبال رکھا۔ علامہ محمد اقبال کے والد نور محمد بھی درزی تھے۔ علامہ صاحب کے والد محترم شیخ نور محمد ولی کامل تھے اور آپ کے والد کو بھی میں نے ہمیشہ قناعت پسند پایا، آپکو میں نے شروع سے بھائی بنالیا تھا، آپ شام کو میرے ساتھ لمبی سیر کیا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کرتے تھے، آپکو اپنی شکل وصورت واجبی ہونے کا بھی شدید احساس تھا مگر آپ میں حسِ مزاح کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، آپ کے والد تو آپ کو تعلیم حاصل کرنے سے نہ روک سکے مگر آپ مالی حالات کی وجہ سے اسے جاری نہ رکھ سکے اور قریبی پرائمری سکول میں پڑھانے لگے۔آپ نے پرائیویٹ امتحان دیکر M-A کرلیا۔آپ اپنی محنت اور ذہانت کی وجہ سے ریڈیو پاکستان ملتان میں پرڈیوسر ہوگئے۔یہ آپکی ترقی کی معراج تھی۔آپ نے اپنی بیوی کو خود تعلیم دی اور وہ بھی سکول ٹیچر ہوگئیں۔

آپ نے مجھے خوشخبری سنائی کہ آپ نے ایک سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل خرید لی ہے۔مجھے واقعی بہت خوشی ہوئی۔ایک دِن یہ جانکاہ خبر ملی کہ ڈبل پھاٹک ملتان سے گذرتے ہوئے ایک فوجی ٹرک سے ٹکرا کر آپ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔میں آپ کی تجہیز وتدفین میں شریک تھا، میں آپکے بھولے بیٹے اور بیٹیوں کے بارے میں کافی پریشان رہا۔کچھ عرصہ پہلے اِس خبر نے ہلا کر رکھ دیا کہ آپکی اہلیہ بھی چل بسیں، پہلے آپکی بچیاں شفقتِ پدری سے ہی محروم تھیں جواب والدہ کے بغیر بالکل بے سہارا ہوگئیں۔

زندگی اور موت کا سلسلہ تو جاری وساری ہے لیکن طبقاتی حوالوں سے آپ اور آپکے بچے جن مشکلات کا سامنا کرتے رہے ہیں اور کررہے ہیں وہ معاشی مسائل سے زیادہ تکلیف دہ ہیں، معاشی مسائل کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکل آئیگا، لیکن معاشرتی مسئلے کی بھیانک تصویر آپکے بچوں کے چہروں پر چسپاں رہے گی، اِسکا حل خدائے دیرگیر کیوں نہیں نکالتا؟۔

فقط، آپکا بھائی!

جاوید ہاشمی!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہ ایک صدی کا قصہ ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

عزیزم فیض محمد صاحب

السلام علیکم! مزاج بخیر!

فیض محمد، تمہاری عمر تیس سال کے لگ بھگ ہوگی، گزشتہ چوبیس سال سے تم ہمارے ہاں ملازمت کر رہے ہو، تمہارا چھوٹا بھائی ممتاز بھی 18 سال سے ہمارے گاؤں والے ڈیرہ پر ملازم ہے۔ تمہاری والدہ زنان خانے میں کام کرتی ہے اور تمہارا والد محمد نواز، جب تک چلنے پھرنے کے قابل تھا، ہماری ملازمت میں رہا، وہ اور تمہارا دادا ملک محمد حیات ملکر ہمارے اونٹوں کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے، تمہاری دادی گامن بی بی اور تمہارے دادا کی بہن سلامت مائی بھی، ہمارے ہمارے گھروں میں کام کرتی رہیں، تمہارے پردادا ملک گہنہ تک تو میں جانتا ہوں جو ہمارے گھر سے وابستہ رہے۔

تمہارا والد اور پھوپھا میرے والد محترم سے دستِ بیعت تھے۔ وہ اپنے مُرشد کی خدمت کو اعزاز سمجھتے تھے، تمہاری پانچ نسلیں ہماری خدمت پر مامور رہیں۔ اِس ایک صدی میں تمہارے خاندان کا کوئی فرد کسی جرم میں ملوث نہیں رہا۔ آپکا کنبہ نیک لوگوں پر مشتمل ہے، تم نے بھی، بطور میرے ذاتی ملازم، میری بہت خدمت کی ہے۔ تم مہمانوں کی خدمت بھی بہت دلجمعی سے کرتے ہو۔ مجھے تم نے کبھی، سوائے اس کے، کوئی شکایت کا موقعہ نہیں دیا کہ جونہی میں ملتان میں اپنی خوابگاہ میں جاتا ہوں تم بغیر بتائے رات اپنی بیوی بچوں کے پاس گزارنے کے لئے بیس میل کے فاصلے پر گاؤں چلے جاتے ہو اور اگلے دن میرے باہر آنے سے پہلے موجود ہوتے ہو۔ ڈیرے کی صفائی کر چکے ہوتے ہو اور کرسیوں کو ترتیب سے رکھ چکے ہوتے ہو۔ بسا اوقات علی الصبح آنے والے مہمانوں کو چائے بھی پلا چکے ہوتے ہو۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فیض محمد تمہارے دادا کے بھائی ملک سردار محمد کو میں نے کونسلر منتخب کرایا۔ انہوں نے پیر ریاض حسین شاہ ایم پی اے کو ہرایا، جو میرے قریبی رشتہ دار تھے۔ شاہ صاحب ہر الیکشن میں اپنی گاڑی پر رات دن میری کامیابی کے لئے کام کرتے۔ انہیں مجھ سے یہ توقع نہیں تھی کہ میں ان کے مقابلہ میں ایک ملازم کا ساتھ دوں گا۔ انہوں نے اس کے بعد ساری زندگی میری بھرپور مخالفت کی، جس کا مجھے کوئی گلہ نہیں۔ ملک سردار محمد کے دو بیٹیاں اور چھ بیٹے تھے قادر بخش، محمد رمضان، واحد بخش، اللہ بخش، غلام حسین اور گھنہ سب نے کافی عرصے تک ہماری ملازمت کی۔ قادر بخش کی ڈیوٹی مجھے سکول چھوڑنے اور لانے پر لگی ہوئی تھی اور اس نے اپنی ڈیوٹی میں کبھی کوئی کوتاہی نہیں کی۔ تمہارے دادا کے تیسرے بھائی حاجی اللہ دتہ نے اونٹوں پر بار برداری کا کام چھوڑ کر دکان کھول لی۔ اس کے بچوں کا گزارہ بہتر ہو گیا۔ مگر اب ان کی مالی حالت خاصی کمزور ہے۔

فیض محمد! آپ کے خاندان سے ہمارا تعلق مالک اور ملازم کا نہیں بلکہ آپ کے خاندان کے تمام افراد کو ہم اپنا عزیز سمجھتے ہیں اور آپ کی عورتوں کا احترام اپنی بہنوں اور بیٹیوں کی طرح کرتے ہیں۔ آپ کے والد، آپ کے پھوپھا، آپ کی پھوپھی سرور اور دیگر افراد نے میرے والد محترم کے ہاتھوں پر بیعت کی ہوئی ہے۔ یہ تعلق مرشد زادگان اور مریدین کا بھی ہے۔

میں رات کے ساڑھے تین بجے اپنے اور تمہارے خاندانی تعلقات کے تانوں بانوں کے بارے میں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ مجھے خود احتسابی کے عمل کا سامنا ہے۔ اتنے بندھنوں اور ایک سو سالہ خدمات کے باوجود آپ وہیں کھڑے ہیں جہاں سو سال پہلے تھے، نہ مرید ہونے سے آپ کو روشنی کا راستہ ملا اور نہ مزارع یا ملازم ہونے سے ہماری نظر آپ کی بہتری کے لئے اٹھی۔ باہمی احترام کا رشتہ بھی ہمارے لئے نفع کا سودا تھا اور تمہارے خاندان کے لئے نقصان کا۔

آپ کے خاندان کے کچھ لوگوں نے لکڑی کے کھوکھے لگا کر چائے خانے قائم کیے اور کسی نے لسی اور سوڈا واٹر کی چھوٹی چھوٹی دکانیں بنا کر انہیں پیٹ بھرنے کا ذریعہ بنایا۔ ان

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں سے کچھ کو بیماریوں نے گھیر لیا اور یہ خوشحالی کے دن خواب ہو گئے۔ بہر حال ہمارے اونٹ اور بھیڑ بکریاں چرانے سے یہ زندگی گزارنے کا بہتر طریقہ تھا جو اختیار کیا گیا۔

میں اس وقت جو شب بیداری کر رہا ہوں وہ اس لئے ہے کہ جب میں دیکھتا ہوں آپ میں سے کسی نے بھی سکول کا منہ نہیں دیکھا، اور اگر ایک آدھ نے کوشش بھی کی تو دوسری تیسری جماعت سے آگے نہیں چل سکا، یہی المیہ میری آنکھوں کی نیند چرانے کے لئے کافی تھا، مگر بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ میرا ضمیر میرے سامنے کھڑا ہے، اور پوچھ رہا ہے کہ اگر تم ایسے لوگوں کی زندگی میں تبدیلی نہیں لا سکے، جن مردوں اور عورتوں نے تمہاری بے پناہ خدمت کی ہے، تو تمہارے ملک اور قوم کی تقدیر بدلنے کے دعوے پر کیسے اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ میرے پاس اس سوال کا جواب نہیں ہے۔ میری بے خوابی بے قراری میں تبدیل ہو رہی ہے۔ میں جیل کی دیواروں سے گفتگو کی کوشش کرتا ہوں۔ اندھی گونگی اور بہری دیواریں میرا انداق اڑاتی ہیں، مجھے لگتا ہے جیسے وہ مجھ سے کہہ رہی ہوں کہ تم نے لوگوں کو صدیوں سے اسے غلام بنایا ہوا ہے، تم نے جان بوجھ کر لوگوں کو اندھا گونگا اور بہرہ رکھا ہوا ہے، تم پیری مریدی کے نام پر انہیں بولنے کے قابل نہیں رہنے دیتے۔ رزق کی مار دے کر ان کو عقل و خرد سے محروم کر دیتے ہو اور احترام کے حوالے سے لچھے دار گفتگو کر کے انہیں الفاظ کے جال میں پھنساتے ہو۔

میں ان دیواروں سے ڈرنے لگا ہوں صبح کی اذانیں شروع ہو گئیں، ظلمت شب سیماب پا ہو رہی ہے، اجالا اندھیرے کے تعاقب میں ہے۔ میں نے روشنی کی لکیر پر چلنے کا عہد کر لیا ہے، اس اجالا کو گاؤں بستی بستی شہر شہر پہنچانے کا عہد، اے اللہ! مجھے اس عہد پر قائم رہنے کی توفیق دے!! آمین۔ مؤذن کہہ رہا ہے الصلوٰۃ خیرا من النوم، نماز نیند سے بہتر ہے، یقیناً یہ خواب غفلت سے جاگنے کا پیغام ہے۔

والسلام

خیر اندیش، جاوید ہاشمی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تو شاہ ہم گدا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

جناب قادر بخش قادو مجاور صاحب!

السّلام علیکم! مزاج بخیر!

اِس وقت رات کے دو بجے ہیں۔ تم مجھے یاد آ رہے ہو۔ تمہارے پورے کنبہ کی گذر بسر ہمارے جدِ امجد حضرت مخدوم عبد الرشید حقانی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کی رکھوالی کے عوض ملنے والے نذرانوں پر تھی۔ صدیوں کا یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

میں نے تمہیں مخدوم رشید کی گلیوں میں اکثر بھیک مانگتے دیکھا، تمہارے ہاتھ میں کالے رنگ کا کشکول ہوتا تھا، جس میں کچھ سکے پڑے ہوتے تھے۔ تمہارے سبز لمبے چُغے پر رنگ برنگی کپڑے کی دھجیاں دُور سے نظر آتی تھیں، تمہاری ٹوپی پر بھی اِسی کپڑے کی رنگا رنگ پٹیاں تمہاری ہیئت گدائی کو نمایاں کرتی تھیں، تمہارے گلے میں کئی رنگوں کے منکے جھول رہے ہوتے تھے، تمہارے ہاتھوں میں لوہے کے کڑے ہوتے تھے، تمہارا قد چھوٹا تھا اور ایک آنکھ بینائی سے محروم تھی، تمھارا رنگ سانولا تھا اور چہرے پر خشخشی داڑھی تھی۔

قادر بخش، میں نے بار ہا دیکھا کہ تم نشے میں مدہوش ہوتے تھے، تمہیں چرس پینے کی لت تھی، تم چلتے ہوئے لڑکھڑاتے تھے اور بات کرتے ہوئے تمہارے الفاظ تمھارا ساتھ نہ دیتے، تمہاری گفتگو دعائیہ رنگ لئے ہوتی تھی جس میں نہ کسی کا گلہ ہوتا اور نہ کسی کی غیبت.... تم دربار شریف کے دروازہ پر بیٹھے رہتے جب نیند کا غلبہ ہوتا تو زمین پر ہی سو جاتے، بچے کبھی کبھی تمہارے کشکول سے پیسے اُٹھا کر بھاگ جاتے، لیکن کبھی تم نے اُن کا پیچھا نہ کیا۔

آج سے نو سال پہلے میں ہنگری کے دارالحکومت "بوڈاپسٹ" سے کراچی پہنچا تو تمہاری موت کی اطلاع ملی۔ میں ملتان اپنے بچوں سے ملے بغیر سیدھا تمہارے گھر پہنچا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میرے بچے ملتان میں مجھ سے ملنے کے منتظر تھے لیکن تمہارے رشتہ دار اور تمہارے اہل و عیال میرا انتظار کر رہے تھے میں اُن کے غم میں شریک تھا۔ اگر چہ فاتحہ خوانی سے یقیناً تمہاری روح کو ثواب پہنچا ہوگا، مگر سچی بات یہ ہے کہ اگر مجھے تمہارے کنبے کے چالیس ووٹوں کا لالچ نہ ہوتا تو ضروری نہیں تھا کہ میں اپنے بچوں سے پہلے تمہارے بچوں کی خبر گیری کرتا۔ میرے بھائی اور کنبے کے افراد پہلے ہی تعزیت کیلئے تمہارے گھر جا چکے تھے، میں بھی ضروری امور کی انجام دہی کے بعد جا سکتا تھا۔

جب ایک وفاقی وزیر اپنے پورے پروٹوکول کے ساتھ تمہارے بچوں کیساتھ زمین پر بیٹھ کر دُکھ درد بانٹ رہا تھا تو اُنہیں اپنی اہمیت کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ معاشرے کا محروم طبقہ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو اہم سمجھ رہے تھے۔ مجھ سے پہلے علاقے کی سیاست میں حصہ لینے والے میرے مخالفین کی لمبی لمبی گاڑیاں بھی تمہارے بچوں کے ہاں حاضری دے چکیں تھیں۔

تمہارے بچے جن گاڑیوں کو محرومی کے احساس سے پتھر مار کر بھاگ جاتے تھے، اُنہیں وہ گاڑیاں بھی اپنی لگ رہی تھیں۔ ایک متوازن معاشرے کیلئے سوچ کا دھارا تبدیل ہو رہا تھا۔ اجنبیت کی دیواریں گر رہی تھیں۔ تم بھیک مانگنے والے تھے، مگر جمہوری عمل کے دھارے نے تمہاری اہمیت تسلیم کر لی تھی۔ تمہارے بچے اور تمہارے کنبے کے افراد بھی اس اہمیت سے بے خبر نہ تھے۔ جمہوریت تو بھیک مانگنے والے سے بھی بھیک مانگتی ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ چند شرارتی بچے تمہیں دینے کی بجائے تمہاری مانگی ہوئی بھیک تم سے چھین لیتے ہیں، کبھی طاقت کے زور پر کبھی ہتھیاروں کے زور پر!۔

مگر جمہوریت ہمیں پھر تمہارے دروازے پر سوالی بنا کر لے آتی ہے۔ تم شاہ بنتے ہو اور ہم سب بھکاری..........

خدا حافظ! تمہارا مخلص

جاوید ہاشمی!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مہاجر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

15 جولائی 2006ء

برادر محمد شریف ماڑو ولد علم دین ماڑو صاحب

السلام علیکم! اطلاع ملی ہے کہ آپ سفر آخرت پر روانہ ہوگئے ہیں۔ آپ کی سبزی والی ریڑھی کو ایک ٹرک نے ٹکر ماری اور بیچ میں آپ کچلے گئے۔ آپ کے نام کے ساتھ لفظ ماڑو کا مطلب ہی کمزور ہونا ہے۔ کمزور کا کچلا جانا تو فطری امر تھا۔ آپ کے والد صاحب نے آپ کو یہ نام ورثہ میں دیا۔ ان کے اصل نام علم دین سے کوئی بھی واقف نہ تھا۔ تمہیں بھی ہمیشہ ماڑو کے نام سے پکارا گیا۔ آپ دوسری جماعت تک میرے ساتھ پڑھتے رہے، پھر تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ آپ اپنی سبزی کی دکان پر بیٹھ گئے۔ دوران تعلیم میں نے آپ کو اپنا بھائی بنایا اور یہ رشتہ اب تک قائم ہے۔

جب آپ کے والد ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آرہے تھے تو آپ کی والدہ راستے میں کہیں کھو گئیں۔ آپ کو آپ کے والد نے پالا پوسا گاؤں میں آپ کا کوئی رشتہ دار تھا اور نہ کوئی جاننے والا۔ سارے علاقے میں کوئی آپ کا ہم زبان نہ تھا جس زبان میں آپ گفتگو کرتے نہ وہ اردو تھی نہ پنجابی نہ ردبھتکی بلکہ وہ ان تمام زبانوں کا ایسا ملغوبہ تھا جو آسانی سے سمجھ نہیں آتا تھا۔ آپ کے والد کو بازار کے اندر ایک قبر نما جگہ الاٹ ہوئی جہاں انہوں نے ساری زندگی بتادی۔ آپ کا یہ کھڈا بازار کے بیچ میں تھا اردگرد امرتسریوں کی دکانیں تھیں اس لئے آپ کا کوئی محلے دار بھی نہ تھا رات کو بازار بند ہو جاتا صرف آپ کی کٹیا آباد نظر آتی جہاں آپ دونوں باپ بیٹا ایک دوسرے کی تنہائی کے ساتھی ہوتے۔ اپنے کھڈے کے سامنے والے تھڑے پر آپ کے والد نے چند روپے کی سبزیاں رکھ کر بیچنا شروع کردیں، یہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔ تمہارے قبر نما کمرے میں بمشکل ایک چارپائی آتی تھی کمرے کی پشت پر چولہا رکھنے کی جگہ تھی۔ آپ کے والد آپ کو سکول کے لیے خود تیار کرتے۔ میں سکول جاتے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوئے وہاں رکتا تو وہ مجھے بھی چائے کی پیش کش کرتے۔ آپ سکول میں ہر ایک کے مذاق کا نشانہ بنتے، اساتذہ بھی آپ کو دوسروں کی نسبت زیادہ سزا دیتے۔ پھر آپ نے سکول جانا بند کر دیا، مگر ہماری دوستی قائم رہی۔

آپ کے والد کی آنکھوں میں پیلاہٹ اتر آئی تو معلوم ہوا کہ انہیں یرقان ہو چکا ہے۔ انہوں نے پیروں فقیروں سے جھاڑ پھونک کرائی اور ٹونے ٹوٹکے بھی کیے لیکن افاقہ نہ ہوا۔ اسی بیماری نے آخر ان کی جان لے لی۔

علم دین ماڑو کے مرنے کے بعد آپ بالکل تنہا ہو گئے۔ گاؤں سے ستر میل دور رہنے والے رشتے داروں نے آپ پر ترس کھایا اور آپ کی شادی ہو گئی۔ آپ کی بیوی بھی اسی کھڈے میں آ گئی، جہاں آپ کے والد نے دم دیا تھا۔ پھر اللہ نے تمہیں بیٹوں سے نوازا اور وہ بچے بھی اب جوان ہو چکے ہیں اور اسی جگہ پر رہ رہے ہیں۔

محمد شریف ماڑو صاحب! آپ کی وفات کا سن کر میں ماضی میں کھو گیا۔ آپ بچپن سے پنج وقتہ نمازی تھے ہر ایک سے مسکرا کر ایسے بات کرتے تھے جس میں لجاجت کا پہلو نمایاں ہوتا بچپن سے آپ پر خوف خدا طاری تھا۔ بچے آپ کو آخرت سے ڈرا کر آپ سے کھانے پینے کی چھوٹی موٹی چیزیں اڑا لے جاتے۔ بچے آپ سے کہتے کہ اگلے جہان میں پل صراط سے گزرنے کے لئے ہماری سفارش کی ضرورت ہو گی کیونکہ ہم پیرزادے اور مخدوم زادے ہیں۔ اگر ہم نے مدد نہ کی تو تم اس دنیا کی مشکلوں سے تو نجات پا لو گے مگر آخرت میں کیا کرو گے۔ وہاں پر بھی ہماری سرداری چلے گی۔ تم آخرت کے خوف سے انہیں کچھ نہ کچھ دے کر سمجھتے کہ جب اس دنیا کے دکھ درد سے نجات مل جائے گی تو آنے والی زندگی آرام سے گزرے گی۔

میں نے گاؤں سے ملاقات کے لئے آنے والوں سے پوچھا کہ اب تمہارے بچوں کی گزر بسر کیسے ہو رہی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ جو ٹھیلا تم نے ورثے میں چھوڑا تھا تمہارے بچوں نے اس پر سبزیاں بیچنا شروع کر دیں ہیں۔ اب وہ سڑکوں پر مارے مارے پھرتے ہیں۔ انہی قاتل سڑکوں پر، جہاں ایک ٹرک نے تمہیں مار ڈالا تھا، بچوں کو ہر گزرتے ہوئے ٹرک سے یقیناً خوف آتا ہو گا۔ انہیں اپنے والد کی خون سے لتھڑی ہوئی لاش بھی سامنے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پڑی ہوئی نظر آتی ہوگی، مگر ان کے پاس اس کے علاوہ چارہ ہی کیا ہے کہ وہ گاہک اور موت کا انتظار کریں اور انہی اندھے راستوں پر چلتے رہیں، جنہوں نے آج تک کسی کو منزل پر نہیں پہنچایا۔ تمہارا خاندان پاکستان کو محفوظ گھر سمجھ کر یہاں آیا تھا۔ شروع میں لوگ آپ کو مہاجر کی بجائے پناہ گیر کہتے تھے، یعنی اب تم ایک ایسی جگہ پر پہنچ گئے ہو جہاں تمہیں پناہ مل گئی ہے۔

پاکستان کے بارے میں تمہارے بڑوں نے جو خواب دیکھے تھے، وہ خواب چکنا چور ہو چکے ہیں۔ اس کی ذمہ داری اس سرزمین پر نہیں ڈالی جاسکتی۔ اس ذمہ داری کا بوجھ میرے ضمیر پر ہے۔ اگر ناخدا کشتی بیچ بھنور کے چھوڑ کر کناروں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں تو مسافروں کا ڈوب جانا یقینی ہوتا ہے۔ ہم چونکہ کردار کے غازی نہیں، گفتار کے غازی ہیں۔ اس لئے تمہارے تصور سے باتیں کر کے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔ بوجھ ہلکا کرنے کا محفوظ ترین طریقہ جیل کی زندگی ہے کہ اب تم مجھ سے بحث کر سکتے ہو اور نہ ہی میری گرفت کر سکتے ہو۔

میں نے اپنے آپ کو بچانے کا کیسا راستہ اختیار کیا ہے۔ میری اس چالاکی کی داد کیوں نہیں دیتے۔ تم میری ذہانت کی داد دینے کی بجائے میری توجہ اپنے بچوں کی طرف کیوں مبذول کرا رہے ہو۔ تم تو شرافت سے میری ہر بات پر ایمان لاتے تھے۔ اب تمہاری آنکھوں میں مایوسی اور بے یقینی کے سائے کیوں ہیں؟ کیا تم بھی اب عام آدمی کی طرح سوچنے لگے ہو۔ میں تمہاری خشمگیں آنکھوں کی تاب نہیں لاسکتا۔ ہاں ایک بات تمہیں بتانا بھول گیا۔ کہ میں اپنی بھانجی کے جنازے کو کندھا دینے، پچھلے دنوں، مخدوم رشید گیا تو تمہارے بیٹوں سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ پانچ بھائی ہیں۔ جن میں سے دو شادی شدہ ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ اپنی والدہ کے ساتھ اسی قبر نما کمرے میں رہتے ہیں جہاں ان کے باپ اور دادا رہتے تھے۔ مجھے اب تک یقین نہیں آرہا کہ وہ وہاں کیسے رہ سکتے ہیں؟ ان کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ تم ہی بتاؤ کہیں اس مسکراہٹ میں طنز تو نہیں تھا؟

خدا حافظ، خیر اندیش، جاوید ہاشمی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

روشنی کے مینار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

25 جون 2006ء

محترم حاجی خدا بخش صاحب

السلام علیکم! مزاج بخیر!

آج آپ بہت یاد آئے میرا دل چاہ رہا تھا کہ آپ کو خراج تحسین پیش کروں کیونکہ آپ کی زندگی ایک کامیاب شخص کی زندگی ہے آپ نے محنت اور ہمت سے اپنی دنیا خود بنائی۔

میں نے جب ہوش سنبھالا آپ کو رزق حلال کی تگ و دو میں مصروف پایا۔ آپ صبح سویرے اپنے اوزار لے کر نکلتے اور رات گئے گھر لوٹتے آپ نے اپنی زندگی انتہائی نیک نیت شخص کے طور پر گزاری عموماً آپ کے بھائی ملک اللہ بخش بھی آپ کے ساتھ ہوتے تھے گاؤں کی اکثر عمارتوں کی بنیادوں میں آپ کا خون پسینہ شامل ہے۔ مساجد کی تعمیر اور تزئین میں تو آپ کو ملکہ حاصل تھا۔ مسجدوں کی تعمیر کے وقت آپ اپنا خون جگر بھی اس میں شامل کر دیتے آپ کی چند ایکڑ زمین تھی لیکن آپ کی گزر اوقات راج مزدوری پر تھی۔ آپ نے اپنے دونوں بیٹوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی آپ کے بڑے بیٹے ملک محمد نواز میرے استاد ہیں جو بطور ہیڈ ماسٹر ریٹائرڈ ہو گئے۔ چھوٹے بیٹے غلام مرتضیٰ میرے ہم جماعت تھے وہ بھی سکول میں استاد ہیں۔ آپ کے کردار کی وجہ سے گاؤں کے لوگ آپ کا دل سے احترام کرتے تھے۔ اپنے گھر کے ساتھ مائی والی مسجد کے انتظام و انصرام میں بھی آپ کی خصوصی دلچسپی تھی۔

آپ کے بیٹے ملک محمد نواز نے زیادہ تر مخدوم رشید ہائی سکول میں سروس کی، ان کی شہرت ایک محنتی دیانتدار اور مخلص شخص کی ہے، وہ خوش شکل اور خوش لباس شخصیت کے حامل ہیں، وہ ایک اچھے منتظم کے طور پر جانے جاتے ہیں، طالب علمی کے دور میں بھی وہ انتہائی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

محنتی اور سنجیدہ شخصیت کے مالک تھے۔ ملک محمد نواز نے اپنے بچوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی۔ ان کے ایک بیٹے نے فوج میں کمیشن لیا اور اب بطور میجر قوم کی خدمت کر رہے ہیں ملک محمد نواز اور غلام مرتضیٰ سے جب آپ کی تعزیت کے لئے گیا تو وہ آپ کی جدائی کے غم میں ڈوبے ہوئے تھے آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ نے اپنی اولاد کو رزق حلال کا نوالا کھلایا۔ اللہ نے آپ کو اس کے بدلے میں سعادت مند اولاد سے نوازا آپ نے کبھی احساس محرومی کا رونا نہیں رویا میں نے آپ کے چہرے پر ہمیشہ سکون کی کیفیت دیکھی۔ آپ کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ جفاکشی کی وجہ سے آپ کے چہرے پر کبھی ملال نہ تھا اور نہ ہی آپ کبھی کسی کے خلاف شکوہ سنج ہوئے بلکہ آپ کی زندگی ایک شکر گذار بندے کی طرح تھی جو ہر حال میں خدا کی ذات پر راضی رہتا ہے آپ نے ساری زندگی قناعت پسندی اپنائے رکھی۔

علم کی دولت کی وجہ سے میں نے آپ کے دروازے پر گاؤں کے بڑے سے بڑے لوگوں کو دستک دیتے دیکھا ہے اور آپ کے بچوں نے بھی اس دولت کو تقسیم کرنے میں کنجوسی نہیں برتی۔ آپ کے بھتیجے فیض بخش اور ماسٹر گل محمد نے بھی زندگی تعلیم و تدریس میں گزار دی۔ ان کے پاس علم کی طاقت ہے جس کی وجہ سے وہ بڑے زمینداروں سے بھی زیادہ اہم ہیں معاشرے میں ان کے مقام سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

جناب ملک خدا بخش صاحب! میں رات کے تین بجے آپ سے اس لئے مخاطب ہوں کہ آپ لوگوں نے خون جگر دے کر حوصلے اور ہمت کی داستان کو رنگین بنایا ہے آپ کی یہ کامیابی معمولی نہیں ہے۔ ایسا معاشرہ جہاں سر اٹھا کر چلنے کی رسم نہیں آپ نے اس معاشرے کو اپنا دست نگر بنایا یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے آپ لوگ میرے ہیرو ہیں۔ مولانا محمد رمضان انصاری ڈاکخانہ کا کام بھی چلاتے تھے اور سارا دن سلائی مشین پر لوگوں کے کپڑے سیتے تھے، ان کا صاحبزادہ حبیب انصاری گاؤں کا پہلا فرد تھا جس نے ایم اے کیا اور پھر ایل ایل بی کر کے وکالت کی۔ ان کے دوسرے بیٹے سعید انصاری نے بطور سکول ٹیچر لوگوں تک علم کی روشنی پہنچائی۔ اب مولانا کے پوتے ڈاکٹر ہیں وکیل ہیں، سپیشلسٹ ہیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور اعلیٰ عدالتوں میں کام کرتے ہیں۔

قاضی حق نواز کی شخصیت میرے سامنے ہے جو علمی مباحثوں میں حصہ لیتے رہے سید عطاء اللہ کی تقاریر سے متاثر ہو کر نوجوانی میں فرنگی راج کے خلاف ہو گئے وہ اللہ کے سوا کسی کی حاکمیت نہیں مانتے انہوں نے اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی ان کے صاحبزادے طارق عزیز نے اسلام آباد یونیورسٹی سے جرنلزم میں ایم اے کیا ان کی صاحبزادیاں زیور تعلیم سے آراستہ ہیں۔ وہ ساری ساری رات کپڑوں پر کشیدہ کاری کرتے دن کو بھی آرام نہ کرتے میں ان کی زندگی سے متاثر ہوئے بغیر کیسے رہ سکتا تھا؟ اور رانا فجر علی نے انتہائی مشکل حالات سے گزر کر بچوں کو پڑھایا ان کے تین بیٹوں میں سے ایک پولیس کے اعلیٰ عہدیدار ہیں دوسرے پی آئی میں ہیں اور تیسرے بھی سرکاری ملازمت کرتے ہیں، ملک محمد بخش جو میرے استاد تھے ان کے بچے بھی مختلف شعبہ ہائے زندگی میں لوگوں کو فیض پہنچا رہے ہیں اسی طرح ان کے عزیز ماسٹر عبدالمالک اور حاجی حق نواز کا صاحبزادہ رب نواز جو باصلاحیت نوجوان ہے وہ بھی علم کی روشنی بانٹ رہا ہے۔ استاد محمد شریف عرفی کے والد جو زندگی بھر درخت کاٹنے کی مزدوری پر گزارا کرتے رہے اور ان کی والدہ نے لوگوں کے گھروں میں کام کر کے بچوں کو تعلیم دلائی۔

ملک اللہ بخش نے محنت مزدوری کر کے اپنے بیٹے ڈاکٹر محمد ظفر کو اعلیٰ تعلیم دلائی اکنامکس میں ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد عالمی بنک کے مشیر کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ حافظ بشیر احمد ایک اور ایسی مثال ہیں جن کے والد خواجہ محمد بخش نے انہیں تنگ حالات کے باوجود تعلیم دلائی وہ سکول ٹیچر ہیں اب ان کی بیٹی نے جرنلزم میں ایم اے کیا ہے۔

میں دیانتداری سے سمجھتا ہوں آپ لوگ روشنی کے مینار ہیں جن نامساعد حالات سے گزر کر آپ نے کامیابیاں حاصل کیں یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ جس معاشرے میں غریب آدمی کا کوئی نام نہیں اس معاشرے میں دولت کے پجاریوں کو اپنا دست نگر بنا لینا ایک لائق تحسین عمل ہے یقیناً مخدوم رشید اور ارد گرد کی بستیوں کے چھوٹے زمینداروں کے بچے بھی پڑھ لکھ کر ملک اور قوم کی خدمت کر رہے ہیں اور مثبت سوچ کو آگے بڑھا رہے ہیں لیکن جو ہمت آپ کے طبقے کے لوگوں نے کی ہے وہ ایک انقلاب کے درجے کے برابر ہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آپ انقلابی لوگ ہیں اور جس معاشرے میں یہ انقلابی روح پیدا ہو جائے وہ معاشرہ کبھی تہی دامن نہیں رہ سکتا بلکہ ایسا معاشرہ ہی ترقی اور خوشحالی کی بلندی تک پہنچتا ہے۔

والسلام!

خیر اندیش!

جاوید ہاشمی!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ذہن کی غلاظت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم تاج مسیح صاحب

السلام علیکم! مزاج بخیر!

کئی روز سے آپ اور آپ کی بیوی اللہ رکھی مجھے بہت یاد آ رہے ہیں، حالانکہ آپ کو اس دنیا سے رخصت ہوئے بیس پچیس سال ہو گئے ہیں۔

آپ ایک انتہائی محنتی شخص تھے اور اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ آپ میں صبر اور تحمل کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، یہی اوصاف آپ کی بیوی اللہ رکھی میں بھی تھے۔

آپ کے بھائی باری اور بھابھی زینتے نے بھی وہی پیشہ اختیار کر رکھا تھا جو آپ کا تھا، لیکن زینتے کام کرتے ہوئے بڑبڑاتی رہتی، وہ اور اس کا خاوند تند خو تھے جب کہ آپ ان سے بالکل مختلف۔

آپ کا خاندان کہیں سے آ کر مخدوم رشید کے ہسپتال کے عملہ صفائی میں بھرتی ہو گیا اور پھر ہمیشہ کے لئے یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ اب تو آپ کی قبریں بھی اسی دھرتی میں ہیں۔ آپ کے سات بیٹے تھے۔ جن میں سے برکت مسیح پہلی، دوسری جماعت تک میرے ساتھ پڑھتا رہا، پھر اس نے تعلیم سے منہ موڑ لیا اور چھوٹی عمر میں ہسپتال کی صفائی والے عملے میں بھرتی ہو گیا۔

تاج مسیح صاحب اپنے کنبے کا پیٹ پالنے کے لئے آپ نے گاؤں کے چند گھروں سے گندگی صاف کرنے کا کام شروع کر دیا۔ آپ جب سر پر گندگی کی ٹوکری اٹھا کر گزرتے تو لوگ منہ دوسری طرف پھیر لیتے۔ آپ نے اپنے چہرے کو کپڑے سے ڈھانپ رکھا ہوتا تھا تا کہ بدبو سے بچ سکیں۔ ڈاکو بھی چہرہ اسی طرح ڈھانپتے ہیں اور معاشرے میں خوف کی علامت بن جاتے ہیں۔ لوگ ڈاکوؤں سے خوفزدہ بھی ہوتے ہیں اور ان سے نفرت بھی کرتے ہیں۔ آپ مجھے ہمیشہ اچھے لگتے تھے جب آپ ہمارے گھر میں صفائی کے لئے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آتے، میں آپ کے ہاتھ دھلاتا، آپ کے لئے کھانا لاتا، آپ کو اس دوران کچھ آرام بھی مل جاتا اور پھر آپ اپنے کام پر روانہ ہو جاتے۔ بڑھاپے کے باوجود میں نے آپ کو کبھی کام سے جی چُراتے نہیں دیکھا۔

آپ کی بیوی رکھی بہت نیک دل عورت تھی۔ وہ ہر جمعہ کو ہمارے گھر سے آٹا لینے آتی تو میری والدہ سے دکھ سکھ بانٹتی۔ میری والدہ اس سے عزت و احترام سے پیش آتیں۔ ایک مرتبہ آپ بیمار تھے، والد محترم ہمیں ساتھ لے کر آپ کی بیمار پرسی کے لئے آپ کے کوارٹر پر گئے آپ کی بیوی نے بہت دعائیں دیں۔ آپ ہوش میں نہیں تھے معلوم نہیں آپ کو کیا بیماری تھی آپ کی آنکھیں باہر کو اُبل رہی تھیں۔ آپ نے کچھ روز بعد اپنی جان جان آفرین کے حوالے کر دی، میں آپ کی تجہیز و تدفین میں شامل تھا۔

آپ کی وفات کے بعد رکھی بھی زیادہ دیر تک زندہ نہ رہی۔ علاقے میں نئے ہسپتالوں کا جال بچھا تو آپ کے بچوں کو درجہ چہارم کی نوکریاں مل گئیں اور وہ بہتر زندگی گزارنے لگے انہوں نے گھروں میں صفائی کا کام بند کر دیا بعد میں تمہارے دو پوتے محمود اور لیاقت مسیح کونسلر منتخب ہو گئے...... یونین کونسلوں میں ان کے آگے پیچھے پھرنا پڑتا۔ جمہوریت کی طاقت رنگ لا رہی تھی۔ جو لوگ ان کو قریب کھڑا نہیں ہونے دیتے تھے، اپنی مجلس میں شامل کرتے، کھانا پینا اکٹھے ہو گیا، شادی غمی میں بھی برابر کے شریک رہنے لگے۔ تم بھلے مانس تھے۔ اللہ نے تمہاری اگلی نسل کو تمہاری نیک نیتی کا صلہ دیا۔ آپ کے پوتے لیاقت مسیح نے 1990ء کے انتخاب کے اقلیتی نشست پر ایم پی اے کا انتخاب لڑا۔ میں نے اس کی بھرپور مدد کی۔ چونکہ پورا صوبہ اس کا حلقہ انتخاب تھا۔ میں نے جھنگ، رحیم یار خان اور لاہور سے اسے ووٹ دلوائے لیکن وہ چند ووٹوں سے یہ الیکشن ہار گیا۔ اگر وہ جیت جاتا تو میری طرح اسمبلی کا ممبر ہوتا۔ تمہارا پوتا محمود اب بھی ہمارے پینل سے کونسلر منتخب ہو کر علاقے کی خدمت کر رہا ہے۔ شاید میں ماضی کا ذکر نہ کرتا مگر میں آپ کے کام کو عار نہیں سمجھتا، اس لئے اس کام کے ذکر میں بھی کوئی عار نہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہندوستان کے شہر دہلی میں صفائی کا عملہ زیادہ تر مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ دبئی، ابوظہبی اور سعودی عرب میں صفائی کا زیادہ تر کام پاکستانی، بنگالی اور ہندوستانی مسلمان کرتے ہیں۔ مکہ اور مدینہ میں تو اس کام کو عبادت سمجھ کر بھی کیا جاتا ہے۔ آپ کے آنے سے پہلے مخدوم رشید میں ہندو یہ کام کرتے تھے اور ملتان شہر میں تو سارا کام بالمیکی ہندوؤں کے سپرد ہے۔ دنیا بھر میں اقلیتوں سے اس طرح کے کام کرائے جاتے ہیں۔ فلش سسٹم آنے کے بعد اور نکاسی آب کے منصوبوں کی کامیابی نے بہت سارے انسانوں کو اس اذیت ناک کام سے نجات دلا دی ہے۔ اگر نظام بنا لیا جائے تو انسان کی تذلیل کے تمام راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ پانچ سو سال پہلے نکاسی آب کا نظام بنانے والے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

پاکستان کی مسیحی برادری اور دوسری اقلیتوں نے پاکستان کی بہت خدمت کی ہے۔ کرنل ٹریسلر، کرنل ہربرٹ بلوچ جیسے انسانوں نے پاکستان سے ٹوٹ کر محبت کی ہے۔ جے سالک اور مشتاق وکٹر تو میرے قریبی ساتھی بھی رہے ہیں۔

کاش سارے پاکستانی پاکستان سے اتنی محبت کر سکیں۔ جتنی ہمارے ان ساتھیوں نے کی ہے۔ مگر تاج مسیح صاحب میں آپ کی محنت اور ذہانت کو ان وزراء کی پاکستانیت سے کم نہیں سمجھتا۔

جے سالک نے اپنی کتاب کے لئے مجھے کچھ لکھنے کو کہا میں اس تحریر کو اس خط کا حصہ بنا رہا ہوں۔

جے سالک اور میں کئی مرتبہ قومی اسمبلی میں قوم کی نمائندگی کرتے رہے ہیں۔ ہم دونوں اپنی اپنی جماعتوں کی نمائندگی کرتے رہے۔ وفاقی وزیر بھی رہے۔ جے سالک نے جماعتی وابستگی سے بالاتر ہو کر قوم کی خدمت کی ہے۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ مذہبی وابستگیوں سے بلند ہو کر انسانیت کی خدمت اور عظمت کے لئے کام کرتے ہیں۔ ان کی باتوں میں مٹھاس ہوتی ہے اور جذبوں میں اخلاص، وہ شعلہ بھی ہیں اور شبنم بھی۔

اپنے موقف کے اظہار کے لئے وہ مختلف انداز اختیار کرتے ہیں۔ کبھی وہ جوگی بن کر درد کی جوت جگاتے ہیں، اور کبھی زندہ مصلوب بن جاتے ہیں، کبھی بوریا نشین ہوتے ہیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور کبھی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ماتم کناں۔ قوم پر جب کوئی مصیبت آئے وہ درد کی چلتی پھرتی تصویر بن جاتے ہیں انہوں نے کبھی مذہبی منافرت کو اپنی سیاست کی بنیاد نہیں بنایا، مگر اقلیتوں پر ظلم کے خلاف وہ شعلہ جوالہ ہوتے ہیں۔ جب یورپ، امریکہ یا بوسینیا میں مسلمان اقلیتوں پر ظلم ہو تو جے سالک مسلمانوں کی حمایت میں سب سے توانا آواز ہوتے ہیں۔ اہل علم نے اپنے اپنے انداز سے انہیں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ ان پر لکھی گئی تحریروں کو کتابی صورت میں چھاپا جا رہا ہے۔

اہل قلم نے ہمیشہ انہیں اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ جے سالک کو توجہ اپنی طرف مبذول کروانے کا جو فن آتا ہے وہ کسی اور کو نہیں آ سکتا۔

تاج مسیح صاحب خدا آپ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے! جمہوریت ایک ایسا نظام ہے جو ٹوکری اٹھانے والے کے پوتے کو اس ملک کے بالا دست اداروں تک پہنچاتا ہے ووٹ کی طاقت بندوں کی گولی کی طاقت سے کتنی زیادہ ہے۔ اسلام اور مسیحیت نے انسان کو مساوات کی تلقین کی ہے دنیا کا کوئی مذہب انسانی تفریق میں یقین نہیں رکھتا صرف اچھے کام کی وجہ سے کوئی بڑا بنتا ہے مذاہب انسان کی عظمت کے گیت گاتے ہیں۔ جمہوریت نہ ہی مذہب اور نہ ہی کمیونزم کی طرح کوئی نظریہ ہے مگر جمہوریت ایک ایسے طرز زندگی کو اختیار کرنے کا حق دیتی ہے جہاں انسان کو مساوات اور عظمت آدم کے خوابوں کی تعبیر مل جاتی ہے۔ اس میں ٹوکری اٹھانے والے اور دنیا کے دولت مند ترین انسان کو ایک دوسرے کی عزت اور احترام کا سبق ملتا ہے۔ معاشی مساوات کے چشمے بھی اسی احتسابی عمل سے پھوٹتے ہیں۔

تاج مسیح صاحب میں آپ سے باتیں کرتے ہوئے ہسپانیہ کے دارالحکومت میڈرڈ کو تصور میں لے آیا، جہاں میں آخری مرتبہ 1998ء میں گیا تھا۔ مجھے اپنے سفارت خانے کی صفائی کرنے والی میریم (مریم) سے ملایا گیا جو نہ صرف کمروں کی صفائی کرتی تھی بلکہ تمام غسل خانوں کے فلش اور کموڈ بھی چمکاتی تھی۔ اس کے والد سپین کی اسمبلی کے ممبر تھے۔ میں اس سے انٹرویو کرتا رہا، وہ کہنے لگی، ہم نے پہلے اپنے ذہن کی غلاظت کو صاف کیا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میرے والد اپنے فرائض سرانجام دیتے اور میں اپنے۔ ہم نے ایک ایسا نظام ذہنی طور پر قبول کیا جس میں میرے بچے بھی اس بات پر شرمندہ نہیں ہونگے کہ ان کی ماں کسی سفارت خانے کے کموڈ چمکاتی تھی۔ اس نے کہا میرا ایک بیٹا ہے، وہ اعلیٰ اداروں میں تعلیم حاصل کر رہا ہے، کہتا ہے میں نے سیاست میں جانا ہے جبکہ مجھے سیاست بالکل پسند نہیں ہے۔ اگر کل کو وہ سپین کا وزیر اعظم بن جائے تو وہ فخر سے کہہ سکتا ہے کہ وہ ایک ایسی ماں کا بیٹا ہے جس نے رات دن محنت مزدوری کر کے انسانیت کی خدمت کی۔

تاج مسیح صاحب مجھے میریم میں آپ کی بیوی اللہ رکھی نظر آنے لگی جو مجھے ہمیشہ باوقار لگتی تھی۔ آپ دونوں کی جوڑی صابر اور قناعت کرنے والوں کی جوڑی تھی، اللہ رکھی جب کونسلر بنی اسے دوسرے فریق نے ووٹ کے لئے دولت کی پیش کش کی۔ اس نے کہا تم دنیا جہاں کے خزانے لا کر بھی میرا ضمیر نہیں خرید سکتے۔ میریم اور اللہ رکھی کے کردار مجھے بہت تقویت دیتے ہیں۔ میں انسان کے اس روپ کے سائے میں کڑی دھوپ میں ٹھنڈک محسوس کر رہا ہوں۔

خدا حافظ تاج مسیح صاحب

والسلام

آپ کا خیر اندیش

جاوید ہاشمی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حدیثِ دل

www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یومِ پاکستان اور بھٹکے ہوئے راہی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

23 مارچ 2006ء

میمونہ بی بی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

کمرہ ملاقات میں احباب جمع تھے، وہ پاکستان کے حالات سے دلبرداشتہ نظر آئے۔ اُنکی تسلی کیلئے میں نے کہا کہ میں نے گذشتہ چالیس سالوں میں شاہی قلعہ لاہور C.I.A سٹاف مُلتان، چوہنگ، چونا منڈی اور لاہور کے اکثر ٹارچر سیلوں میں جسمانی تشدد کا سامنا کیا ہے، ہر طرح کی صعوبتیں برداشت کی ہیں، مگر ایک لمحے کیلئے بھی پاکستان کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوا۔ مجھے کامل یقین ہے کہ پاکستان ہی اس خطے میں ایسا ملک ہے، جو علاقے کے دیگر ممالک کی راہنمائی کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس ملک کا بلوچ، ایران کے بلوچوں میں جا کر آباد ہونے کا تصور نہیں کر سکتا، حالانکہ نسل اور تہذیب کے اعتبار سے ایرانی بلوچ اور اِس میں کوئی فرق نہیں۔ اِس حقیقت سے بھی اِنکار نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستان کے بلوچ کو قومی دھارے میں جو مقام حاصل ہے وہ ایران کے بلوچ کو وہاں کبھی حاصل نہیں رہا۔ اسی طرح کابل کا پٹھان پاکستان کے پٹھانوں کو برابری کا مقام دینے کو تیار نہیں۔ پاکستان کا پٹھان بھی کابلی پٹھان کو قبول نہیں کرتا۔ حالانکہ زبان، نسل، تہذیب اور مذہب کے اعتبار سے وہ ایک ہیں۔ ایران کا بلوچ اور افغانستان کا پختون، آپ کو کراچی میں ہر جگہ نظر آئیگا مگر پاکستانی بلوچ اور پٹھان نہ کابل قندھار میں ملے گا اور نہ بندر عباس اور تہران میں۔

ایران سے پاکستان آکر بسنے والے بلوچوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ افغانستان سے پاکستان آئے ہوئے افغانیوں کو پاکستان کے کسی بھی حصے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں کے سندھی نے تمام صوبوں سے پہلے بمبئے ریجنسی سے آزادی کی جنگ لڑی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہاں کا پنجابی ہندوستانی پنجاب میں جا کر آباد ہونے کا ڈراونا خواب دیکھنے کو تیار نہیں۔ نہ ہی وہ جالندھر، ہوشیار پور یا کسی اور شہر میں جا کر گھر بسانا چاہتا ہے۔ اُردو بولنے والے اگر یہاں ایک کروڑ ہیں تو ہندوستان میں آج بھی پندرہ بیس کروڑ کے لگ بھگ مسلمان موجود ہیں۔ فرض کریں اگر پاکستان نہ بنتا تو کیا پاکستان آنے والے دو کروڑ مہاجرین کا حال ان بیس کروڑ مسلمانوں سے زیادہ مختلف ہوتا جن کا وجود اب بھی ہندوستان میں ناقابل برداشت ہے؟۔ گجرات کے فسادات، مقبوضہ کشمیر میں ظلم وستم اور بابری مسجد کے واقعات کی وجہ سے آج پاکستان بنانا پڑتا تو نصف صدی کی تاخیر کا جوابدہ کون ہوتا؟۔

تقسیم سے پہلے پنجاب، سندھ اور سرحد کے وزرائے اعلیٰ مسلمان تھے۔ بلوچستان کو صوبہ کا درجہ 1970ء میں ملا۔ اسی طرح بنگال اور آسام کے علاقے جو بعد میں پاکستان کہلائے، وہاں بھی وزرائے اعلیٰ مسلمان تھے۔ مشرقی بنگال اور آسام کے کچھ اضلاع پر مشتمل مشرقی پاکستان 1971ء میں بنگلہ دیش بن گیا۔ یہ علاقے مسلمانوں کی اکثریت کی وجہ سے اپنی الگ شناخت رکھتے تھے، مگر معاشی طور پر ان علاقوں کے مسلمان ہندوؤں کے دست نگر تھے۔ انارکلی لاہور میں مسلمانوں کی صرف تین دکانیں تھیں۔ موجودہ شمال مشرقی پنجاب کے بڑے زمیندار، ایک دو مسلمان گھرانوں کے علاوہ تمام سکھ تھے۔ موجودہ جنوب مغربی پنجاب کے بڑے زمیندار مسلمان تھے مگر وہ انگریز کے گماشتے اور ہندو کے مقروض تھے۔ وہاں کا عام مسلمان دوہری کی بجائے تہری غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا تجارت میں یہی حال راولپنڈی، ملتان، پشاور، کراچی، حیدرآباد اور کوئٹہ کا تھا۔ موجودہ پاکستان کے تمام شہروں بلکہ چھوٹے چھوٹے قصبوں میں بھی ہندوؤں کی تعداد کم نہ تھی۔ مسلمان زیادہ تر دیہی علاقوں میں رہتے تھے۔ موجودہ ہندوستان کے تمام علاقوں میں ہندوؤں کی اکثریت تھی اس لئے وہ مذہبی اور سماجی طور بھی بالا دست تھے۔ اگرچہ مسلمانوں کے چند خاندان وہاں کے علاقوں میں بااثر بھی تھے اور مالی طور پر مضبوط بھی تھے۔ وہاں کے مالدار مسلمان بھی زیادہ تر انگریز کے وفادار تھے۔ صرف متوسط طبقہ پاکستان کا حامی تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اب یہاں سے ایک بھی اُردو بولنے والا دہلی جا کر ایسے حالات میں نہیں رہنا چاہتا جیسے حالات میں وہاں کے بیس کروڑ مسلمان رہ رہے ہیں۔ یہاں کا کشمیری ہندوؤں کے قبضے والے کشمیر سے بہتر زندگی گذار رہا ہے۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ سرحد کا پختون ریڈیو کابل کے گیتوں کو روح کی غذا سمجھتا ہے، پنجابی امرتسر ٹی وی دیکھنا چاہتا ہے، اردو بولنے والا بھی ہندوستان کے اردو گیتوں کو خوش ہو کر سنتا ہے، بلوچوں کو ایران سے موسیقی کا تحفہ بھی نہیں ملتا، اسی طرح سندھی ثقافت کو بھی پاکستان میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ حضرت لطیف بھٹائی اور سچل سرمست کی شیرینی صرف پاکستان میں ہے، ہندوستان اس سے محروم ہے۔ یہ جنت ارضی ہے۔ لیکن ہر پاکستانی شکوہ گذار بھی ہے۔ جب تک پاکستان کے معاملات کو چلانے کے لئے برابری کی سطح کی سوچ پر پہرے بٹھا کر کسی ایک صوبے کی بالادستی کا سلسلہ اپنایا جائے گا، جنت فردوس کو چھوڑ کر آنے والا انسان اِس جنت ارضی میں کیسے خوش رہ سکے گا؟۔

1857ء کی جنگ آزادی میں شکست کے بعد مسلمان اپنے مستقبل کے بارے میں مایوس ہو گئے تھے۔ ہندوؤں کیلئے یہ واقعہ محض (Change of Masters) آقاؤں کی تبدیلی سے زیادہ اہمیت کا حامل نہ تھا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں نے کوئی ایسا مثالی نظام قائم کرنے کی کوشش نہیں کی، (نہ تو اسلام کا نظام عدل ہندوستان میں متعارف کرایا گیا اور نہ ہی معاشی مساوات کیلئے کوئی کام ہوا)۔ مسلمان حکمرانوں نے وہی طرزِ حکمرانی اختیار کیا جو شہنشاہیت کے دور کا حصہ تھا بلاشبہ مسلمان حکمرانوں کا طرزِ حکومت ہندوستان کی تاریخ کے ماضی کے حملہ آوروں سے کہیں بہتر تھا، مگر وہ کوئی مثالی طرزِ حکومت کہلانے کا حقدار نہیں۔ جب تبدیلی آئی تو آہستہ آہستہ ہندو اکثریت انگریز کو اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگی۔ انگریز نے، چونکہ، حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی لہٰذا اس کے مظالم کا نشانہ بھی مسلمان بنے۔ اُن کا کوئی پرسان حال نہ رہا۔ اِکا دُکا مزاحمتی تحریکیں چلانے کی کوشش نے انگریزوں کو مسلمانوں کیخلاف مواد مہیا کر دیا تو سرسیّد

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جیسے مصلحین نے بیچ بچاؤ کی کوشش کی اور مسلمانوں کو جدید حالات سے ہم آہنگی پیدا کرنے کیلئے انگریزی تعلیم حاصل کرنے پر زور دیا۔ اِس جدیدیت پر اُنہیں کفر کے فتووں کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر وقت نے اُنکے منصوبوں کی حقانیت واضح کر دی اور علی گڑھ کی تحریک نے تحریک پاکستان کی بنیاد رکھی۔

1885ء میں انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کا بانی ایک انگریز تھا جس کا نام ڈگلس ہیوم تھا کانگرس نے آہستہ آہستہ جی حضوری کی سیاست ترک کر کے جنگ آزادی میں بھرپور حصہ لیا اور اُس کے راہنماؤں نے قربانیوں کی عظیم مثالیں قائم کیں۔ کانگرس نے 1905ء میں تقسیم بنگال کے خلاف ہندو موقف کی حمایت کرتے ہوئے اس کی تنسیخ کا مطالبہ کیا چنانچہ مسلمانوں نے انگریز کی سرپرستی میں قائم ہونے والی اس جماعت کو شک کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا۔

30 دسمبر 1906ء کو ڈھاکہ میں نواب سلیم اللہ کے گھر میں محمڈن ایجوکیشن کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں ایک قرارداد منظور کی گئی، جس کے ذریعے آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ سر آغا خان کو اُسکا پہلا صدر منتخب کیا گیا۔ مُسلم لیگ کے مخالفین آج تک مسلم لیگ اور پاکستان کے قیام کو انگریز کی سازش کہتے ہیں۔ اُنہیں اگر یہ کہا جائے کہ کانگرس کا تو قیام ہی ایک انگریز کا مرہون منت ہے تو چُپ ہو جاتے ہیں۔ مُسلم لیگ کے قیام کو ایک سو سال ہو گئے ہیں۔ آج 23 مارچ ہے۔ میرے پاس اِس بات کا کوئی جواب نہیں کہ جس مقام پر آج کے دِن مسلمانانِ ہندو پاک نے ایک قرارداد کے ذریعے علیحدہ وطن حاصل کرنے کا اعلان کیا تھا، اُسی مقام پر اِس ملک کا کمانڈر انچیف قائداعظم کے فرمان کے خلاف، آئین کے تحت اُٹھائے ہوئے حلف کی دھجیاں اُڑا رہا ہے۔ کیا پاکستان اِسی مقصد کیلئے حاصل کیا گیا تھا؟ ہم مسلم لیگ کا جشن صد سالہ منا رہے ہیں۔ آئین کے بجائے بندوق ہم پر حکومت کر رہی ہے، کہیں ہم بھٹکے ہوئے راہی تو نہیں جن کی منزل اُنہیں ایک سو سال سے تلاش کر رہی ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قیام پاکستان سے ذرا پہلے قائداعظمؒ نے صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے متبادل تجاویز قبول کر لیں، مگر ہندو قیادت مسلمانوں کو داخلی آزادی دینے کو بھی تیار نہ تھی۔ ساٹھ سال ضائع کرنے کے بعد ہندوستانی قیادت وہیں کھڑی ہے۔ وہ کشمیر میں قبضے کو طول دینے کے لئے پر اربوں کھربوں خرچ کر رہی ہے، اپنے تمام ہمسایوں پر دھونس جمانے کیلئے دفاعی اخراجات میں اضافہ کرتی ہے۔ جس کی وجہ سے ترقی کی دوڑ میں آگے نہیں جا سکی، جس کی توقع اُس سے کی جا سکتی تھی۔ ہندو کو ایک ہزار سال بعد آزادی نصیب ہوئی۔ اسے دنیا میں خود کو ایک عظیم قوم کے طور پر منوانے کا موقع ملا مگر اس کی قیادت کے غیر ذمہ دارانہ رویوں سے یہ موقع کھویا گیا ہے۔

انڈین نیشنل کانگرس کا بانی ڈگلس ہیوم (DUGLUS HUME) انگریز تھا، جبکہ مسلم لیگ نواب سلیم اللہ خان، آغا خان اور دیگر مسلم اکابرین نے قائم کی۔ اسی طرح جب پاکستان بن رہا تھا، نہرو، پٹیل اور دوسرے کانگرسی راہنماؤں نے سنجیدہ رویہ اختیار کرنے کے بجائے بار بار بیانات دیئے کہ پاکستان بننے دو، انہیں ایک دو سال کے اندر سمجھ آجائیگی، پھر یہ ہندوستان میں شمولیت کیلئے بھاگتے ہوئے آئیں گے۔ اس وقت ہم انہیں قبول نہیں کریں گے، قائداعظم نے یہ چیلنج قبول کر لیا۔ پاکستان آج ایک زندہ و پائندہ حقیقت ہے۔ مگر ہندو قیادت نئے دور کے چیلنج کا سامنا نہیں کر سکی۔

والسلام!

تمہارا والد!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سرخ اور کالے گلاب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

8 جنوری 2006ء

بُشریٰ جی!

السلام علیکم!

کیا حال ہے تمہارا؟ میں آج بہت خوش ہوں، ابوالقاسم کافی دنوں کے بعد ملنے آیا تھا۔ یکم دسمبر کو وہ پانچ سال کا ہو گیا مگر باتیں بوڑھوں کی طرح کرتا ہے۔ پچھلی مرتبہ آیا تو پوچھ رہا تھا کہ جیل پولیس والے مارتے تو نہیں؟ آج کہہ رہا تھا میں جیل میں رہنے کیلئے آیا ہوں۔ آمنہ نے بتایا ملتان سے آتے ہوئے سارا راستہ یہی کہتا رہا کہ میں اب جیل میں بابا سائیں کے پاس رہونگا۔ کہنے لگی، میں نے اسے کہا! میرے والد نے ساری زندگی اسی طرح گذار دی، اب تمہارے ارادے بھی اچھے نہیں لگتے۔ میں نے آمنہ سے کہا! میں خوش ہوں کہ جس مقصد کیلئے میں نے جدوجہد کی اس کے جراثیم آنیوالی نسلوں میں سرایت کر گئے ہیں۔

دوسری خوشی اس بات کی ہے کہ آج میمونہ کو گاڑی مل گئی۔ گذشتہ 6 سال میمونہ نے بسوں میں دھکے کھاتے ہوئے گذارے۔ تمھاری والدہ بیماری کی حالت میں سردیوں اور گرمیوں میں ملتان سے طویل سفر کر کے راولپنڈی اور لاہور کی جیلوں میں ملاقات کیلئے پہنچتی رہی۔ خود تمہیں اور تمہاری بہنوں کو بھی انہی مشکلات کا سامنا تھا۔ مجھے آپ سب کا بس پر آنا کبھی ناگوار نہیں گذرا۔ لیکن مجھے اعتراف کرنے دو کہ گاڑی کا انتظام ہونے پر میں بہت خوش ہوں۔

ممتاز خالد صاحب اکثر میری ملاقات کیلئے جیل آتے رہے۔ ایک دن کہنے لگے! جدہ اور مکہ مکرمہ میں ہمارا کاروبار ہے، میں اگر کسی کام آسکوں تو حاضر ہوں۔ میں نے انھیں میاں نواز شریف کے نام خط دیا کہ یہ جماعت کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ میاں صاحب

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے ان کی ملاقات ہوگئی۔ واپس آ کر انہوں نے مجھ سے ملنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا، ایک موقع پر کہنے لگے، آپ جیل میں بیٹھے ہیں، میں جماعت کے علاوہ آپ کی خدمت کیلئے بھی حاضر ہوں۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا، مگر ان کا اصرار کئی مہینے جاری رہا۔ انہوں نے میری ضرورتوں کا خیال رکھا، جس کے لئے میں ان کا ممنون ہوں۔ میں نے جب میمونہ سے کہا کہ تمہارے لئے گاڑی کا انتظام ہو گیا ہے تو وہ کہنے لگی، اب تو ہم بسوں پر سفر کے عادی ہو گئے ہیں، ہمارے لئے یہ کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ میں اُسکی کم گوئی کا فائدہ اٹھا کر اس سے مذاق کرتا رہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ باقی تو سب ٹھیک ہو گیا لیکن مجھے خدشہ ہے کہ وہ بس کمپنی کہیں خسارے میں نہ چلی جائے جس پر تم سب نے سفر کا عالمی ریکارڈ قائم کیا۔ ملتان سے لاہور، لاہور سے ملتان پھر ملتان سے اسلام آباد اور اسلام آباد سے لاہور کا سفر زمین گول ہونے کے ثبوت کیلئے کافی ہے۔ عدالتوں کی پیشیاں، جیل کی ملاقاتیں، میری رہائی کے جلسوں میں حاضری، اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کا فریضہ، پارٹی اجلاسوں میں حاضری اور جماعتی سرگرمیوں کو ہر حالت میں جاری رکھا۔ معلوم نہیں نسبتاً آرام دہ سفر اسکی صحت پر کیا اثرات مرتب کرتا ہے۔ میمونہ میرے استدلال سے محظوظ ہوتی رہی۔ ہاں میں تمہیں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ میں نے قاسم کو پھولوں کا ایک گلدستہ بنا کر دیا۔ اس میں تمام پھول شامل تھے، جو میں نے گذشتہ دس ماہ میں جیل میں اگائے۔ اس میں نیلے، پیلے، اودے، سفید، سرخ، اور کالے گلاب بھی تھے۔

والسلام!

تمہارا والد!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

زلزلہ زدگان اور درد کے رشتے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

11 جنوری 2006ء

بُشی جی !

السلام علیکم!

یہ عید بھی آپ سے ملے بغیر گذر گئی۔ گذشتہ چھ سال میں شاید ہی ہم نے کبھی کوئی عید اکٹھے منائی ہو۔ پچھلی عید میمونہ نے راولاکوٹ اور بالاکوٹ کے زلزلہ زدگان کے ساتھ گذاری۔ اب کے مومنہ اور جویریہ کو سردیوں کی چھٹیاں ہونے لگیں تو کہا میں انھیں زلزلہ زدہ علاقوں میں لے جاؤنگی۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔ یہ خوشی عید سے کم نہیں کہ میرے بچوں کے دل اپنے مصیبت زدہ بہن بھائیوں کے ساتھ ہیں۔ آج میری طبیعت پر سخت بوجھ تھا۔ عید کے دن شمالی وزیرستان اور بلوچستان میں چلنے والی گولیوں کی گونج نے میرے دل کو دہلا دیا۔ تڑپتی لاشوں نے مجھے بہت رُلایا۔ یہ کس کا خون بہہ رہا ہے، کس کی عاقبت نا اندیشی نے بھائی کو بھائی کے سامنے لاکھڑا کیا، میرے سامنے پڑے ہوئے گلدستے سے ایک پھول مرجھا کر گرا تو پورے گلدستے کے رنگ پھیکے لگنے لگے۔ میں اُٹھ کر باغیچے میں چلا گیا۔ ایسے لگا جیسے پھولوں سے خون ٹپک رہا ہو۔ مجھے اپنی ساری تکلیفیں بھول گئیں۔ سچ تو یہ ہے میں تمہیں بھی بھول گیا۔ تم لوگ آج کیسے عید مناؤ گے، مجھے اِس سے کوئی غرض نہ تھی۔ مجھے اِن پانچ سالوں میں نمازِ عید پڑھنے کی کبھی اجازت نہیں ملی لیکن عید کے روز جیل کے چند قیدی احباب کو میرے پاس آنے کی اجازت ہوتی ہے۔ اس سے زہرِ تنہائی کم کرنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ میں چاہ رہا تھا آج کوئی میرے پاس نہ آئے۔ میں تنہا رہنا چاہتا تھا۔ میں لان میں کرسی پر ڈھیر ہوگیا۔ میرے برداشتی نے مجھے یاد دلایا چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ میں نے پیالی پر نظر ڈالی مجھے اِس میں خون نظر آیا، بے دلی سے غسل خانے میں جا گھسا۔ اپنے اوپر پانی ڈالا تو محسوس ہوا جیسے کسی مردے کو نہلایا جا رہا ہے۔ کپڑے بدلے تو کفن میں ملبوس ہونے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کا احساس ہونے لگا۔ خوشبو کی طرف ہاتھ بڑھایا تو کافور کی خوشبو کے بھبھاکے سے میرے نتھنوں میں گھسنے لگے۔ میں اپنے آپ کو ایک لاش سمجھ رہا تھا۔ آزاد کشمیر اور ہزارہ کے زلزلہ کے ملبے تلے دبی ہوئی۔ یا سرحد اور بلوچستان کے پہاڑوں پر تڑپتی ہوئی لاش۔

میں جانتا ہوں تمہیں میری کمی محسوس ہوئی ہوگی، مگر آپ سب کو اِس بات کا علم ہے کہ میں آزاد ہوتا تو بھی ان حالات میں آپ کے ساتھ مل کر عید نہ مناتا۔ میں زلزلہ زدگان کے ساتھ ہوتا، یا بلوچستان اور سرحد کی آگ بجھانے کیلئے اپنی چونچ میں پانی کے چند قطرے لے کر وہاں کی اُڑان بھر رہا ہوتا۔ میں اولادِ ابراہیم ہوں، میں آلِ اسماعیل ہوں، میں قافلہِ حجاز میں حُسینیت کے پرچم کا علمبردار ہوں، ہماری ہر عید قربانی کے لازوال اثاثے سے جنم لیتی ہے۔ میری قید کے مرثیہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ آج کی خوشی کو غم میں بدلنے کے بجائے، غم کو قربانی اور ایثار کے جذبے میں ڈھالنا ہوگا، جو اِس مقام پر پہنچ جائے، عید منانے کا حق صرف اُس کو ہے۔ اس عید سے مسرت اور خوشی کے لازوال چشمے پھوٹتے ہیں۔ اس کیلئے ہم سب کا صرف ایک جگہ ہونا ضروری نہیں۔

لندن سے راجہ جاوید نے بتایا! کچھ لوگوں نے کل عید منائی اور کچھ آج منا رہے ہیں۔ میرے لئے اس میں حیرت کی کوئی بات نہ تھی۔ کیونکہ میں نے زمینی حقائق کی قوت کا بارہا مشاہدہ کیا ہے۔ پاکستانی لندن میں بیٹھ کر کعبہ سے جاری ہونے والے حکم کی تعمیل کیلئے تیار نہیں۔ وہ اپنے ملک کے اعلان عید پر عمل کرتے ہیں۔ مردان، چارسدہ کے لوگ انگریز کی حکومت میں رہتے ہوئے بھی کابل کے آزاد اسلامی ملک کے اعلان کے مطابق عید منانے کو ترجیح دیتے تھے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اِسلام نے حج اور عیدین کے وہی رسوم ورواج رہنے دیئے جو پہلے سے موجود تھے۔ فقط جہاں فرد کی حیثیت مذہب سے بالاتر ہو جاتی۔ وہاں سے فرد کو ہٹا کر وقت کو اہمیت دے کر اجتماعیت پیدا کر دی گئی۔ مناسکِ حج میں طواف زیارت کے بعد احرام اتارنے کی اجازت موجود تھی مگر دورِ جاہلیت میں احرام اتارنے کی اجازت ایک قریشی سردار دیتا تھا اِسطرح ہر موقع کا الگ الگ سردار تھا۔ وہ اکثر اپنی اہمیت جتلانے کیلئے حجاج کو زِچ کرتے، اسلام نے ان افراد کی اجارہ داری ختم کر دی اور حکم دیا کہ طواف زیارت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے بعد شام سے پہلے احرام اتارنے کی اجازت عام ہوگی۔ اسلام نے ان رسموں کی فضولیات ختم کردیں اور رسموں کو بامقصد بنادیا۔ مگر مناسکِ حج کو رسُوم ورواج سے متصادم ہونے کی فضا سے احتراز کیا۔ صوفیاء نے بھی وحدانیت کے فلسفے کو قائم رکھتے ہوئے مقامی رسوم ورواج کے ٹکراؤ سے بچاؤ کا راستہ اختیار کیا جسکی وجہ سے اسلام میں عالمگیریت پیدا ہوئی۔

گاؤں جاؤ تو میری ماں کی قبر پر ضرور جانا اور کہنا کہ ماں! تیرا بیٹا کئی سالوں سے حاضری نہیں دے سکا، تیرے پاس نہ پہنچنے کا اُسے دکھ ہے، وہ تیری آغوش کی گرمی کو ایک لمحہ کیلئے بھی نہیں بھولا، تو جس مٹی میں آسودہ خاک ہے اُس نے اُسی مٹی کا قرض چکانے کیلئے خود کو وقف کردیا ہے۔ کہنا ماں! تونے وطن کے ہر ذرے کو کشمیر سمجھ کر اس سے محبت کا درس دیا، خود تکلیف میں رہ کر دوسروں کی تکلیفیں دُور کیں۔ اپنی ضرورتوں کو محدود کر کے غریبوں اور حاجتمندوں کی دیکھ بھال کی۔ تو نے اپنے ہونے کو نہ ہونے میں ڈھال دیا۔ اپنے وجود کی نفی پر تم کتنی خوش تھیں۔ ایسے لمحات میں تمہارے چہرے پر ایک ملکوتی تبسم ہوا کرتا تھا، جو چارسو خوشیاں بکھیرتا تھا۔ ماں سے پوچھنا: کیا میں وہی کچھ نہیں کر رہا جس کا اس نے درس دیا تھا۔ وہ میری کوتاہیوں کو ضرور معاف کردے گی۔ مجھے یہاں بیٹھے اسکی قبر کی مٹی کی خوشبو محسوس ہونے لگی ہے۔ گویا آغوشِ مادر میں ہوں۔

عمران اور سعدیہ نے حج کرلیا۔ اب اپنے بچوں سے ملنے کیلئے بے تاب ہیں، ماہ نور فاطمہ اور محمد بھی ان کے بغیر بہت اُداس ہیں۔ بچوں کے بغیر ان کی یہ عید زندگی کی سب سے خوبصورت عید ہے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری عید بھی اتنی ہی خوبصورت ہے۔ البتہ ایک بات ہم سب میں مشترک ہے، بغیر والدین کے بچوں کی عید اور بغیر بچوں کے والدین کی عید! کیا یہی بات آزاد کشمیر، ہزارہ، شمالی وزیرستان اور بلوچستان کے بچوں اور ان کے والدین اور ہمارے درمیان مشترک نہیں۔ درد کے رشتے بھی کتنے مضبوط ہوتے ہیں، نہ جانے میں کیوں روزِ عید کو شامِ غریباں میں بدلنے پر تلا ہوا ہوں۔ خدا کرے یہ عید ہم سب کیلئے باعث مسرت ہو!!!

والسلام! تمہارا والد!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

شوقِ شہادت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

14 جنوری 2006ء

بُشریٰ جی!

السلام علیکم!

چودہ جنوری کا دن میری زندگی میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ چالیس سال پہلے ایوب خان کی آمریت کے خلاف پہلی مرتبہ میں جیل یاترا کی۔ آج چالیس سال کے بعد بھی وہیں ہوں۔ عوام کی زندگی کو جیل کی زندگی سے بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہوں تو مجھے جیل میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ تاکہ مجھے بڑی جیل میں رہنے کا سلیقہ آجائے۔ میری اصلاح نہ ہو سکی تو لازم ہو گیا کہ مجھے بار بار اس عمل سے گذارا جائے۔ حکمران اس نکتے کو کیوں نہیں سمجھتے کہ جب تک پوری قوم کی ''اصلاح'' نہ ہو میں خود کو کیسے بدل سکتا ہوں؟

حسبِ معمول میں آج پھانسی گھر کے سامنے سے گذر رہا تھا، دروازہ کھلا دیکھ کر اندر چلا گیا، عملہ صفائی کر رہا تھا۔ شاید کسی کو منطقی انجام سے ہمکنار کرنا مقصود تھا۔ میں تختہ دار کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا اور سوچنے لگا کہ اس رسّی نے کتنے جابروں اور شہ زوروں کی گردنوں کو ماپا ہے۔ ان میں گھروں اور بستیوں کو اجاڑنے والے بھی تھے اور وہ بھی جن کے جانے سے کئی گھر اجڑ گئے۔ کئی لوگ ذاتی انتقام کی بھینٹ چڑھ گئے۔ پھر مجھے وہ لوگ یاد آنے لگے جنھیں نظریات کے اختلاف نے اِس پھندے تک پہنچایا، حضرت عیسیٰؑ کی پھانسی کا منظر میرے سامنے تھا، منصور کے اَناالحق کی آواز بھی سنائی دینے لگی، سقراط زہر کا پیالہ اپنے ہاتھ میں لئے کھڑا تھا، غازی علم دین شہید بھی ناموس رسالت کا پرچم ہاتھ میں لیے کھڑا تھا، بھگت سنگھ کے شور سے جیل کا نظام تہہ و بالا ہو رہا تھا اور ذوالفقار علی بھٹو تو میرے سیل سے یہاں آئے تھے۔ میں سوچنے لگا موت سے ہم آغوش ہو کر یہ لوگ آج تک زندہ کیوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں؟ جواب بہت آسان تھا، ذاتی منفعت یا ذاتی انتقام کیلئے جان دینے والوں کے مقاصد محدود تھے، جبکہ، اپنی سوچ پر قائم رہنے والے افراد اپنی ذات سے بالاتر ہو گئے تھے۔ ان کے جسم کو فنا کر دیا گیا، مگر ان کے نظریات کو نئی زندگی مل گئی۔ پھانسی گھر ساری جیل میں خوف کی علامت ہے۔ ہمسائیگی کی وجہ سے مجھے اس جگہ سے اتنا ڈر نہیں لگا۔

تم خود بتاؤ انسانی زندگی میں جسم کی اہمیت کیا ہے؟ دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا ڈاکٹر اس بات کی گارنٹی تو دے نہیں سکتا کہ میں اگلے ایک منٹ تک ضرور زندہ رہونگا۔ میں نے سینکڑوں لوگوں کو دیکھا ہے، جو خاندانی رنجشوں کی وجہ سے سزائے موت پا چکے ہیں۔ کئی بے گناہ افراد بھی پھانسی کے تختے پر جھول گئے، کئی عدالتی نظام کی خرابی کی وجہ سے سالہا سال سے جیل میں پڑے سڑ رہے ہیں، میں انہی افراد میں سے ایک ہو سکتا تھا، یا یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میرا جسم کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہو کر کسی ہسپتال کے بستر پر پڑا ہوتا، میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے میری زندگی میں مقصدیت کا عنصر داخل کر دیا۔ جیل میں آ کر اپنے تندرست والد سے ملاقات تمہیں بہتر لگتی ہے یا ہسپتال کے بستر پر درد سے کراہتے ہوئے اور ایک ایک سانس گن گن کر زندہ رہنے والے لاشے سے۔ خدا کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے۔ جن کی زندگی صرف اپنے لئے ہو، اس سے وہ موت کئی درجے بہتر ہے جو دوسروں کی بہتری کیلئے آ جائے۔ میں اپنی موت کو دیکھ سکتا ہوں، اسکا سامنا کر سکتا ہوں اور یہ بھی سمجھتا ہوں کہ کسی مقصد کیلئے مرنے والا مر ہی نہیں سکتا۔ میں روز اپنے باغیچے کے پھولوں کو کھلتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ وہ جب پوری طرح کھل جاتے ہیں تو موت کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ پہلے وہ مرجھاتے ہیں اور پھر اُسی مٹی کا رزق بن جاتے ہیں، جس مٹی سے نکلے تھے مگر وہ حُسن جو پھول کو پھول بناتا ہے، کبھی نہیں مرتا۔ اگر پھول کا رشتہ مرتے دم تک ٹہنی سے قائم رہے تو اس کی مرجھائی پتیوں کے نیچے بننے والا بیج نئی زندگی میں ڈھل جاتا ہے۔

میں لالہ صحرا نہیں، مگر صحرائی ہونے کی وجہ سے فطرت نے میری حنا بندی ضرور کی ہے۔ میں نے کب تصور کیا تھا کہ چالیس سال کی صحرا نوردی کرونگا۔ میں بنی اسرائیل بھی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نہیں ہوں۔ اسلئے اس جدوجہد کو چالیس سالہ سزا نہیں مانتا۔ مجھے سنگلاخ زمین پر چلتے ہوئے اپنوں کی سنگ زنی کا شکوہ بھی نہیں ہے۔ مجھے شاید بنایا ہی ایسا گیا تھا۔ میرے لئے روحانی خوشی کا خزانہ اسی سفر میں دریافت ہونا تھا۔ میں ہر حالت میں خدا کی مرضی پر صابرو شاکر ہوں۔ احباب سے اعزاز کے ساتھ دفنائے جانے کی خواہش بھی نہیں۔ پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھتا ہوں تو میرا سر اللہ کی بارگاہ میں جھک جاتا ہے۔ میری زندگی میں مشکلات آئیں مگر میری ناکامیوں نے ہمیشہ کامیابیوں کا دروازہ کھولا۔ مجھے قدم قدم پر نعمتوں سے نوازا گیا۔ میں نے اتنی محنت نہیں کی جتنا پھل ملا۔ میں خلوص نیت کو سب سے بڑی نعمت سمجھتا ہوں۔ دوسروں کے بارے میں جتنا بہتر سوچیں گے اور ان کی مشکلات دور کرنے کیلئے محنت کرینگے، اتنا ہی آپکی ذاتی زندگی خوبصورت ہوتی جائیگی، مجھے یقین ہے کہ دوسروں کے بارے میں مثبت سوچ آپکی ذہنی اور جسمانی بیماریاں دور کر دیتی ہے۔ میں نے مشکل پسندی میں زندگی کا راز پایا ہے۔ اپنے لئے اور اپنے آنیوالے ادوار کیلئے مشکل فیصلے کرنے میں دیر نہیں لگانی چاہئے۔ اکثر مشکلات کامیابی کا پیغام لاتی ہیں اور موت زندگی کا! اصل چیز انسان کا کردار ہے، انسان کے جسم سے اسکا کردار زیادہ دیر تک زندہ رہتا ہے۔ جسم قربان کر کے کردار بچانا ہی شہادت ہے۔

والسلام!

تمہارا والد!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چاچا منگتو خان رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

15 جنوری 2006ء

میمونہ بی بی!

السلام علیکم!

خبر ملی ہے کہ چاچا منگتو خاں (رحمتہ اللہ علیہ) اس دنیا میں نہیں رہے۔ یقیناً تم نہیں جانتی کہ منگتو خاں کون ہے؟ یہ میرا بھی چاچا ہے اور تمہارا بھی۔ اسے آخر دم تک میرا نام پورا نہیں آتا تھا، وہ مجھے "ہاشی جوائد" کہہ کے پکارا کرتے تھے۔ میں 1985ء کے الیکشن میں چالیس کلومیٹر کا سفر کر کے حلقہ انتخاب کے آخری گاؤں میں پہنچا تو ہمراہیوں کے چہرے پہچاننا مشکل تھا۔ راستہ کچا ہونے کی وجہ سے ہم دھول سے اَٹے ہوئے تھے۔ میں نے گاڑی کے شیشے میں جھانکا تو اپنے آپ کو اجنبی لگا، چہرہ مٹی کے غازے کی تہہ میں دبا ہوا تھا۔ گاؤں کے پرائمری سکول میں داخل ہوئے تو لوگ ہمارے استقبال کیلئے موجود تھے۔ ایک چھوٹے سے جلسے کا اہتمام کیا گیا تھا، میں نے لوگوں سے کہا کہ اگر منتخب ہو گیا تو آپ کے گاؤں کیلئے پختہ سڑک بنوا دونگا۔ مجمع سے ایک درمیانے قد کا اُدھیڑ عمر کا آدمی، جس کی داڑھی میں سفید بال تھے اور آنکھوں پر نظر کا چشمہ کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا! ہمیں آپ کی باتوں میں سچائی کی بو آئی ہے۔ آپ وعدہ کریں کہ ہمیں ہائی سکول بنوا دیں گے۔ یہ میرا چاچا منگتو خاں سے پہلا باقاعدہ تعارف تھا۔ میں نے وعدہ کر لیا اور میری کامیابی کے بعد اُن کے گاؤں میں سکول قائم ہو گیا۔

میں نے اپنے حلقہ انتخاب میں ایک سو سے زائد ہائی سکول اور کئی تعلیمی ادارے کھلوائے۔ لیکن جتنا خوش میں نے مومن آباد کے چاچا منگتو کو دیکھا اور کسی کو نہیں دیکھا۔ میں 1996ء تک اسی حلقے سے انتخاب میں حصہ لیتا رہا، جب بھی اس گاؤں میں جاتا چاچا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

منگتو میرے استقبال کرنے میں پیش پیش ہوتا۔ میں اس کے گھر جاتا تو وہ مجھے گڑ کی چائے زبردستی پلاتا۔

چاچا منگتو گاؤں کی ڈاک بھی تقسیم کرتا تھا۔ جونہی میں گاؤں میں داخل ہوتا، وہ تمام کام چھوڑ دیتا، اپنی لاٹھی اٹھا کر سب سے آگے چلنا شروع کر دیتا اور میری انتخابی مہم کا ہراول دستہ بن جاتا۔ اُس کی چال سے لگتا کہ وہ لاٹھی کا سہارا نہیں لے رہا بلکہ لاٹھی کا پیچھا کر رہا ہے، ہر دروازے پر دستک دیتا اور میرے لئے ووٹ مانگتا۔ آخری الیکشن میں وہ بیمار تھا، اِس کے باوجود چلتے ہوئے ہمیں پیچھے چھوڑ جاتا، میں منع کرتا تو کہتا! آپ نے اِس دُور دراز علاقہ کے لوگوں کو جو تحفہ دیا ہے، ہم اِس کا شکریہ ادا نہیں کر سکتے۔ آپ ہزاروں میل دور ہوں تو میری نگاہیں آپکو دیکھ سکتی ہیں، پھر کہتا یہ نگاہیں مرتے دم تک کسی اور طرف نہیں دیکھیں گی۔ 2002ء کے انتخاب میں حکومت نے میرے حلقہ انتخاب کو چار ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ میرا وہ حلقہ، جہاں میں نے 20 سال تک ہر دروازہ کھٹکھٹایا، میرے پاس نہ رہنے دیا گیا۔ وہاں کے انسان تو ایک طرف، جانوروں اور درختوں سے بھی میری شناسائی تھی۔ چاچا منگتو کا گاؤں اب میرے حلقہ انتخاب میں نہیں ہے۔ چاچا منگتو نے کہلا بھیجا، میں مرنے والا ہوں، یاد رکھنا جب میں مروں گا تو میری آنکھیں تمہیں دیکھتی ہونگی، کیونکہ تم نے ہمارے علاقہ کے لوگوں کو علم کا نور دیا۔ میں چشم تصور سے چاچا منگتو کے جسدِ خاکی کو دیکھ رہا ہوں، اِسکے چہرے کی مسکراہٹ ہمیشہ کی طرح موجود ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے وہ اب بھی میری طرف دیکھ رہا ہے۔

میں تمہیں خط لکھ رہا تھا تو اعلان ہوا کہ کویت کے حکمران جناب جابر الاحمد الجابر الصباح کا انتقال ہوگیا، میں انکی تدفین کا منظر دیکھتا رہا۔ قوم کیلئے اُنکی 23 سالہ خدمات کا تذکرہ خاصا طویل تھا، جس دردمندی کیساتھ انہوں نے فلسطین، افریقہ اور ہندو پاکستان کے مسلمانوں کی خدمت کی اِسکا ذکر بھی تفصیل سے کیا گیا یقیناً یہ بہت بڑے آدمی کی موت تھی۔ ٹیلی ویژن کے اناؤنسر نے کویت کے امیر کا نام ادب سے لینا شروع کیا اور آخر میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اُس نے شیخ جابر الاحمد الجابر الصباح رحمتہ اللہ علیہ کہا۔

منگتو خاں ایک غریب آدمی تھا۔ اس نے ایک سکول ملنے کی خوشی تمام عمر منائی، اگر اس کے پاس امیر کویت جیسے وسائل ہوتے تو یقیناً انہیں تعلیم پر خرچ کر دیتا۔ میں چاچا منگتو کو چاچا منگتو خاں رحمتہ اللہ علیہ لکھ کر خراجِ تحسین پیش کر رہا ہوں۔ تم بھی اسے آج سے اسے چاچا منگتو خاں رحمتہ اللہ علیہ کہنا۔

والسّلام!

تمہارا والد!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پانچ ہزار بچے!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

13 جنوری 2006ء

بُشی جی!

السلام علیکم!

آج میمونہ سے گپ شپ ہوتی رہی، اس نے جویریہ اور مومنہ کو انکے کالج میں چھوڑا اور مجھے ملنے کیلئے آ گئی۔ وہ میری چالیس سالہ جدوجہد کے سلسلے میں ہونیوالے جلسہ میں شرکت کرے گی۔ میمونہ 6 سال میں پہلی مرتبہ کار میں لاہور آئی، مومنہ اور جویریہ بھی ہمیشہ بس سے اُتر کر رکشہ میں کالج جاتی تھیں، وہ بھی آج اپنی کار پر کالج کے دروازے پر پہنچیں۔ میں نے اس فرق پر خیالی فیچر بنا کر تمہاری بہنوں کو سنایا، وہ بہت محظوظ ہوئیں۔ میں نے کہانی یوں شروع کی کہ میمونہ کار پر لاہور آ رہی ہے، قریب سے اس کمپنی کی بس گذری جس پر وہ چھ برس سے سفر کرتی رہی ہے۔ اُس کو تعجب ہوا کہ لوگ اتنا لمبا سفر بسوں پر کیسے کر لیتے ہیں؟ پھر اُسے اس بات پر غصہ آیا کہ محکمہ ماحولیات والے کہاں سوئے ہوئے ہیں؟ ڈیزل چھوڑتی بسوں کو بند کیوں نہیں کر دیتے، پھر اُس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا، اُسے بس میں سفر کرنیوالے مسافر بھی غریب غرباء قسم کے نظر آنے لگے، اُسے بس کے حجم پر بھی اعتراض تھا جو ٹریفک میں رکاوٹ کا باعث بن گیا، پھر یہ بھی بہت بڑی خامی تھی کہ بس نہ کالج کے دروازے تک جاتی ہے اور نہ قومی اسمبلی کے استقبالیہ تک۔ جب وہ لاہور سے واپس ملتان پہنچی تو اپنے آپکو چاند سے اُترنے والے خلانوردوں کے روپ میں دیکھ رہی تھی۔ میمونہ میری باتوں پر مسکراتی رہی پھر سنجیدگی سے کہنے لگی، اگر یہ بس کمپنی نہ ہوتی تو شاید آپ سے ملاقات کیلئے آنا بھی مشکل ہو جاتا۔ میں نے اسے کہا! مجھے اپنے رب پر بھروسہ ہے، اگر یہ بسیں نہ ہوتیں تو وہ ہوائی جہاز پر سفر کا انتظام کر دیتا۔ ہماری سوچیں محدود ہیں، دینے والے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی عطا کی وسعتوں کا احاطہ ہمارا محدود علم کیسے کرسکتا ہے۔ دورانِ گفتگو مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ میمونہ کی تنظیم کے زیرِ اہتمام تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کی تعداد پانچ ہزار سے زیادہ ہوگئی ہے۔ آمنہ نے بتایا کہ میمونہ کی سیاسی سرگرمیوں اور میرے مقدمہ کی مصروفیت کی وجہ سے اب ان اداروں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اب اُسکے پاس ہے وہ قانون کے آخری سال کے امتحان کی تیاری بھی کررہی ہے۔ M.B.A کے بعد L.L.B کرنے سے آمنہ کے ویژن (VISION) میں مزید وسعت آئیگی۔ یہ ذاتی اور اجتماعی میدان کی کامیابیاں غریب بچوں کے کام آنی چاہئیں۔ پانچ ہزار بچوں کی تعلیم سے دیہاتی زندگی میں انقلاب آجائے گا۔ میں یہ جان کر اور بھی خوش ہوگیا کہ بیواؤں کیلئے بیت المال کا کام میمونہ نے تمہارے سپرد کردیا ہے۔ امید ہے کہ تم اس کارِ خیر کو دل لگا کر کروگی۔ ذمہ داریوں کے بوجھ سے انسان کے جوہر کھلتے ہیں۔ تمہاری جو تربیت مجھ سے نہ ہوسکی، میمونہ انتہائی دانشمندی سے اِس کمی کو پورا کررہی ہے۔

والسّلام!

تمہارا والد!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انتقالِ اقتدار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

16 جنوری 2006ء

میمونہ بی بی!

السلام علیکم!

آج شدید سردی کی وجہ سے۔ بستر سے چمٹا رہا۔ مشقتی کافی بنا کر لایا، چند گھونٹ پیئے تو کسل مندی سے چھٹکارا حاصل ہوا۔ گرم چادر لپیٹے باہر آیا تو دیکھا کہ آج پرندے کم ہیں۔ میں نے انہیں دانہ ڈالا، مالی نے خوبصورت گلدستہ بنا کر پیش کیا، اخبارات کے مطالعہ سے فارغ ہوا تو قاری صاحب قرأت سکھانے کیلئے تشریف لائے۔ رحمت شاہ آفریدی صاحب اور میں نے مل کر سبق سنایا اور پھر دیر تک مذہبی معاملات پر گفتگو ہوتی رہی۔

گیارہ بجے کے قریب وارڈر نے اطلاع دی کہ ملاقاتی آئے ہوئے ہیں۔ میں کمرہ ملاقات میں پہنچا تو شہر کے کچھ سیاسی کارکن منتظر تھے۔ وہ سیاسی جماعتوں اور سیاسی راہنماؤں کے رویے سے مایوس تھے۔ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ جن ممالک میں جمہوریت کا بول بالا ہے۔ وہاں بھی ابتدائی مراحل میں اِسی صورت حال کا سامنا تھا، جماعتیں تبدیل کرنا روز کا معمول تھا۔ چرچل (CHURCHILL) جیسا سیاستدان وفاداریاں تبدیل کرنے میں بدنام تھا۔ جسے ہماری زبان میں لوٹا کہتے ہیں، چرچل اس کی زندہ تصویر تھا۔ فرانس (FRANCE) میں 1944ء سے 1956ء تک اکیس حکومتیں بنیں۔ سپین (SPAIN) اور جرمنی میں کئی مرتبہ پارلیمنٹ کی عمارت کو جلایا گیا۔ جمہوریت اتنی کمزور تھی کہ اس کی کوکھ سے (HITLER) ہٹلر کی آمریت نے جنم لیا۔ اٹلی (ITALY) میں گزشتہ 37 سال میں 76 حکومتیں بنائی اور گرائی گئیں۔ جن ملکوں کے سیاستدانوں کی لوٹ مار اور محلاتی سازشوں کی وجہ سے دنیا کو کئی مرتبہ جنگ کی ہولناکیوں کا سامنا کرنا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پڑا، اب اِن ملکوں میں جمہوریت کے پودے کی جڑیں گہرائی میں جا چکی ہیں۔ اگرچہ ہر ملک کا نظام جمہوریت دوسرے ملک سے مختلف ہے مگر بنیادی اصول وہی ہے، کہ تمام انسانوں کو برابری کی سطح پر مواقع مہیا کیے جائیں۔ مذہب رنگ و نسل کی تمیز کے بغیر تعلیم کے دروازے سب کیلئے کھلے ہوں، عدالتی نظام میں انصاف کو یقینی بنایا گیا ہو، زمینی حقائق کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے نظام حکومت کی تشکیل کی گئی ہو۔ برطانیہ کا پارلیمانی نظام، جسے جمہوریت کی روح کہا جاتا ہے، فرانس میں ناکام ہو جاتا ہے۔ وہاں صدارتی نظام ہی کامیاب حکومت فراہم کرتا ہے۔ فرانس کا صدارتی نظام اہل جرمنی کو قبول نہیں۔ انہوں نے اپنے حالات کے مطابق چانسلر اور پارلیمنٹ کے اختیارات کا تعین کیا ہے۔ جرمنی کے لئے کامیابی کا مژدہ سنانے والا یہ نظام سویٹزرلینڈ (Switzer Land) میں اجنبی بن جاتا ہے، وہاں اجتماعی قیادت کے تحت ایک کونسل امورِ حکومت چلاتی ہے اور باہمی مشاورت سے فیصلے کیے جاتے ہیں۔ سویٹزرلینڈ کو دنیا کا امیر ترین ملک بنانے والا یہ نظام اٹلی میں فیل ہو جاتا ہے، وہاں مخلوط نظام حکومت کامیاب ہے۔ یہی قصہ (AUSTRIA) آسٹریا اور دیگر ممالک کا ہے۔ امریکہ (USA) نے جو سیاسی نظام اپنایا ہے اور جسکی وجہ سے وہ دنیا پر حکمرانی کر رہا ہے اسکا یہ نظام شاید ہی کسی دوسری قوم نے قبول کیا ہو۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ سیاسی نظام وہی قبول ہوتا ہے جسکی حیثیت عوام نے طویل عرصہ کے عمل سے گذرنے کے بعد قبول کر لی ہو۔ اگر کوئی نظام اوپر سے مسلط کیا جائے تو وہ ناکام ہو جاتا ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں اہل برطانیہ نے اپنے غلاموں کو آزادی کے مراحل سے گذارتے ہوئے انتقال اقتدار کا جو نقشہ تیار کیا تھا اس میں پارلیمانی نظام کو وقعت حاصل تھی، اور عوام بھی اِس نظام کو ذہنی طور پر قبول کر چکے تھے۔ اِس لئے پاکستان میں صدارتی نظام کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں۔

ہمارے مُلک میں فوجی حکمرانوں نے صدارتی نظام کو اوّلیت دی لیکن عوام کو جب بھی موقع ملا انہوں نے پارلیمانی نظام کو ترجیح دی۔ ذوالفقار علی بھٹو بھی صدر رہنا چاہتے تھے مگر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انہیں بھی عوام کی خواہش کے آگے سر جھکانا پڑا۔ یورپ اور امریکہ میں عرصہ دراز سے سیاستدانوں کی اہمیت کو تسلیم کرلیا گیا ہے۔ ان ملکوں کے آئین میں سیاسی کارکن بنانے کیلئے اداروں کے قیام کو ضروری قرار دیا گیا۔ سیاسی جماعتوں کو مضبوط کرنے کیلئے حکومت کی طرف سے قومی بجٹ میں فنڈز مہیا کئے گئے۔ سیاسی جماعتوں کے کارکنان کی تربیت کیلئے سرکاری سطح پر ادارے قائم کئے گئے۔

فرانس میں بار بار حکومتیں تبدیل ہوئیں، اس طوائف الملوکی کے دور میں نہ سول بیورو کریسی نے مداخلت کی اور نہ فوجی بیوروکریسی نے۔ انہوں نے کہا، یہ سیاستدانوں کا معاملہ ہے، ہم نے ان کے حکم کی تعمیل کرنی ہے۔ اسی لئے فرانس کی بیوروکریسی کو فرانس کی جمہوریت کی ماں کہا جاتا ہے۔ جرمنی میں نئی اور پرانی سیاسی جماعتوں کی سرگرمیوں کو بڑھانے کیلئے فنڈز کی فراہمی کی ذمہ داری حکومت کے کندھوں پر ہے۔ سیاستدانوں کے وجود کو نہ صرف خوش دلی سے قبول کرلیا گیا بلکہ اُن کی بالادستی کو بھی دل سے تسلیم کیا گیا۔ انتقالِ اقتدار کا صاف شفاف نظام قائم ہونے سے ان ملکوں کی تقدیر بدل گئی اور انہیں ساری توجہ عوام کی بہتری پر مرکوز کرنے کا موقع مل گیا۔ ہمیں روز نئے تجربات سے گذرنا پڑتا ہے جسکی وجہ سے ملک میں استحکام پیدا نہیں ہوسکا۔ یہ عدم استحکام ملکی معیشت کی تباہی کا باعث بن گیا ہے اور ہم ابھی تک غربت جہالت اور بیماریوں میں گھرے ہوئے ہیں۔

جن قوموں نے پُرامن انتقالِ اقتدار کا نظام بنالیا ہے اور اس نظام پر سختی سے کاربند ہیں وہی قومیں ترقی یافتہ کہلاتی ہیں۔ جمہوریت کا یہ کارنامہ باقی تمام کارناموں سے بڑا ہے کہ اقتدار کے حریفوں کے ہاتھ سے تلوار لیکر انہیں الفاظ کے ذریعے حصولِ اقتدار کیلئے ایک بہت بڑے ہال میں بٹھا دیا جاتا ہے، جسے پارلیمنٹ ہاؤس (Parliment House) کہتے ہیں۔ اُنہیں آئینی طور پر یہ حق بھی دے دیا جاتا ہے کہ حکومتوں کو گرانے کیلئے اُنکی کارکردگی پر بھرپور تنقید کریں، اور عوام کو دلائل سے قائل کریں کہ اگر موجودہ حکومت کی بجائے اُنہیں موقع دیا جائے تو وہ عوام کی زیادہ خدمت کرینگے۔ اِن بحثوں میں تلخیاں بھی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوتی ہیں اور غصے کا اظہار بھی، عوام بطور جج دونوں کی کارکردگی پر نظر رکھتے ہیں اور جب چار یا پانچ سال بعد فیصلہ اُنکی عدالت میں آتا ہے تو جسے وہ چاہیں اُسکے سر پر اعتماد کا تاج رکھ دیتے ہیں۔ آمریت میں انتقالِ اقتدار طاقت کے ذریعے ہوتا ہے اور جمہوریت میں انتخابات کے ذریعے۔

والسّلام!

تمہارا والد!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

زیتون کی شاخ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

18 جنوری 2006ء

میمونہ بی بی!

السلام علیکم!

کیسی ہو تم؟ میں تو آج بہت تھک گیا۔ کئی برسوں سے عدالتوں کے دھکے کھا رہا ہوں۔ آج بھی صبح سویرے تیار ہو کر باہر نکلا، درختوں پر نظر پڑتے ہی مجھے اپنے زیتون کے پودے یاد آنے لگے، سنا ہے کافی بڑے ہو گئے ہیں۔ تمہاری والدہ نے زیتون کے دانے بوتل میں بند کر کے بھیجے۔ میں نے جب اپنے ہاتھ کے لگائے ہوئے زیتون کھائے تو بہت اچھا لگا۔ میں دِل میں فاطمہ زہرہ کا شکریہ ادا کرتا رہا، جس نے مراکش سے خاص اہتمام کیساتھ اِن پودوں کو بھجوایا تھا۔ زیتون کے پودوں کی یاد آتے ہی مجھے یاسر عرفات کی یاد آئی جس نے اقوام متحدہ میں داخلے کے وقت ایک ہاتھ میں زیتون کی شاخ اٹھا رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ میں پستول۔ اُس نے کہا زیتون کی شاخ امن کی علامت ہے، اگر آپ نے اسے قبول نہ کیا تو پھر اپنی حفاظت کیلئے ہتھیاروں کا سہارا لینا پڑیگا۔ اسرائیلیوں اور اُس کے سرپرستوں نے اس شاخ کو جھٹک دیا، نتیجہ سب کے سامنے ہے۔

پانچ تالے کھلنے کے بعد مجھے پولیس کی گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ اسکے آگے دو گاڑیاں تھیں اور پیچھے مزید چھ سات گاڑیاں۔ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے ڈی ایس پی (DSP) نے بتایا 70 پولیس والوں کی زیرنگرانی آپکا یہ قافلہ عدالت جائیگا۔ ہم عدالت پہنچے تو انصاف کے دروازے کو بند پایا۔ خود دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئے۔ عدالت سنسان پڑی تھی۔ عدالت کے ریڈر نے 3 فروری کی پیشی ڈال دی۔ میرے وکیل کے پہنچنے سے پہلے ہی کارروائی مکمل تھی اور ہم واپس جیل جانے کیلئے تیار۔ باہر نکلے تو مسلم لیگ کے بے شمار

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کارکن سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے سڑک پر کھڑے تھے۔ میں نے فتح کا نشان بنایا تو وہ دور تک گاڑی کیساتھ بھاگتے رہے، پولیس اُنہیں پیچھے دھکیلنے لگی، مگر وہ رکنے والے کہاں تھے۔ فوٹوگرافر تمام مناظر کو کیمرے کی آنکھ میں بند کرتے رہے۔ ہماری گاڑی آگے نکل گئی۔ کارکن پیچھے رہ گئے۔ میں واپس اپنے بیت الحزن میں پہنچ گیا۔ پھر وہی دشتِ تنہائی تھا اور وہی خار مغیلاں تھے۔ ہاں یہ بات بتانا بھول ہی گیا کہ جب میں عدالت کے برآمدے میں کھڑا تھا کچھ اخبارات کے نمائندے چھپتے چھپاتے مجھ تک پہنچ گئے اور باجوڑ پر امریکی حملے کے بارے میں میرے خیالات جاننا چاہے۔ آج اخبارات میں امریکی جہازوں کی پاکستانی علاقے باجوڑ پر میزائل داغنے کی وجہ سے اٹھارہ بے گناہ افراد کی شہادت کی خبر نمایاں تھی۔ امریکیوں نے اپنے اِس عمل پر نہ صرف معذرت کرنے سے انکار کردیا بلکہ اعلان کیا کہ وہ اسطرح کی مزید کارروائیاں کریں گے۔ اُنہوں نے یہ انکشاف کر کے حکمرانوں کے چہرے سے نقاب سَرکا دیا وہ کہہ رہے تھے اِس کارروائی کی تمام تفصیلات سے پاکستانی حکام کو پہلے ہی آگاہ کردیا گیا تھا۔ کچھ اخبارات نے یہاں تک لکھا کہ امریکی حکام کا دعویٰ ہے کہ اس کارروائی میں پاکستانی حکام براہِ راست شریک تھے۔ تصویر اتنی واضح تھی کہ اِس پر مزید تبصرے کی گنجائش نہ تھی۔

میں کئی مرتبہ اس بات کو برملا لکھ چکا ہوں کہ امریکہ اس خطے میں موجود پٹرول اور گیس کے وسیع ذخائر پر اپنا کنٹرول چاہتا ہے۔ وہ مختلف حیلوں بہانوں سے خون کی ہولی کھیلتا رہتا ہے۔ تازہ ترین حکمت عملی یہ ہے کہ ایران پر حملے کی راہ ہموار کی جائے۔ اِس مقصد کیلئے پاکستانی حکمرانوں کو ڈرا دھمکا کر پاکستان کی سرزمین کو اسی طرح استعمال کیا جائے جیسے افغانستان پر حملے کیلئے کیا گیا تھا۔ صدر بش کے والد اور جان کیری (JOHN KERRY) سمیت دیگر امریکی اعلیٰ قیادت کا اسلام آباد میں ایک ہی وقت جمع ہونا محض اتفاق نہیں ہے۔ پاکستانی فوجی حکمران امریکی مفادات کے تحفظ کیلئے کسی حد تک بھی جاسکتے ہیں مگر ایران کے خلاف امریکی عزائم کو پورا کرنا اِن کے بس میں نہیں۔ جنرل ضیاء الحق کو امریکہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نے عراق، ایران جنگ کے دوران ایران کے خلاف استعمال کرنا چاہا۔ ضیاء الحق کے انکار سے نہ صرف اُنکے اقتدار کا خاتمہ ہوا بلکہ انہیں اس دنیا سے بھی جانا پڑا۔

اگر پرویز مشرف نے ایران کے معاملے میں کوئی ایسا قدم اٹھایا تو عین ممکن ہے پاکستان کی فوج اندرونی دباؤ کا شکار ہو جائے۔ فوجی قیادت اپنی اس کمزوری کی وجہ سے امریکی ایجنڈے کو آگے بڑھانے سے قاصر ہے۔ ورنہ ایک فون ہی کارآمد ہو سکتا تھا۔ امریکی قیادت کو اتنا طویل سفر کر کے پاکستان آنے کی زحمت نہ اٹھانا پڑتی۔ امریکہ حسب توقع فوجی حکمرانوں پر دباؤ بڑھا رہا ہے۔ میں ٹیلی ویژن پر حکمرانوں کی بدحواسیاں دیکھ کر محظوظ ہوتا رہتا ہوں۔ امریکی حکمرانوں کا لہجہ تحکمانہ ہے اور ہمیں اپنی رعایا سمجھنے والے جنرل امریکیوں سے گھگھیا گھگھیا کر باتیں کر رہے ہیں۔ وہ بند گلی میں پہنچ چکے ہیں جہاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا۔

والسلام!

تمہارا والد!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ماریہ سے بُشریٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

22 جنوری 2006ء

بُشی جی !

السلام علیکم!

مجھے کچھ معلوم نہیں آج کیا لکھونگا؟ لگتا ہے میری تنہائی کے صحرا نے محفل آرائی کے ذریعے اپنے درد کی کتھا بیان کرنی ہے۔ شاید بھٹکا ہوا راہی حدی خوانی کے ذریعے قافلے والوں کو اپنے ہونے کا پتہ دے رہا ہے۔

رات کا ایک بجا ہے، ہجوم یاس نے گھیرا ہوا ہے، درد کی انجمن سج چکی ہے، احباب جمع ہیں، اہل وطن کی خوشبو چار سُو رچی بسی ہے، اہل دانش نے بھی درد کی سوغات بھیجی ہے، میں نے آنکھیں بند کیں تو دل کا دریچہ وا ہو گیا۔ میں خزاں میں بہاروں کے رنگ دیکھنے اور دل کے ویرانے میں مجلس آرائی کے فن کا ماہر ہو گیا ہوں۔ مجھے اپنے کھیتوں سے زمین کا سینہ چیر کر سر اُٹھانے والی کونپلیں نظر آنے لگی ہیں۔ تم ٹھیک کہتی ہو مجھے زمین کاشت کرنے کا شوق حد سے زیادہ ہے۔ زمین مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے، مجھے اپنی آغوش میں چھپا لینا چاہتی ہے۔ لیکن میں نے ابھی کئی قرض اُتارنے ہیں، میرا گوشت پوست میری ہڈیاں اسی کا رزق ہیں۔ میں اپنی ہر سانس کو اس پر نچھاور کر رہا ہوں۔ اسے ابھی مزید چند روز میرا انتظار کرنا ہوگا۔ میں نے اس کی کوکھ سے جنم لینے والے بچوں کا درد اپنا درد سمجھا ہے۔ اس درد کی چارہ گری سے جونہی فرصت ملے گی، میں اپنی آسودگی اِس کی آغوش میں تلاش کرونگا۔ ابھی کونپلوں نے شجرِ سایہ دار کا روپ دھارنا ہے اور درختوں نے برگ و بار لانا ہے۔

میں 1978ء میں اقوام متحدہ کے زیر اہتمام منعقد ہونیوالی کانفرنس میں شرکت کے سلسلے میں ارجنٹائن (ARGENTINA) میں تھا۔ وہاں ہمارے سفارتخانے نے لاطینی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے انگریزی میں گفتگو کیلئے ایک خاتون ماریہ ہوزے (MARIA JOSE) کو بطور مترجم رکھا ہوا تھا، وہ میری معاونت کر رہی تھی۔ سفارتخانے کے عملے نے بتایا کہ اس کا والد ارب پتی ہے اور وہ اس کی اکلوتی اولاد ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ معمولی تنخواہ کیلئے اتنی محنت کیوں کر رہی ہے؟ کہنے لگی، میری والدہ بھی ارب پتی ہے، مگر مجھے والدین کی دولت سے کوئی سروکار نہیں۔ انسانیت کی سماجی ترقی میں ہر ایک نے حصہ ڈالا ہے۔ کسی نے بجلی دریافت کی، کسی نے سکولوں کا نظام بنایا، کسی نے ریل اور جہاز بنایا، کسی نے اناج کے بیجوں کو ترقی دے کر کروڑوں انسانوں کی بھوک کا مداوا کیا۔ میں سوچتی ہوں میری اپنی ایک شخصیت ہے۔ میں ساری عمر دوسروں کی محنت کا پھل کھاتی رہی ہوں۔ کوئی میری محنت کا پھل کھانیوالا ہونا چاہیے۔ اپنی محنت سے کما کر دنیا کی کسی پیداواری سرگرمی میں اضافہ کر سکوں تو مجھے احساس ہوگا کہ میں نے کچھ قرض چکا دیا ہے۔ اگر میں صرف دوسروں کی پیداواری صلاحیتوں کو اپنے والدین کی محنت کی وجہ سے استعمال میں لا کر اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں تو میرا اس دنیا میں آنا بے مقصد ہوگا۔ ماریہ ہوزے کہنے لگی، میرے والدین کی دولت اگر انسانی فلاح کے کسی ادارے کے کام آ سکے تو مجھے خوشی ہوگی۔ میں اپنی دنیا خود پیدا کرنا چاہتی ہوں، اس مقصد کیلئے میں محنت کرتی ہوں۔ اس محنت مزدوری سے مجھے جو راحت ملتی ہے اس کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔

ماریہ ہوزے کی باتوں نے مجھے بہت متاثر کیا۔ جب تم پیدا ہوئیں میں نے تمہارا نام ماریہ رکھ دیا۔ تمہاری ماں نے کہا تمہارا نام بشریٰ ہونا چاہیے، بشریٰ اچھی خبر کی بشارت لاتی ہے۔ تمہاری ذمہ داری سوا ہو گئی ہے، تم نے ماریہ کی طرح انسانیت کی خدمت کیلئے محنت کو شعار بنانا ہے اور اچھی خبر کی بشارت بھی لانی ہے۔ بس تم سے گپ شپ کرنا چاہتا تھا، مگر میں نے اس موقع کو بھی نصیحت کیلئے استعمال کر لیا۔ نیند کے آثار پیدا ہونے لگے ہیں اچھا خدا حافظ۔

والسلام!

تمہارا والد!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یقین زندگی کا پیغام ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

23 جنوری 2006ء

میمونہ بی بی!

السلام علیکم!

کبھی سوچتا ہوں کہ میں خیال پرست ہونے کیساتھ رجعت پسند بھی ہوں۔ اسے رجعت پسندی کہیں یا ماضی پرستی، میں خود کو اپنے ماضی سے جدا کرتے ہوئے گھبرا جاتا ہوں۔

جب میرا چالان اڈیالہ جیل راولپنڈی سے بطور سزا کوٹ لکھپت جیل لایا گیا، تو ایسا لگا کہ مجھے گھر سے بے گھر کر دیا گیا ہے، حالانکہ کوٹ لکھپت جیل میں پینتیس (35) سال سے آنا جانا ہے۔ میں نے اِس جیل کے عقوبت خانوں (قصوری چکی) میں بھی شب و روز گذارے ہیں۔ بارہا درجہ سوم کا قیدی رہا ہوں۔ اِس جیل کے موجودہ سپرنٹنڈنٹ (Superintendent) سے تیس سال کا واسطہ ہے۔ 1976ء میں پہلی مرتبہ اُس وقت ملاقات ہوئی جب وہ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ تھے اور میں قیدی تھا، پھر بطور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اور سپرنٹنڈنٹ ہمارا آمنا سامنا رہا اب وہ سینئر سپرنٹنڈنٹ ہیں اور میں تیس سال بعد اسی طرح قیدی کا قیدی۔ یہاں کا دوسرا عملہ بھی کئی بار کی آمدورفت کیوجہ سے میری عادات و اطوار سے خوب واقف ہے۔ وہ جیلر کا کردار ادا کرنے سے باز نہیں آئے اور میں بھی اپنے روّیوں میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکا۔

میں بات کرر ہا تھا کہ ایک سال قبل جب اِس جیل میں داخل ہوا تو مجھے اڈیالہ جیل سے بچھڑنے کا غم تھا۔ میں نے وہاں چند پودے لگائے تھے۔ ٹھٹھرتی شاموں میں ان پودوں کو سینچتا، ان سے باتیں کرتا۔ میری نظریں بہار کی آمد پر لگی ہوئی تھیں۔ مارچ میں آمد بہار کا منظر سامنے تھا۔ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو پھیلنا شروع ہوئی تو مجھے اُٹھا کر اِس جیل میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پھینک دیا گیا۔ مجھے ساحرلودھیانوی کا ایک شعر یاد آرہا تھا جو حسب حال تھا!

چمن کو اس لئے مالی نے خوں سے سینچا تھا
کہ اس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں

میں اڈیالہ جیل سے مانوس ہوگیا تھا، بلی کے بچے، وہاں کے بے ثمر درخت، وہاں کی بلندو بالا دیواریں، وہاں کی چارسُو پھیلی ہوئی خاموشی، سب مجھے اپنی اپنی لگتی تھیں۔ میں نے اپنی کتابیں کتنی ترتیب سے رکھی تھیں۔ موتیا، گلاب اور چنبیلی کے پودوں کو جب پانی دیتا تو آب رواں کی موسیقی میرے کانوں کو بھلی لگتی، ستر سالہ بوڑھا قیدی جب شدید سردی میں پودوں میں کام کرتا نظر آتا تو میں اس کیلئے چائے بنا کر لے جاتا۔ چائے کی پیالی سے نکلنے والی بھاپ زندگی کی علامت بن جاتی۔ ہر شام مشقتی دو کرسیاں اور ایک میز چھوٹے سے لان کے کونے میں رکھ دیتا، سال بعد اُس نے کہا! ایک سال ہوگیا، دوسری کرسی پر کوئی شخص آکر نہیں بیٹھا۔ آپ روزانہ دوسری کرسی کیوں رکھواتے ہیں؟ میں نے اُسے کہا میں اکیلا چائے پی نہیں سکتا، تصور کر لیتا ہوں کہ میں اپنے کسی ساتھی کے ساتھ چائے پی رہا ہوں، اڈیالہ جیل کی بہت ساری باتیں مجھے یاد آتی تھیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ مجھے اڈیالہ جیل چھوڑنے کا دکھ اپنا گھر چھوڑنے سے بھی زیادہ محسوس ہوا۔ اِسے میری ماضی پرستی کے علاوہ کیا نام دیا جاسکتا ہے۔

اب کوٹ لکھپت کا ویرانہ آباد نظر آتا ہے، موسم خزاں میں بھی اتنے پھول کھلے ہیں کہ بہار کا گماں ہوتا ہے۔ ریڈیو پر کوئی فیض احمد فیض کی مشہور غزل " گلوں میں رنگ بھرے" الاپ رہا تھا، قفس کو اُداسی نے اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا، صبا اپنی بے قراری کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی، گلشن کا کاروبار رُکا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ جب موسیقی کی دُھنوں سے گذرتا ہوا مقطع میری سماعت سے ٹکرایا کہ

مقام، فیض، کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تو میری نظریں سامنے والی دیوار سے جا لگیں جہاں سے موت کی وادی کا سفر شروع ہوتا ہے، پھانسی گھاٹ کو دیکھ کر سوئے دار جانے کا منظر میرے سامنے تھا۔ نہ جانے کیوں ایسا سوچتا ہوں کہ کچھ لوگوں کی زندگی کا سفر اِس موت کی وادی سے گذر کر شروع ہوتا ہے۔ صبح و شام موت کے پھندے کو دیکھتے ہوئے موت کے خوف کو موت آجاتی ہے۔ جب کوئی بے خوف ہو جائے تو پھر منزلیں اِس کی تلاش میں ہوتی ہیں۔ میں اتنا ماضی پرست ہو گیا ہوں کہ اگر آزادی ملی تو ٹکٹکی کو اپنے سامنے نہ پا کر اِسکی یاد ضرور آئیگی۔ پھر سوچتا ہوں کہ میں تو پہلے ہی بے یقینی کی سُولی پر لٹکا ہوا ہوں۔ جب یقین کی دولت ہاتھ آئیگی تو یہی سولی میرے لئے زندگی کا پیغام لائے گی۔ وہی قوم دنیا میں زندہ رہنے کے قابل ہے جسکے افراد یقین کی دولت سے مالا مال ہوں۔ جن کے سینوں میں عزائم بیدار ہو چکے ہوں، وہی قوموں کی امامت کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ بے یقینی موت ہے اور یقین زندگی۔

ماضی سے رشتہ توڑ کر یقین کی منزل حاصل نہیں ہوتی۔ روشن خیالی کا تصور دوسروں کی تقلید سے مشروط کر دیا جائے تو یہی روشن خیالی خام خیالی بن جاتی ہے اور اگر اپنے اندر کی آگ سے خیالات کو جلا بخشی جائے تو کامیابیوں کے دروازے کھلنے لگتے ہیں۔

تمہیں یہ وہم کیوں ہونے لگا کہ میری صحت ٹھیک نہیں، مجھے سخت سردیوں کی وجہ سے فلو ہو گیا تھا، اب بالکل تندرست ہوں، ویسے بھی غالب نے کہہ دیا ہے ؏ ''اِس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے''۔ تم نے ملتانیوں کے بارے میں وہ لطیفہ تو ضرور سنا ہوگا کہ "فرشتے دوزخ میں ایک شخص کو کمبل اوڑھے دیکھ کر ششدر رہ گئے، انہوں نے کہا اتنی گرمی میں کمبل کی ضرورت کیوں پیش آئی تو جواب ملا کہ تمہیں معلوم نہیں میں ملتان کا رہنے والا ہوں مجھے بھی گرمی راس آئی ہوئی ہے سردی تھوڑا سا تنگ کرتی ہے" میں جب باہر ہوتا ہوں تو میڈیکل چیک اَپ باقاعدگی سے کرواتا ہوں، جیل میں طبی معائنہ اسلئے نہیں کروانے دیتے کہ قیدی کو ہسپتال منتقل نہ کرنا پڑے۔ جیل سے ہسپتال منتقل ہونا ایسے ہی ہے جیسے دوزخ سے بہشت میں آجانا۔ لیکن میں نے چالیس سالہ جیل سروس کے اندر ایک رات بھی ہسپتال

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں نہیں گذاری۔ اتنا اچھا جیل ریکارڈ رکھنے کے باوجود حکام میرے اس بنیادی حق کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں کہ میں اپنی صحت کے بارے معلومات جمع کرسکوں۔

ڈیڑھ سال کی جدوجہد کے بعد ڈاکٹروں کی رپورٹ پر عدالت نے مجھے دانتوں کے علاج کی اجازت دی۔ میرے ایک دانت کے ایکسرے کی عدالتی اجازت دوبارہ لینا پڑی۔ دومرتبہ عدالت نے تنبیہ کی کہ ایکسرے کرایا جائے، تین ماہ ہوگئے ہسپتال جاتا ہوں ایک آدھ گھنٹہ کے بعد واپس آجاتا ہوں کہ جب تک حکومتی اجازت نہ ہو دوسرے دانت کا علاج نہیں ہوسکتا۔ ہسپتال میں موجودگی کے باوجود اگر آنکھ چیک کرانی ہو تو یہ ممکن نہیں ہے، اسکے لئے ڈاکٹروں کا بورڈ بیٹھے گا اگر وہ علاج کو ضروری قرار دیں تو پھر بھی عدالت کی طرف رجوع کرنا پڑیگا۔ عدالتی حکم پر اگر حکومت مناسب سمجھے گی تو جیل سے ہسپتال جانے کیلئے (AMBULANCE) ایمبولینس مہیا کرےگی اگر دو تین مہینے ایمبولینس مہیا نہ ہو تو آنکھ کا ضائع ہونا معمولی سی بات ہے، ایک سزا یافتہ قیدی کی آنکھ یا دانت اتنا اہم نہیں کہ اسکے نخرے اُٹھائے جائیں، میرے دو دانت اسی طرح ضائع ہوگئے ہیں۔ ڈینٹسٹ (DENTIST) کہتا ہے شکر کریں باقی بچ گئے۔ کبھی کبھی میں اپنی اس بے بسی پر ہنستا ہوں، میرے پاس علاج کے وسائل موجود ہیں، میں اِس ملک کا وزیر صحت رہا ہوں۔ ٹیلی ویژن پر اپنے شہریوں کو اپنی صحت کی حفاظت کی تلقین کرتا رہا ہوں۔ اب بھی حکومت صحت کی حفاظت کیلئے مہم چلاتی ہے لیکن اس مہم کا اطلاق مجھ پر نہیں ہوسکتا۔

میں نے اڈیالہ جیل میں بھی اور یہاں کوٹ لکھپت میں بھی چوری چھپے اپنا خون لیبارٹری (LAB) میں بھجوا دیا تھا۔ نتائج بہت اچھے ہیں۔ میرا بلڈ پریشر 80 اور 120 رہتا ہے جو آئیڈیل ہے۔ خون میں چربی کی مقدار 170 کے قریب ہے، اِسی طرح گلوکوز بھی 93 سے زیادہ نہیں۔ ذہنی طور پر اپنے آپ کو تیس چالیس کے ایج گروپ میں سمجھتا ہوں۔ روزانہ ایک گھنٹہ سیر کرتا ہوں، موقع ملے تو بیڈمنٹن کھیلتا ہوں۔ چاک و چوبند رہتا ہوں۔ ایک مرتبہ چمبہ ہاؤس کے ٹارچر سیل میں مَیں نے ایک کرنل کی بے ہودہ گفتگو کا درشتی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے جواب دیا تو دوسرے دن اِس کے ساتھی کرنل نے کہا، کہ آپ کا بلڈ پریشر ہم روزانہ چیک کرتے ہیں، جو نہائیت شاندار ہے۔ اِسکے باوجود آپ اتنے غصے میں کیوں آگئے تھے، کہیں آپکے خاندان میں کوئی ایسی بیماری تو نہیں۔ میں نے انہیں کہا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ "غصہ بھی انسان کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے" جو اپنی عزتِ نفس کی حفاظت نہیں کرسکتا وہ دوسروں کی عزت کی کیا حفاظت کریگا۔ یہی بیماری کئی صدیوں سے میرے خاندان کو بھی لگی ہوئی ہے، میری عزتِ نفس کو مجروح کیا گیا تو اس سے بھی زیادہ سختی سے پیش آؤنگا، یہ اُن دِنوں کا واقعہ ہے جب اِسی ٹارچر سیل میں ایک شخص دباؤ برداشت نہ کرتے ہوئے اللہ کو پیارا ہو گیا تھا اور اسی وجہ سے فوجی حکام نے ٹارچر سیل میں لانے سے پہلے اور ہر مرتبہ ٹارچر کرنے کے بعد ڈاکٹری معائنہ کا بندوبست کیا ہوا تھا، میری سخت جانی میری صحت کی حفاظت کرتی ہے۔ تم زیادہ فکر نہ کرو۔

والسلام!

تمہارا والد!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

احساسِ ذمہ داری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

24 جنوری 2006ء

میمونہ بی بی!

السلام علیکم!

میں زاہد شب زندہ دار نہیں ہوں، اسکے باوجود ایک بجے رات تک جاگتے رہنا میرا معمول ہے۔ جیل کی راتیں لمبی ہوتی ہیں اور گونگی بھی۔ مگر اب ہم آپس میں مل کر باتیں کرتے ہیں۔ رات کا کھانا گرم کرتا ہوں چائے یا کافی بناتا ہوں، کتابوں میں گم ہو جاتا ہوں۔ کبھی غم کی جوت جگالیتا ہوں اور کبھی اپنے حالِ دل پر ہنستا ہوں۔ تصور کی دُنیا میں چلا جاتا ہوں، اچھے خواب دیکھنے پر پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔ مجھے ڈراؤنے خواب کبھی نہیں آئے، جاگتے ہوئے بھی اور سوتے ہوئے بھی۔ میں صرف اچھے خواب ہی نہیں دیکھتا ہوں، ان خوابوں میں رنگ بھرنے کی کوشش بھی جاری رکھتا ہوں۔ جس طرح فرہاد کے عشق نے پہاڑ سے دودھ کی نہر نکالی تھی، میں بھی رات کے اندھیرے کو بھگانے کیلئے صبح کا انتظار کرتا ہوں، اگرچہ جانتا ہوں، یہ کام جوئے شیر لانے سے زیادہ سخت ہے۔ غالب نے کہا تھا ''صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا''۔ عشق نے اگر آدابِ سحر گاہی نہ سکھائے ہوتے تو میں غلامی پر رضامند ہو جاتا اور دل کی شہنشاہی کے راز مجھ پر کبھی نہ کھلتے۔

مجھے جیل میں اس لئے ڈالا گیا کہ میرا رابطہ باقی دنیا سے کاٹ دیا جائے اور میرے خطرناک خیالات کو ایک کال کوٹھڑی میں بند کر دیا جائے۔ میں نے منصوبہ بندی کے ذریعے حکمرانوں کی اس کوشش کو ناکام کر دیا۔ تم دیکھتی ہو میں اخبارات کے علاوہ دوسرے ذرائع سے بھی اپنا پیغام اپنی قوم تک باقاعدگی سے پہنچاتا رہتا ہوں۔ مجھے عدالتوں میں پیش کیا جاتا ہے تو میں پریس کانفرنس کر کے قوم کو آنے والے حالات سے باخبر کرتا ہوں اور اپنے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

موقف کا اعادہ کرتا ہوں۔ جیل کے اندر سے بھی منظم طریقے سے اپنی آواز پہنچاتا ہوں اور حکمرانوں کو بے بس کرنے کا طریقہ اپنا کر اپنی آنیوالی نسلوں کو پیغام دیتا ہوں کہ مشکل ترین حالات میں انسان کو اپنا مشن جاری رکھنا چاہیے۔ شروع میں اخبارات ایک "باغی" کے بیانات کی اشاعت سے گھبراتے تھے۔ اندر کہیں کونے کھدرے میں ایک آدھ لائن چھاپ دیتے تھے، آہستہ آہستہ ان کا خوف ختم ہونے لگا۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ ایک سیاسی کلچر پیدا ہو جائے۔ یہ بات سیاسی راہنماؤں اور سیاسی کارکنوں کے جیل کے خوف کو دور کرنے کیلئے بھی ضروری تھی۔ میں نے اندرون ملک اور بیرون ملک کی سیاسی قیادت سے بھی براہ راست رابطہ کے ذرائع تلاش کئے۔ اپنی پارٹی کی قیادت اور کارکنان کو ملاقاتوں اور دیگر ذرائع سے اپنی گذارشات پہنچاتا رہتا ہوں اور انکے مشوروں سے مستفید ہوتا ہوں۔ میں منظم ہو کر جنگ لڑنے کا قائل ہوں اور جب مقاصد واضح ہوں تو پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اس وقت صبح کے چار بجے ہیں۔ تمہیں ایک عجیب واقعہ سنا کر بات ختم کرتا ہوں۔

میں ایک دن عدالتی پیشی کے لئے جا رہا تھا۔ قیدیوں والی گاڑی میں ایک ادھیڑ عمر کا سپاہی میرے ساتھ ہاتھ میں بندوق تھامے بیٹھا تھا۔ ہم آپس میں سیاسی حالات پر باتیں کر رہے تھے کہ ایک دم سنجیدہ ہو کر کہنے لگا اگر میں آپ کو گولی مار دوں تو مجھے کون روک سکتا ہے؟ پھر کہنے لگا! مجھ پر قتل کا مقدمہ بننے کا کوئی امکان بھی نہیں، آپ کے ورثاء کہیں گے یہ ایک معمولی سپاہی کا کام نہیں ہو سکتا، محکمہ پولیس اپنے تحفظ کیلئے کہے گا، مقتول سپاہی سے بندوق چھین رہا تھا کہ لبلبی دب گئی۔ اس نے سوالیہ انداز سے کہا پھر میں آپ کو مارتا کیوں نہیں؟ میں نے ہنستے ہوئے کہا کہ یہ آپکا حُسن اخلاق ہے جو آپ کو مجھ پر حملہ کرنے سے روک رہا ہے۔ اُس نے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے خود ہی جواب دیا میرے پاس تو بندوق ہے ہی اندرون ملک کے غلط لوگوں کو مارنے کیلئے، فوجیوں کو تو صرف دشمن کے خلاف بندوق کے استعمال کی اجازت ہے، پھر کہنے لگا! میرے محکمہ کو معلوم ہے کہ میں یہ کام نہیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کرونگا، اس لئے انہوں نے بندوق دے کر آپکے پاس بٹھایا ہے۔ انہیں یقین ہے مجھے اپنی ذمہ داری کا احساس ہے، پولیس کے ادنیٰ سپاہی سے تو ذمہ داری کے احساس کی توقع کی جارہی ہے، لیکن جب ملک کا کوئی جرنیل دشمنوں کے خلاف استعمال ہونے والی بندوق اپنے وزیراعظم کے سینے پر رکھ دیتا ہے تو کیا میں اس جرنیل سے بہتر نہیں ہوں؟ اب تم بتاؤ میں کسے بہتر سمجھوں؟ پولیس کے سپاہی کو یا اس جرنیل کو؟ مسجدوں سے اذانوں کی آوازیں آرہی ہیں باقی باتیں پھر سہی.............

والسلام!

تمہارا والد!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اجتماعی قیادت کا تصور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

25 جنوری 2006

میمونہ بی بی!

السلام علیکم!

تم جانتی ہو میں اجتماعی قیادت کو مستقبل میں بنی نوع انسان کا مقدر سمجھتا ہوں۔ اب تو اُبھرنے والے منظر کے خدوخال واضح ہونے لگے ہیں۔

آج کی سیاسی دُنیا پر نظر ڈالیں تو نہ صرف ہر جماعت میں ایک سے زیادہ قائدین موجود ہیں، جن کی صلاحیتیں اپنی جماعت کا سرمایہ ہیں بلکہ دنیا بھر میں مخلوط حکومتوں کا رواج زور پکڑنے لگا ہے۔ اس وقت ہندوستان میں کئی جماعتیں مل کر حکومت کی تشکیل کر رہی ہیں۔ یورپ کے کئی ممالک بھی اسی زد میں آچکے ہیں۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ دنیا کی بین الاقوامی تجارتی کمپنیاں ایک دوسرے میں مدغم (Merge) ہو رہی ہیں بلکہ اب تو متحارب ملک بھی اجتماعی دفاع پر مذاکرات کر رہے ہیں۔

پہلی جنگ عظیم میں بادشاہتیں سرنگوں ہوئیں تو ردّعمل کے طور پر مضبوط شخصیات کا عمل دخل بین الاقوامی معاملات میں زیادہ ہو گیا۔ ان مضبوط شخصیات نے نظام جمہوریت کو اپنا مطمع نظر بتایا اور اس تاثر کو قائم رکھنے کے لئے پارلیمنٹ کے انتخابات بھی کرائے مگر حقیقت میں وہ جمہوری بادشاہت کے ذریعے اپنے عوام کے سروں پر مسلط ہو گئے۔ چند بڑے ممالک نے کمزور ملکوں کے عوام کے حقوق سلب کر لئے۔ یہ ناانصافیاں دوسری جنگ عظیم کا باعث بنیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد عالمی منظر پر افراد کی بجائے دھڑے بندی (BLOCKS) کا غلبہ ہو گیا۔ اس تقسیم کی وجہ سے نو آزاد ممالک میں بڑی طاقتوں نے شخصیات پر انحصار بڑھا دیا، جماعتی سیاست چند ممالک کے سوا کہیں جڑ نہ پکڑ سکی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہندوستان دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے طور پر ابھرا، لیکن وہاں بھی نہرو سے لے کر راہول گاندھی تک، ایک نئی موروثیت نے جنم لیا۔ جس کے اثرات بھارتی سیاست کو ابھی تک اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے دنیا کے نقشہ پر لگ بھگ ڈیڑھ سو نئے ملک معرض وجود میں آئے، ہر ایک ملک کا بابائے قوم بھی پیدا ہو گیا، چند ایک شخصیات کو چھوڑ کر ان بانیاں ملک کی حیثیت بادشاہ کے برابر ہو گئی۔ انہوں نے جماعتی سیاست کو بڑھنے سے روک دیا اور ان کی شخصیت کا سحر نوآموز قوموں کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ بن گیا۔ ہر بابائے قوم سے عقیدت ایک فطری بات تھی یہ ایک ناگزیر مرحلہ تھا۔

نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد امریکہ اور روس نے نئے استعمار کا روپ دھار لیا اور بالواسطہ حکمرانی کے لئے چھوٹے ملکوں کے آمروں کو کھلی چھٹی مل گئی۔ مسلمان علاقوں میں تیل کی موجودگی نے ہر ایک بادشاہ یا آمر کو مطلق العنان بنا دیا۔ روس اور امریکہ کی سرد جنگ کی وجہ سے ترقی پذیر علاقوں کے عوام بے وقعت ہو گئے، وہاں کے وسائل پر قبضے کیلئے ہتھیاروں کی دوڑ شروع کرا دی گئی۔ روس کی یلغار کو روکنے کیلئے امریکی اور یورپی اتحاد نے مسلمان حکمرانوں کو اپنے مقاصد کیلئے استعمال کیا۔ روس کو یورپ سے فوجیں ہٹانا پڑیں تو اس نے جنوب کی طرف دباؤ بڑھانے کیلئے افغانستان کا رخ کیا۔ روس کی پیشرفت نے مسلمان بادشاہوں کیلئے خطرے کا الارم بجا دیا، پاکستان کو بھی خطرات اپنی سرحدوں پر منڈلاتے نظر آئے۔ امریکہ نے شاطرانہ طریقے سے روس کے احمقانہ اقدامات کا بھرپور جواب دینے کیلئے مسلمانوں سے اتحاد کا ڈھونگ رچایا۔ مسلمان اس جنگ کا ایندھن بن گئے۔ روس کی شکست کے بعد امریکہ اب تیل کے وسائل پر بلاشرکت غیرے قبضہ کرنا چاہتا ہے، وہ نہ صرف مسلمانوں کو اپنے راستے میں رکاوٹ سمجھتا ہے، بلکہ وہ یورپی ممالک کو بھی تیل کے وسائل میں شریک نہیں کرنا چاہتا۔ مسلمان اور یورپی ممالک کو ان حالات کا شدت سے احساس ہو چکا ہے۔ مسلمان ممالک کے حکمران اپنے عوام کے سامنے بے نقاب ہو گئے ہیں۔ دنیا بھر کے عوام امریکی مفادات کی بھینٹ چڑھنے کو تیار نہیں۔ بادشاہوں اور آمروں کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دوسری جنگ عظیم کے بعد ابھرنے والی قیادت اپنا وقار کھو چکی ہے۔

نئے منظر نامہ میں اجتماعی قیادت ہی سکہ رائج الوقت کے طور پر قبول ہوگی اور زمین بادشاہوں اور آمروں سے بیزاری کا اعلانیہ اظہار کریگی۔ اسکی شروعات کا آغاز ہوگیا ہے۔ کنفیوشس نے تین ہزار سال پہلے کہہ دیا تھا! سیاسی عمل بہتے پانی کی طرح اپنا راستہ خود بناتا ہے۔ اسے ایک جگہ پر روکا نہیں جاسکتا۔ اب شخصیات کی گرفت جماعتوں پر ڈھیلی پڑتی جارہی ہے جو پارٹیاں ایک شخصیت کے گرد گھومتی ہیں انکا کوئی مستقبل نہیں رہا بلکہ اب تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ کوئی اکیلی جماعت کسی ملک کے چلانے کے قابل ہی نہیں رہی۔

جب میں نواز شریف یا بینظیر صاحبہ کی قیادت کی حمایت کرتا ہوں تو مجھے یقین ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی تنہا ملک کے سارے معاملات اپنے ہاتھ میں نہیں رکھ سکے گا۔ ان کا وجود پاکستان کی سیاست کو اگلے مرحلے میں داخل کرنے کیلئے ضروری ہے۔ حالات کا جبر ان کو اجتماعی سوچ کی طرف دھکیل کر لے جائیگا۔ جو بھی زمینی حقائق سے روگردانی کریگا وہ نہ ملک کی کوئی خدمت کر سکے گا اور نہ اپنی جدوجہد کو منطقی انجام سے ہمکنار کر سکے گا۔

اتنی تفصیلی گفتگو کے بعد اب اپنی بات کو آگے بڑھانے کیلئے کرکٹ کا سہارا لیتا ہوں۔ چند روز قبل ہماری کرکٹ ٹیم کا مقابلہ ہندوستان کی ٹیم سے لاہور میں ہورہا تھا، میں یہ میچ بڑے غور سے دیکھتا رہا۔ پاکستان نے ہندوستان کے خلاف 679 کا سکور کرکے ایک ریکارڈ بنایا۔ انضمام الحق ہماری ٹیم کے رنز بنانے کی مشین سمجھے جاتے ہیں، کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ صرف ایک رن بنا کر آؤٹ ہوگئے اگر ٹیم ورک کی بجائے صرف ایک فرد پر انحصار کیا جاتا تو نتیجہ صاف ظاہر ہے کیا ہوتا؟ اسی طرح ہمارے ایک کھلاڑی یونس خان 199 رنز بنا کر آؤٹ ہوگئے، انہیں اپنی ڈبل سنچری بنانے کیلئے صرف ایک رن کا اضافہ درکار تھا۔ جب وہ آؤٹ ہوکر جارہے تھے، انکے چہرے پر عجیب قسم کی مایوسی کا تاثر تھا، اگر ڈیڑھ سو یا اس سے کم پر آؤٹ ہوتے تو انکی یہ حالت نہ ہوتی۔ منزل کے قریب جاکر منزل کھو دینا بہت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تکلیف دہ ہوتا ہے۔ کامیاب سفر بھی ناکام سفر بن جاتا ہے، لیکن اگر ہمت نہ ہاریں تو اگلی کوشش میں منزل خود چل کر سامنے آجاتی ہے۔ اس میچ سے اجتماعی قیادت کے بارے میں میرے خیال کو مزید تقویت ملی اور شکست کو فتح میں بدلنے کا حوصلہ بھی۔

والسّلام!

تمہارا والد!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بڑے باپ کا بڑا بیٹا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

26 جنوری 2006

بشریٰ جی !

السلام علیکم!

عوامی نیشنل پارٹی کے رہبر خان ولی خاں کی وفات کی خبر سے دل ودماغ پر گہرا اثر رہا۔ خان صاحب نے زندگی بھر جمہوریت کیلئے جدوجہد کی، اپنے موقف پر ڈٹے رہے اور اصولوں پر مفاہمت سے نا آشنا رہے۔ وہ تحریک آزادی کے قافلے کے رہرو تھے۔ سامراج دشمنی ان کے خون میں شامل تھی۔ وہ کہا کرتے تھے ہم تقسیم ہندوستان کے مخالف تھے اور اب پاکستان کی تقسیم کرنے والوں کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ ان کے والد محترم خان عبدالغفار خان (باچا خان) نے قیام پاکستان کو انگریز کی سازش سمجھا مگر قیام پاکستان کے بعد اسمبلی میں پاکستان سے وفاداری کا حلف اٹھایا۔ قائداعظم کو سرحد کا دورہ کرنے کی دعوت دی اور شاندار استقبال کا اہتمام کیا۔ یہ دورہ کیوں منسوخ ہوا؟ اس کا جواب باچا خان کے ذمے نہیں ہے۔ اس منسوخی کے منفی اثرات سے آج تک پاکستان کی سیاست باہر نہیں نکل سکی۔

خان عبدالغفار خان نے اپنی زندگی کے اٹھائیس سال ہندوستان اور پاکستان کی جیلوں میں گذارے۔ یہ مدت نیلسن منڈیلا (NELSON MANDELA) کی قید سے بھی ایک سال زیادہ ہے۔ خان ولی خان پہلی مرتبہ 1943ء میں وطن کی آزادی کیلئے جیل گئے۔ آخری مرتبہ 1977ء میں حیدرآباد کی جیل میں تھے، اس طرح چونتیس سال تک ان کا جیلوں میں آنا جانا جاری رہا۔ انکی بیگم محترمہ نسیم ولی خان نے خان صاحب کی جیل یاترا کے دنوں میں پارٹی کی راہنمائی کی۔ 1977ء کی تحریک جمہوریت میں انکی قائدانہ صلاحیتیں ابھر کر سامنے آئیں۔ انہوں نے بھی قیدوبند کو اپنے راستے کی رکاوٹ نہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بننے دیا۔ ان کے صاحبزادے اسفند یار ولی پاکستان کی سیاست کا معتبر نام ہیں۔ ولی خان کے بھائی عبدالغنی خان نے بھی بارہا جیل کی کال کوٹھڑی کو آباد کیا۔ 1977ء کے حیدر آباد کے جیل کے زمانے کی بات ہے۔ ہمیں میاں محمود علی قصوری صاحب نے بتایا کہ انہوں نے عدالتی پیشی کے موقعہ پر خان ولی خان کو کسی دستاویز پر دستخط کرنے کو کہا! ولی خان صاحب نے کاغذات کو بغور پڑھنا شروع کر دیا۔ قصوری صاحب کہتے ہیں میں نے ہنستے ہوئے ولی خان کو کہا یہ طلاق نامہ نہیں اتنے غور سے مت پڑھو۔ ولی خان صاحب سنجیدہ ہو کر کہنے لگے! قصوری صاحب اگر ہماری عورتیں طلاق کا مطالبہ کریں تو وہ حق بجانب ہونگی۔ پھر کہا جب میں پیدا ہوا میرے والد صاحب جیل میں تھے۔ میری والدہ کی خواہش تھی میرے والد ان کے پاس موجود ہوتے۔ میری والدہ اسی دوران مر گئی۔ جب ہم باپ بیٹے نے ایک دوسرے کو دیکھا اس وقت میری عمر ساڑھے چھ سال تھی۔ پھر خود جیل میں تھا کہ اسفند یار پیدا ہوا۔ میں نے اسے تین سال کی عمر میں دیکھا۔ اسکی ماں اسی دوران خالق حقیقی سے جا ملی۔ شکر ہے اسفند یار کی ابھی شادی نہیں ہوئی نہ گھر میں کسی کو انتظار ہے۔ ہم نے اپنی عورتوں کو سوائے تکلیفوں کے اور کچھ بھی نہیں دیا۔

باچا خان نے خدائی خدمتگار تحریک سے افغانوں کی زندگی کو سنوارنے کا کام شروع کیا۔ جہالت کے خلاف جہاد کیا اور آپس کی خونریزی کو بند کرایا۔ وہ صلح جو انسان تھے۔ آزادی انہیں اپنی زندگی سے بھی زیادہ پیاری تھی۔ خان غفار خان، ولی خان، بیگم نسیم ولی اور اسفند یار کی جدوجہد جمہوریت سے عبارت ہے۔ ان میں سے کسی نے نہ کوئی وزارت قبول کی اور نہ کوئی عہدہ۔ ایک مرتبہ مجیب الرحمان شامی اور میں شاہی باغ میں خان ولی خان سے ملاقات کیلئے گئے۔ وہ کہنے لگے ہم نے سرحد کا گورنر بھی آپکی مسلم لیگ کا مقرر کیا ہے، اس وقت ارباب سکندر خان خلیل سرحد کے گورنر تھے، وہ ساری عمر عوامی نیشنل پارٹی میں رہے ان کے والد مسلم لیگی تھے۔ ولی خان کی اس بات سے نیشنل عوامی پارٹی اور مسلم لیگ کے اختلافات کی گہرائی کا اندازہ لگانا آسان تھا۔ ایک شخص کا والد مسلم لیگی تھا، اس کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نیپ (NAP) کے ساتھ زندگی بھر کا ساتھ بھی اسے مکمل خدائی خدمتگار کا درجہ نہ دے سکا۔

1972ء میں مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ ولی خان کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف کی حیثیت سے وہ منظر پر چھائے ہوئے تھے۔ بچے کھچے پاکستان کے دو صوبوں میں ان کی پارٹی کی حکومت تھی، جو پوزیشن آجکل مجلس عمل کی ہے اُس وقت ان کی پارٹی کی تھی۔ پاکستان کی فوج شکست خوردہ تھی۔ ملک میں آئین نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ نوے ہزار پاکستانی فوجی ہندوستان کے قبضے میں تھے۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو نے ان کیلئے الگ مشکلات پیدا کر رکھی تھیں جو بعد میں نیپ (NAP) کی حکومتوں کے خاتمے کا باعث بنیں۔ اُس وقت ولی خان نے ایک سٹیٹسمین (STATES MAN) کا کردار ادا کیا۔ صوبائی خودمختاری کی جنگ میں وہ فاتح بن کر نکلے۔ ذوالفقار علی بھٹو وحدانی طرزِ حکومت کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ولی خان مشکلات میں گھرے رہے۔ مگر اس مشکل وقت میں پاکستان کے مفادات پر اپنے صوبوں کے مفادات کی قربانی سے بھی دریغ نہ کیا اور پاکستان کو مشترکہ آئین دینے کیلئے ذوالفقار علی بھٹو سے زیادہ ذمہ داری کا مظاہرہ کر کے پاکستان کی بنیادیں مضبوط کر دیں۔

جناب ذوالفقار علی بھٹو کا طرز حکمرانی حزب اختلاف کیلئے ناقابل برداشت تھا۔ ہم سب نے ولی خان کی قیادت میں جمہوریت کی جنگ کو تیز کر دیا۔ ایک مرحلہ میں جب لسانی فسادات بھڑک اٹھے تو تمام جماعتوں کا اتحاد بنایا گیا۔ مجھے اسکا کنوینر (CONVENOR) چنا گیا۔ ولی خان نے نہ صرف اس بات کو سراہا بلکہ جمہوریت کیلئے میری قربانیوں کی شاندار الفاظ کے ذریعے تحسین کی۔

تم جانتی ہو میں اسفند یار کو کتنا پسند کرتا ہوں، لیکن یہ پسندیدگی صرف اس کی ذات کی وجہ سے نہیں۔ اس کے بزرگوں سے سیاسی اختلاف ہمارا حق ہے، بہت سارے معاملات پر ہم ایک دوسرے سے کوسوں دور ہیں۔ مگر یہ حقیقت بھی نہیں چھپائی جاسکتی کہ قیام پاکستان سے آج تک پنجاب کا رویہ چھوٹے صوبوں کے ساتھ مثالی نہیں رہا اور جو قیادت بھی صوبائی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خودمختاری کی بات کرے اسے متنازعہ بنا کر غداری کا مرتکب قرار دے دیا جاتا ہے۔ جب سے مجھے غدار بنایا گیا ہے تو بنائے گئے دوسرے غدار مجھے اپنے اپنے سے لگتے ہیں اور ولی خان تو مجھے کبھی غیر لگے ہی نہیں۔ جب میں نے اسفندیار سے ولی خان کی وفات پر تعزیت کی، تو اس نے کہا تم خود جانتے ہو بابا تم سے کتنا پیار کرتے تھے۔ مجھے ان کی شفقتیں یاد آئیں تو میری آنکھیں بہنے لگیں، بیگم نسیم ولی خان نے بھی اسی بات کو دہرایا۔ مجھے ولی خان کا غم اپنی ذات کا غم لگنے لگا مگر سچ تو یہ ہے کہ یہ صرف میرا ذاتی غم نہیں ہے، یہ پوری افغان قوم کا غم ہے، پاکستان کے ہر باضمیر کا غم ہے بلکہ کرہ ارض پر سانس لینے والے ہر آزادی کے متوالے کا غم ہے۔ کیا غفار خان کی زندگی کے اٹھائیس سال صرف شوق فضول میں صرف ہو گئے تھے؟ ولی خان کی جدوجہد اپنی ضد کیلئے تھی؟ اسفندیار جو صرف سو کنال زمین کا مالک ہے، معاشی مشکلات کے باوجود ضمیر کا چراغ روشن کئے ہوئے بے مقصدیت کا شکار ہے؟

میں سمجھتا ہوں تیسری دنیا کے ممالک میں اتنی درخشندہ روایات کے امین لوگ شاید کہیں ہوں۔ اب ساری ذمہ داری اسفندیار کے کندھوں پر ہے، میری دعائیں اس کے ساتھ ہیں۔

ایک مرتبہ ولی خان نے مجھے کہا تھا!

JAVED ! KEEP THE FLAG FLYING

میں نے اسے اپنے لئے بہت بڑا اعزاز جانا تھا۔ اب میں اپنی کال کوٹھری سے کہنا چاہتا ہوں۔

ASFAND YAR ! KEEP THE FLAG FLYING

جب مجھے قتل کے مقدمے میں ملوث کیا گیا تو کوٹ لکھپت جیل میں میری شناخت پریڈ ہو رہی تھی۔ 1972ء میں بیٹھا سوچ رہا تھا! میں نے یونیورسٹی کے صدارتی انتخاب میں حصہ لے کر کونسا جرم کیا ہے؟ مجھے ایسے مقدمے میں پھنسایا گیا جس کی سزا موت ہے۔ میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تمام عمر موت کی کوٹھری میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر زندہ نہیں رہنا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا پاکستان سے بھاگ جاؤں وطن سے محبت کے تمام دعوے کمزور پڑنے لگے، مصیبت کے اِن لمحات میں میری حب الوطنی کی سطح وہ نہیں تھی۔ اُس دن کے بعد حب الوطنی کے بارے میں میرے خیالات میں بنیادی تبدیلی آئی ،میں نے دوسروں کو سرٹیفکیٹ جاری کرنے بند کر دیئے۔

ولی خان اور اُن کے خاندان نے نصف صدی تک اہلِ وطن کی سنگ زنی کا سامنا کیا۔

کیا ہم اُن کی طرح کے محب وطن ہیں؟ اِس سوال کا جواب ضرور تلاش کرنا ہوگا۔

والسّلام

تمہارا باپ!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آزادی کی خوشبو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

27 جنوری 2006

بشی جی !

السلام علیکم!

آج پھر رات جاگتے گذری۔ جگراتوں کی عادت سی ہوگئی ہے۔ شب انتظار، شب ہجر میں ڈھلنے لگتی ہے تو شبِ غم کی زلفیں مجھے اپنی بانہوں میں لے لیتی ہیں۔ میں صبح کے انتظار میں جاگتے رہنا چاہتا ہوں، مگر غم کی چھاؤں اتنی نشیلی ہوتی ہے کہ اس میں عافیت تلاش کرتا ہوں۔ سب سے خطرناک سفرِ صبح کاذب سے صبح صادق کا ہوتا ہے۔ نسیمِ سحر کی اٹھکیلیاں اہلِ دل کیلئے تازہ بستیاں آباد کرتی ہیں اور ہم نیند کے ماتوں کو منزل سے بھٹکا دیتی ہیں۔ کبھی کبھی صبحیں بے نُور ہو جاتی ہیں اور شامیں شامِ غریباں میں ڈھل جاتی ہیں۔ دِل کا درد سوا ہو جاتا ہے ،آمد شروع ہو جاتی ہے۔ اِس کیفیت کے اظہار کیلئے قرطاس اور قلم کا سہارا لے لیتا ہوں اور درد کی انجمن سجا لیتا ہوں۔

آج کل مجھے جیل کی ہر صبح، صبح بنارس لگتی ہے۔ تتلیوں کے پر قوس وقزح کے رنگوں کی طرح حسین ہیں۔ کل سارا دن جس تتلی کے حسن نے مسحور کیے رکھا آج وہ اس زمین پر گری پڑی تھی۔ چیونٹیاں اس کے خوبصورت پروں کو پیٹ کا ایندھن بناتی رہیں۔ ایک کی موت دوسرے کیلئے سامان زِیست تھا۔ میں افسردہ ہوگیا۔ میں نے گذرے ہوئے کل پر نظر دوڑائی، تتلی کا حسن ابھی زندہ تھا۔ میرے ذہن کے کمپیوٹر نے اسے اپنے اندر ریکارڈ کر لیا تھا۔ ایک اور سوال اُبھرا؟ جب میں اِس دُنیا میں نہیں رہونگا تو کیا تتلی کا یہ حسن بھی میرے ساتھ رزق خاک ہو جائیگا یا دوبارہ لالہ وگل کی صورت میں کل کی تتلیوں کا محور ہوگا۔ میں آواگان میں یقین نہیں رکھتا، مگر گل میں جُزو اور جُزو میں گُل کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہوں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حُسنِ ازل ہی حُسنِ حقیقی ہے۔ مجھے تتلیوں، پھولوں اور رنگوں سے ابدی حقیقتوں کا ادراک ہوتا ہے اور ندیم دوست سے بوئے دوست آتی ہے۔ ہر چیز کو فنا ہے، حُسنِ ازل نے دنیا کے حسن کو اپنے اندر جذب کر لینا ہے نقارہ بجنا ہے............

کل من علیھا فان و ما یبقٰی و جہ ربّ الا کرام

(ترجمہ)

پھولوں کی کیاریوں کے اندر چلتے ہوئے سوچنے لگا کہ اگر مجھے ابھی آزادی کا مژدہ سنایا جائے تو ان پھولوں کا حسن اور خوشبو میرے لئے بے وقعت ہو جائیگی۔ جب میں ٹہل رہا تھا میری نگرانی کرنے والا سپاہی میرے کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں نے اسے کہا، وہ بلا اجازت اندر کیوں گیا۔ اُس نے کہا، میں دیکھنا چاہتا ہوں آپ کو کیا کیا سہولیات دی جا رہی ہیں؟ میں نے باہر سے کنڈی لگا دی اور اسے کہا کہ میں ڈیوڑھی تک جا رہا ہوں، ایک گھنٹے میں واپس آجاؤ نگا، وہ پریشان ہو گیا۔ میں نے اُسے کہا، تم آرام سے اِن سہولتوں سے استفادہ کرو جو مجھے حاصل ہیں۔ وہ گڑگڑانے لگا کہ خدا کیلئے دروازہ کھول دیجئے۔ مجھے سخت گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ میں نے اُسے باہر نکالا تو سردی کے باوجود اُس کی پیشانی پسینہ سے شرابور تھی۔ وہ روزانہ دوسروں کو تالہ بند کرتا تھا۔ اُس نے جیل کے اِس کمرے میں بند رہنے کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

آزادی کی خوشبو پھولوں کی خوشبو سے بھی زیادہ معطر ہے۔ چیونٹی سے لے کر ہاتھی اور بلی سے لے کر شیر کوئی بھی اپنی آزادی کی جدوجہد سے غافل نہیں رہتے۔ وہ ایک پر دوسرے کی بالادستی تسلیم نہیں کرتے۔ آپ کسی پرندے کو پکڑنے کی کوشش کریں تو وہ بھی ٹھونگے مارنا شروع کر دیگا۔

اِنسان نے دوسروں کی آزادی سلب کرنے کے کئی قرینے ایجاد کئے ہیں۔ وہ زیر دستوں کو اسی طرح پنجروں میں بند کرنا چاہتا ہے، جس طرح جانوروں اور پرندوں کو کرتا ہے۔ انسان کو غلام بنانے کی خواہش ہر دور میں موجود رہی ہے۔ بس انداز بدلتے رہے۔ مگر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں کیا کروں میں ابنِ آدم ہوں۔ میرے جدِ اوّل نے حسن ازل کی قربتوں میں فردوس بریں کے حسن اور اسکی لطافتوں پر آزادی کو ترجیح دی تھی۔

میں نے مالی کو گلدستہ کیلئے پھول توڑنے سے منع کیا تو وہ کہنے لگا، میں پھولوں کو سینچتے ہوئے روز ارادہ کرتا تھا کہ جب کلیاں نکلیں گی، میں انہیں گلدستہ کی صورت میں آپ کو پیش کرونگا، میری اِس چھوٹی سی خوشی کو پورا ہونے دیں۔ میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ گلدستہ میرے لئے مخصوص ہوجائے گا، جبکہ آزاد فضا کے پھول ہم سب کی آنکھوں کی طراوت ہیں، مگر اُس نے ضد کر کے گلدستہ بنایا۔ پھولوں کی ترتیب اور رنگوں کے امتزاج نے پھولوں کے حسن کو دوبالا کردیا۔ میں اسے پھول کی خوبصورتی کہوں یا انسان کے ذہن کی، میں انسانوں کو اشرف المخلوقات بنانے والے کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکا۔

آزادی کی خوشبو سب خوشبوؤں سے بہتر ہے۔ خدا نے پابندیاں لگا کر آزادی کی نعمت کا احساس دلایا، اور بدصورتی پیدا کر کے حُسن کا۔ درحقیقت حسن اور آزادی خدائی وصف ہیں۔ خدا نے انسان کو دنیا پر اسی لئے بھیجا ہے کہ وہ حسن اخلاق سے احترام آدمیت کا سبق پڑھے، اور آزادی سے معراج انسانیت کا..........

دیکھیں قطرہ گہر بنتا ہے یا سورج کی تمازت سے ہوا میں تحلیل ہوجاتا ہے، کسی اور سمندر سے کسی اور خطے میں کسی اور موسم میں ابر کرم بن کر برستا ہے یا سیلاب بن کر کسی کو ڈبو دیتا ہے۔

والسّلام!

تمہارا والد!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

زمینی حقائق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

12 جنوری 2006

میمونہ بی بی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

میں بکائن کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر اپنے اردگرد پھیلے ہوئے رنگوں سے محظوظ ہو رہا ہوں۔ بکائن کے درخت کی شاخیں بے لباس ہیں۔ سبزے کا نام ونشان نہیں رہا، پتوں کی جگہ خاکی رنگ کے دانوں نے لے لی ہے۔ ہر شاخ بار آور ہے۔ اُس پر پکا ہوا بیج ایسے لگتا ہے جیسے کسی نے خشک شاخوں میں موتی پرو دیئے ہوں۔ گرمیوں میں یہ درخت پھیل جاتا ہے۔ سورج کی جلتی کرنوں کی حدت اپنے اندر جذب کر کے ہمیں ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔ سردیوں میں سکڑ کر سورج کی کرنوں کو ہم تک پہنچنے کیلئے راستہ دیتا ہے۔ شاید ذات کی نفی کے فلسفے پر یقین رکھتا ہے۔

کیڑے مکوڑوں، تتلیوں، پرندوں، گلہریوں نے اپنی الگ دنیا آباد کر رکھی ہے۔ گلہریاں سب سے زیادہ شرارتیں کرتی ہیں، وہ اپنی آواز سے بلیوں کو اپنی طرف متوجہ کر کے درختوں سے اُتر کر ان کے قریب آجاتی ہیں۔ بلیوں کو یقین ہو جاتا ہے کہ شکار اُن کی زد میں ہے۔ گلہری تیزی سے درخت کی طرف دوڑنا شروع کر دیتی ہے، بلی پیچھا کرتی ہے، گلہری درخت کی چوٹی پر پہنچ جاتی ہے۔ بلی بھی اپنی تمام قوت جمع کر کے چوٹی پر پہنچتی ہے تو گلہری ساتھ والے درخت پر چھلانگ لگا دیتی ہے۔ بلی کھسیانی ہو کر واپس آجاتی ہے تو اسکی یہ دوست اِسے زچ کرنے کیلئے پھر آ موجود ہوتی ہے۔ بلی اور چوہے کا کھیل تو مشہور ہے مگر بلی اور گلہری کا کھیل اُس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ میں گلہری کی آنیاں جانیاں دیکھتا رہتا ہوں۔ ہمارے حکمرانوں کی آنیا جانیاں بھی کم دلچسپ نہیں۔ دیکھتے ہیں کہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کب تک وہ بلی کی دسترس سے بچے رہتے ہیں۔

جب کوؤں کا غول بلی پر حملہ آور ہوتا ہے تو وہ منظر بھی قابل دید ہوتا ہے۔ کوؤں کی اجتماعیت اُن کے پروں میں بجلیاں بھر دیتی ہے۔ بلی خوفزدہ ہو کر جائے پناہ کی تلاش میں بھاگتی ہے۔ کہتے ہیں کہ کبوتر بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر کے خود کو محفوظ کر لیتا ہے لیکن کوا اپنی کالی کالی وردی سے بلی کو ڈراتا ہے۔ وردی سے ڈرانے کا وصف اِنسانوں میں بہت ہے اور بھیگی بلی بننے کا ذوق بھی۔

نباتات، حشرات الارض، انسانوں، حیوانوں اور پرندوں کا مطالعہ جتنا قریب سے جیل میں کیا جا سکتا ہے، باہر رہ کر شاید ممکن نہ ہو۔ میں نے مکوڑوں کی زندگی سمجھنے کیلئے کئی دِن صرف کئے۔ وہ ایک قطار میں اپنے بل سے نکل کر اناج کی تلاش میں چل پڑے، واپسی پر ایک کمزور مکوڑے سے اناج کا بڑا دانہ گر گیا، اِس دانے کا حجم مکوڑے کے وجود سے بھی بڑا تھا۔ دوسرے مکوڑے اپنی قطار میں چلتے رہے کسی نے اس کی مدد کرنے کیلئے قطار نہیں توڑی۔ بل کے اندر سے ایک اور مکوڑا نکلا، وہ اناج کے ڈھیر کی طرف جانے کی بجائے اُس مکوڑے کے پاس آ کر رُک گیا۔ دونوں نے فارمیشن بنائی، ایک دانے کو دھکیلنے لگا اور دوسرا بل کی طرف کھینچنے لگا، اس دوران اناج کی طرف جانے والے کسی مکوڑے نے اپنی قطار سے نکل کر اُن کی طرف دیکھا تک نہیں۔ ایک دو مکوڑے قطار کے آگے پیچھے پھر رہے تھے، وہ اناج کی بو سونگھ کر چھوڑ دیتے۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ پورے کام کی نگرانی کر رہے تھے یا بل کے اندر پیغام رسانی ان کے ذمہ تھی۔ میں نے ایک بڑے مکوڑے کو دیکھا جو شاید مادہ تھی کیونکہ دو چھوٹے چھوٹے مکوڑے اُس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے، وہ اتنے چھوٹے تھے کہ اس کے بچے لگتے تھے۔ میں نے مشاہدہ کیا کہ بچے تھک جاتے مگر ماں اپنا سفر جاری رکھتی، فاصلہ بڑھنے لگا تو میں سمجھا کہ اب ایک دوسرے سے نہ مل سکیں گے، اُس وقت حیرت زدہ رہ گیا، جب وہ بچے بہت دُور جا کر پلٹے تو تیز رفتاری سے اُن راستوں پر چلتے ہوئے، جن پر اُن کی ماں چل رہی تھی، ماں تک پہنچ گئے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ماں کے جسم سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نکلنے والی خوشبو انھیں ماں تک پہنچنے کیلئے راہنمائی کرتی ہے۔ یہ خوشبو ہی مامتا ہے۔ انار کے پیڑ پر شہد کی مکھیوں کا نظم وضبط دیکھنے کے قابل ہے۔ جتنا مشاہدہ کریں، جہانِ حیرت میں گُم ہو جاتے ہیں۔

بلی کو اپنے ہاتھ سے گوشت کھلاتا ہوں۔ میں نے اسے پلیٹ میں کھانے کی تربیت دی، وہ برتنوں میں منہ ڈالتی ہے، نہ کچن میں داخل ہوتی ہے۔ اِس کے غسل خانے کے آداب دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں۔ وہ ضروریات سے فارغ ہونے کیلئے کوئی نہ کوئی کونہ تلاش کرتی ہے، پنجوں سے زمین کو کھود کر رفع حاجت کرتی ہے، پھر اُس پر مٹی ڈال کر سُونگھتی ہے، اگر وہ مطمئن نہ ہو تو مزید مٹی ڈالتی ہے۔ اگر میں سختی سے پیش آؤں تو میرے ہاتھ سے گوشت کھانا چھوڑ دیتی ہے۔ دُور جا کر بیٹھ جاتی ہے، کسی ملازم کے پاس جا کر میاؤں میاؤں کرتی ہے تاکہ بھوک مٹا سکے، میں اسے پچکارتا ہوں، پیار کرتا ہوں پھر کہیں جا کر میرے ہاتھ سے کھانا کھانے کیلئے تیار ہوتی ہے،وہ بھوکی رہ سکتی ہے مگر اپنی اَنا کو مجروح نہیں ہونے دیتی۔

نباتات کے رویئے اُن کی بڑھوتری سے ظاہر ہوتے ہیں۔ گملے کے پودے کو زمین میں منتقل کیا جائے تو اس کی خوشنمائی بڑھ جاتی ہے، نامیاتی کھادوں اور پانی کا وقت پر ملنا ،موسموں کا تغیر وتبدل ان پر گہرے اثرات چھوڑتا ہے۔

ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ ہمارا تمام علم اکتسابی ہے۔ جتنی بھی کتابیں لکھی گئی ہیں انکی بنیاد انسان کے مشاہدات پر مبنی ہے۔ آج کی بہت ساری حقیقتیں اُدھوری ہیں۔ ہم روزانہ اخبارات میں پڑھتے ہیں کہ آج نئی کہکشاں دریافت ہوگئی ہے، آج زمین کے اندر مادے کی کیفیات پر نئی تحقیق سامنے آگئی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ انسانی علم ابھی کامل نہیں ہے۔ انسان حیوان ناطق ہے۔ باقی تمام مخلوق کے خصائص ان کی عادات واطوار کے بارے میں حقیقت پر مبنی رائے قائم کی جاسکتی مگر انسان کس حالت میں کیا طرز عمل اختیار کریگا، اسکے بارے میں حتمی رائے قائم کرنا بہت مشکل ہے۔ انسان کو قواعد، اصول وضوابط کا پابند کرنا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک معاشرتی تقاضا ہے۔ آج تک دنیا میں کسی حیوان نے اپنی نسل کے اتنے حیوان نہیں مارے ہونگے جتنے انسان نے دوسرے انسان مارے ہیں۔ ایک ہی نسل کے حیوان ایک دوسرے سے لڑتے ہیں اور اس میں کوئی ایک آدھ حیوان دوسرے حیوان کے ہاتھوں مارا بھی جاتا ہے مگر انسان نے دوسرے انسانوں کو مارنے کیلئے شروع سے ہی مہلک ہتھیاروں کا سہارا لیا ہے۔ تہذیبیں جتنی ترقی کرتی جاتی ہیں اتنی ہی وحشی ہوتی جاتی ہیں۔ ترقی کا مطلب، آخرکار، مہلک ترین جدید ہتھیاروں کی تخلیق بن جاتا ہے۔ دوسرے انسان پر بالادستی کی خواہش جنون میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ کئی تہذیبیں بالادستی کے جذبے کی تسکین کیلئے خود کو مٹا بیٹھیں۔

جب تک انسان برابری کی سطح پر ایک دوسرے کو برداشت کرنا نہیں سیکھے گا جیل کی بلی، گملے کے پودے، رینگنے والے کیڑے مکوڑے اور بکائن کے درخت، اس سے کہیں بہتر ہونگے۔ انسان کی اپنے بنائے ہوئے آئین کی پابندی کرنا ہوگی، یہی چیز اِسے دوسری مخلوق سے ممتاز کرتی ہے اور اس کے بعد ہی اشرف المخلوقات کہلانے کا مستحق ہے۔ ورنہ وجود میں پہاڑ، درخت، ہاتھی، کہکشائیں، دریا اور سمندر اِس سے کہیں بڑے ہیں اور طاقتور بھی۔ وہ تمام اپنے محور کے اندر رہتے ہوئے کام کرتے ہیں۔ انہوں نے آج تک کوئی اصول نہیں توڑا۔ انسان، جسے شعور عطا کیا گیا ہے، مشاہدے کی طاقت رکھتا ہے، وہ چارسُو پھیلی ہوئی حقیقتوں سے انحراف کرتا رہتا ہے۔ تم بھی زمینی حقائق کے مشاہدے کو اپنے مطالعے کی بنیاد بنالو تو رویوں میں توازن برقرار رکھنے میں آسانی ہو جائے گی۔

والسّلام!

تمہارا والد!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دِل دریا سمندروں ڈونگے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

13 جنوری 2006ء

بُشی جی!

السلام علیکم!

آج رات چودھویں کا چاندنور کی کرنیں بکھیرتا رہا۔ میں ساری رات نہیں سویا، اپنے سیل کی جالیوں سے ٹھٹھرتی ہوئی چاندنی کے حسن سے اپنی آنکھوں کو مزید ٹھنڈا کرتا رہا۔ چاندنے "سمندروں ڈونگے دِل میں" جذبات کا طلاطم برپا کردیا۔ گذشتہ چالیس برسوں کا بیتا ہوا ہر لمحہ میری آنکھوں کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ ہڈیوں میں اُتر جانیوالی جیل کی پہلی سردی مجھے آج تک نہیں بھولی، زندگی کی کئی چاندنی راتیں اسی طرح گذر گئیں۔ جب میں بیتے ہوئے لمحوں کو یاد کررہا تھا تو مجھے ایک لمحے کیلئے تاسف کا سامنا نہیں تھا۔ مجموعی طور پر میری زندگی ایک خیال پرست کے طور پر گزری اور آج بھی یہ احساس شدت کے ساتھ جاگزیں ہے، کہ انسانیت کی بالادستی کا جو تصورِ اسلام نے دیا اُس کو عملی زندگی کا حصہ بنانے کا وقت آن پہنچا ہے۔

صبح ہوئی تو میرے سیل کا تالہ کھولا گیا۔ میں پھولوں کے پاس جاکر کھڑا ہوگیا۔ شبنمی ماحول میں چاند کا رنگ پھیکا پڑنے لگا۔ شبنم کے قطروں میں آزادی کا عکس نمایاں تھا۔ مشرق سے اُبھرتے ہوئے سرخ گولے نے سورج کا روپ دھارلیا، اُس کی نوزائیدہ کرنیں صُبحِ نو کا پیغام پہنچانے کیلئے آگے بڑھیں، بادلوں نے ان کا راستہ روکا تو پرندوں کی آوازیں زندگی کا پیغام بن گئیں، کائنات جاگ اُٹھی، کاروبارِ زندگی شروع ہوگیا، دودھ والا پہلے آیا پھر انڈے اور مرغی کے گوشت والا ملازم پہنچ گیا۔ ہمارے پاس انڈے پہلے آتے ہیں پھر مُرغی! سُنا ہے کہ آزاد دُنیا میں یہ فیصلہ ابھی تک نہیں ہوسکا کہ پہلے انڈا آیا تھا یا مرغی؟

والسّلام

تمہارا والد!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پردۂ غیب سے باہر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

یکم فروری 2006

بُشری جی !

السلام علیکم!

آج ملاقات کیلئے آنے والوں کی فہرست بہت طویل تھی، اس میں سیاسی کارکن بھی تھے اور دانشور بھی ...... کراچی سے لے کر پشاور تک ملک کے طول وعرض سے آنے والوں سے گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ ملکی اور بین الاقوامی صورتحال پر بہت سنجیدہ تبصرہ ہوا، پاکستان اور ہندوستان کی ترقی کا موضوع دیر تک زیر بحث آیا، میں نے دوستوں سے کہا کہ اس خطے میں دو عظیم ملک چین اور ہندوستان تقریباً ایک ہی وقت میں آزاد ہوئے۔ یہ بات دُرست ہے کہ چین، تائیوان اور پاکستان، ہندوستان کی تقسیم سے آپس میں کشیدگی بڑھ گئی جس کیوجہ سے معاشی حالات میں ابتری لازم تھی۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو چین ایک کامیاب معاشی حالات کی تصویر پیش کرتا ہے بلکہ اس کی معاشی ترقی نے امریکہ اور جاپان جیسے ترقی یافتہ ملکوں کی معیشیت کو بھی متاثر کیا ہے۔ دفاعی طور پر وہ کہیں آگے ہے اور دنیا کی قوموں میں اس کے اثر ورسوخ میں ہر روز اضافہ ہو رہا ہے۔ چین اور بھارت کی آبادی تقریباً برابر ہے، قدرتی وسائل بھی ایک جیسے ہیں۔ دونوں کو تقسیم کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر بھارت ترقی کے باوجود ابھی تک پسماندہ ترین ممالک میں شمار ہوتا ہے، اسکی کیا وجہ ہے؟ اسکا جواب تو ہندوستانی قیادت ہی دے سکتی ہے مگر زمینی حقائق یہی ہیں کہ تقسیم کے وقت پاکستان کے حصے میں پسماندہ علاقے آئے، اِن علاقوں میں تقسیم سے پہلے ہندو اور سکھ معاشی طور پر بالادست تھے۔

پشاور سے لاہور، لاہور سے ملتان اور وہاں سے کراچی تک شہروں میں ہندو تمام

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کاروبار پر چھائے ہوئے تھے۔ وہ تعلیم میں بھی ہندو سے کہیں آگے تھے۔ چھوٹے قصبوں سے لے کر بڑے شہروں تک منڈیوں پر ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ سرکاری ملازمتوں میں مسلمان خال خال نظر آتا تھا جس سے مسلمانوں کی معاشی ابتری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہندو اکثریتی علاقوں میں مسلمانوں کی مجموعی حالت کیا ہوگی؟ وہاں پر تو سماجی طور پر بھی انھیں ہندوؤں کی بالادستی قبول کرنا پڑتی تھی۔

شروع دن سے پاکستان کا ہندوستان سے معیشت کے میدان میں کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ ہندوستان کو بنا بنایا دارالحکومت مل گیا۔ انتظامی ڈھانچہ بھی موجود تھا، ہندوستان کو ایک ہزار سال بعد غیر قوموں سے نجات ملی تھی۔ انہوں نے جمہوریت اور آزادی کو لازم وملزوم قرار دیدیا۔ جبکہ پاکستان کو نئے تجربات سے گذرنا پڑا، جس کی وجہ سے ملک دولخت ہوگیا۔ بھارت کو ایسے صدمات کا سامنا نہیں تھا۔ ہندو معاشرے کے مزاج میں راجکماروں کو قبول کرنا آسان بات ہے۔ اس لئے ابھی تک ایک ہی خاندان کی پانچویں نسل ان پر حکمرانی کر رہی ہے۔ بھارت کو دُنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا اعزاز حاصل ہے۔ پاکستان میں بندوق کے زور پر حکومت کی جارہی ہے۔ عوام ہر آمر سے ٹکرا جاتے ہیں، کیونکہ اِن کا مزاج جمہوری ہے۔ ہندوستان کا دعویٰ سیکولرازم کا ہے، لیکن وہاں ووٹ کے ذریعے ہندوازم کی حکومت بنتی ہے۔ پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے مگر یہاں پر عوام نے آج تک مذہبی قوتوں کو حکمرانی کا حق نہیں دیا۔ اب کچھ صوبوں میں مذہبی قوتیں آگے بڑھ رہی ہیں۔ میرے خیال میں ہندو معاشرے کے مقابلے میں پاکستانی معاشرہ زیادہ لبرل رویوں کا اظہار کرتا ہے۔ تقسیم سے پہلے زیادہ تر ہندو مسلم فسادات اُن علاقوں میں ہوئے جہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ بہار، بنگال اور گجرات میں ہندوؤں نے مسلمانوں پر زندگی تنگ کر رکھی تھی اور یہ سلسلہ آج تک ختم نہیں ہوا۔ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی وہاں فسادات میں کبھی پہل نہیں کی گئی۔ سرحد، پنجاب، کشمیر، سندھ، بلوچستان اور مشرقی بنگال میں ہندو پُرامن ماحول میں رہ رہے تھے۔ اِن علاقوں کی معیشت اور معاشرت پر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہندوؤں کو کسی تعصب کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

تقسیم کے بعد بھی کانگرسی حکمران دور بینی کی صلاحیت سے محروم رہے۔ انہوں نے پاکستان کے حصے کے فنڈز دینے سے انکار کردیا، جس کیلئے مہاتما گاندھی کو مرن بھرت (بھوک ہڑتال) رکھنا پڑا۔ ہندوستان نے بین الاقوامی سیاست میں روسی بلاک میں جانا پسند کیا اور علاقائی سیاست میں اردگرد کی چھوٹی ریاستوں کو دبانا شروع کردیا۔ حیدرآباد، سکم، بھوٹان، نیپال، برما، سری لنکا اور اب بنگلہ دیش اور اپنے عظیم ہمسایہ ملک چین سے بھارت کے تعلقات ہمیشہ کشیدہ رہے۔ خاص طور پر چھوٹی ریاستوں کے اندرونی معاملات میں بھارت کی مداخلت معمول کی بات سمجھی جاتی ہے۔ بھارت نے علاقے کا چوہدری بننے کا خواب دیکھا، مگر اس پر عمل درآمد کرتے ہوئے جو رویہ اپنایا اس کی وجہ سے علاقائی کشیدگی میں اضافہ ہوتا گیا، اسی وجہ سے جنوبی ایشیاء پسماندگی میں غرق ہوگیا۔ اس وقت ہندوستان، پاکستان، افغانستان، نیپال، بھوٹان، دنیا کے کم تعلیم یافتہ علاقے ہیں، بیماریوں کے علاج کیلئے افریقی ممالک کی پوزیشن ہم سے بہتر ہوگئی ہے۔

اگر ہندوستان مثبت رویہ اختیار کرتا تو نہ پاکستان امریکہ کا دست نگر ہوتا اور نہ دوسرے چھوٹے ممالک بھارت کے خوف کی وجہ سے بین الاقوامی قوتوں کو اپنے معاملات میں دخیل ہونے دیتے۔ ایک مرتبہ ہم چند ساتھی پاکستان کے سابق صدر اور بزرگ راہنما نورالامین سے ملنے گئے۔ وہ کہنے لگے! جب ہم پاکستان بنارہے تھے تو ہمیں بھارت دشمنی کا اندازہ نہیں تھا۔ ہم سمجھتے تھے کہ ہم باہمی تعاون اور احترام کے ساتھ ایک دوسرے کا وجود تسلیم کرلیں گے اور بھارت کے ساتھ ہمارے تعلقات مثالی ہونگے۔ بھارت نے اپنے رویے سے پورے خطے کیلئے جو خطرات پیدا کیے، ہمیں اسکا اندازہ ہوتا تو ہم پاکستان بنانے سے پہلے سو بار سوچتے۔ میں سمجھتا ہوں اگر ہندوستان کا رویہ مثبت ہوتا تو افغانستان، ایران، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، مصر، شام، اردن، کویت، بلکہ پورا مغربی ایشیاء تیل کے وسائل کی اہمیت کے ساتھ ہندوستان کی سیاسی اور معاشی برتری کا باعث بنتا۔ مگر ہندوستان

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی قیادت اتنی اہم ذمہ داریوں کے سنبھالنے کی اہلیت نہیں رکھتی تھی۔ آج بھی اس کا طرز عمل نہایت منفی ہے۔ حالانکہ ہندوستان کا حجم اور ہندوستانی قوم کی صلاحیتیں اسے دنیا کی اہم ترین قوموں میں شمار کرانے کیلئے کافی ہیں۔ وہاں کی قیادت آج کے دور کے چیلنجز کا سامنا کرنے کی بجائے ہمسایہ ممالک کو غیر مستحکم کرنے میں زیادہ دلچسپی رکھتی ہے۔ انہیں اس بات کا احساس تک نہیں ہے کہ یہ عدم استحکام خود ہندوستان کے وجود کیلئے خطرہ بن سکتا ہے۔

آج جب دنیا میں وسائل پر قبضے کی جنگ شدید ہو گئی ہے۔ بھارت نے اپنا وزن قبضہ گروپ کے پلڑے میں ڈال دیا ہے۔ آخر کار اسے چین، عرب دنیا، جنوبی یورپ، جنوبی ایشیا، جنوبی امریکہ اور افریقہ کا ساتھ دینا ہوگا۔ اگر اس نے اپنے آپ کو تنہا کر لیا تو پھر ایک ہزار سال پیچھے چلا جائے گا۔ یہ ہندوستان کے عوام کی بہت بڑی بدقسمتی ہوگی اور آنے والی صدیاں آج کے غلط فیصلوں کا خمیازہ بھگتیں گی۔ پاکستان کے حکمرانوں کی سوچ بھی بھارت سے ملتی جلتی ہے، وہ اعلانیہ کہتے ہیں کہ ہم بڑی طاقتوں کا ساتھ نہ دیتے تو ہمیں تباہ کر دیا جاتا۔ گویا وہ یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ ان کی پالیسیاں پاکستان کے حق میں نہیں بلکہ مجبوراً انہیں یہ پالیسی اختیار کرنا پڑی ہے۔ تاریخ کے اس فیصلہ کن مرحلے پر پاکستان کے عوام کی سوچ نئے سامراج کے خلاف ہے۔ اس قوم کا یہی اثاثہ آنے والے وقت میں اس کے کام آئیگا۔

میں ملاقات سے واپس آ کر بھی اس بات پر سوچ بچار کرتا رہا کہ ہندوستان، جمہوریت کے باوجود، ایسی قیادت کیوں پیدا نہیں کر سکا، جو اتنی بڑی طاقت کو اس کے شایانِ شان مقام دلا سکے۔ ہندوستان معاشی اور دفاعی طور پر اتنا مضبوط ضرور ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنے اردگرد کے ملکوں میں انتشار پیدا کر سکتا ہے۔ وہ چھوٹے ملکوں کی معیشت کیلئے مسائل بھی پیدا کر سکتا ہے۔ اس سوچ سے ہندوستان کی انا کی تسکین تو ہو سکتی ہے لیکن پورے علاقہ کے انتشار سے ہندوستان خود محفوظ نہیں رہے گا۔ اسے تمام ہمسایوں سے برابری کی سطح پر تعلقات بڑھانا چاہیے اسلحہ جمع کرنے سے ہندوستان مستحکم نہیں ہو سکتا، اسلحہ روس سے زیادہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کسی کے پاس نہیں ہوسکتا۔

میں نے تمہیں 25 جنوری کے خط میں لکھا تھا کہ اجتماعی قیادت سے اجتماعی ذمہ داری کا تصور جنم لیتا ہے۔ اس کیلئے میں نے اس دن کے ہندوستان اور پاکستان کے کھیل کے مختلف پہلو تمہارے سامنے رکھے تھے، میں نے کہا تھا اگر ہمت نہ ہاریں تو اگلی کوشش میں منزل خود چل کر سامنے آجاتی ہے۔ آج کراچی میں اُسی یونس خان کو بہترین کھلاڑی کے اعزاز سے نوازا گیا، انضمام الحق کی کمر تکلیف کی وجہ سے آج کپتانی بھی وہ کر رہا تھا، 25 جنوری کو جو شخص منہ لٹکائے ہوئے مایوسی کی تصویر بنا ہوا تھا آج مردِ میدان تھا۔ انسان کو کبھی بھی حالات سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ میرا ایمان ہے کہ نظامِ قدرت ہر قدم انسان کی مدد کیلئے پردۂ غیب سے باہر آکر اسکی مدد کرتا ہے۔ سب سے پہلے انسان کو خود منزل کی طرف بڑھنا پڑتا ہے اور اگر جُراَتِ رندانہ نہ ہوتو منزل پر پہنچ کر بھی منزل گم ہوجاتی ہے۔

والسّلام!

تمہارا والد!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تاریخ کا پنڈولم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

4 فروری 2006ء

بُشی جی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

آجکل دو واقعات نے پوری دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا رکھی ہے۔ ایک ایران کی جوہری قوت کے بارے میں ہے اور دوسری توہین رسالت کے بارے میں۔ ڈنمارک اور دیگر مغربی ممالک کے اخبارات میں اہانت آمیز کارٹون چھپا ہے۔ جس میں حضرت محمد ﷺ کی شان میں نعوذ باللہ توہین کی گئی ہے۔

حالات کا رخ بتا رہا ہے کہ یہی واقعات آنے والے کئی سو سال کا ایجنڈا طے کر دیں گے۔ دنیا کی معلوم تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ معاشی بالادستی کا توازن (PENDULUM) پنڈولم کی طرح ایک سمت سے دوسری سمت کی طرف حرکت کرتا رہا ہے، کبھی مشرق سے مغرب کی طرف اور کبھی مغرب سے مشرق کی طرف۔ ایک اور حقیقت جس کا اعتراف کر لینا چاہیے وہ یہ ہے کہ بالادست اقوام کے باہمی ٹکراؤ نے بھی کمزور قوموں کی غلامی کی زنجیریں توڑنے میں بنیادی عامل کا کردار ادا کیا، دُنیا پر کسی ایک قوت کی بالادستی زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکی۔

یہ حقیقت بھی اب اظہر من الشمس ہو چکی ہے کہ وسائل پر قبضے کی خواہش نے امریکہ کیلئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے درمیان سرد جنگ شروع ہو چکی ہے اور یہ خلیج آہستہ آہستہ وسیع ہوتی جا رہی ہے۔ بظاہر ایسا نظر آتا ہے، یورو اب ڈالر کیلئے چیلنج بنتا جا رہا ہے۔ عالمی منڈیوں پر قبضے کی خواہش سے مفادات کا ٹکراؤ کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ جو ممالک یورپ اور امریکہ کی اشیاء خریدتے تھے، ان کی تعداد میں واضح کمی آ گئی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔تیل کے ذخائر رکھنے والے اکثر ممالک غربت اور پسماندگی کے دور سے گذر رہے ہیں۔وہاں کے عوام اپنے حکمرانوں کی پُرتعیش زندگی کو امریکی اور یورپی ممالک کی سازش سمجھتے ہیں اور اِن اقوام کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

ایشیائی، افریقی اور لاطینی امریکہ کی اقوام کو اس بات کا احساس ہو چکا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ تجارتی تعلقات بڑھا کر بالادست اقوام کی بلیک میلنگ سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔چین کی معاشی ترقی نے انہیں اِس بات کا حوصلہ دلا دیا ہے کہ اگر امریکہ اور مغربی ممالک کی مصنوعات کا بائیکاٹ کر دیا جائے تو متبادل اشیاء کی کمی نہیں ہوگی۔وہ جان گئے ہیں کہ امریکہ اور مغربی ممالک مہلک ہتھیاروں کی فروخت سے ان کو ہر حالت میں پسماندہ رکھنا چاہتے ہیں۔تم صرف اپنے گاؤں کی معیشت پر غور کرو، جہاں دو ہزار سے زیادہ افراد اپنے کھیتوں پر کام کرتے ہیں۔سردیوں کی ٹھٹھرتی راتوں میں کھیتوں کو پانی دیتے ہیں، اور گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں ہل چلاتے ہیں، انکا بال بال زرعی بنک کے قرضے میں جکڑا ہوا ہے، اپنے بچوں کی فیس ادا نہیں کر سکتے۔علاج کا تو تصور بھی محال ہے، ان کی عورتیں اور بچے کولھو کے بیل کی طرح کام میں جتے رہتے ہیں۔اس محنت سے امریکہ اور یورپ کی فیکٹری میں بننے والے ایک ٹینک کی قیمت ادا کرنا مشکل ہوتا ہے۔مغربی ممالک کا کوکا کولا کو بھی ٹیکنالوجی کے طور پر فروخت ہوتا ہے۔

جنہیں ہم غریب یا پسماندہ ممالک کہتے ہیں، ان کے پاس دنیا کے قدرتی وسائل کا ستر فیصد سے زیادہ حصہ پایا جاتا ہے۔یورپ کی ایجادات اور امریکی بالادستی نے انھیں خود انحصاری سے کوسوں دُور کر دیا تھا، اَب یہ قومیں نئے مرحلے میں داخل ہو چکی ہیں، ان پر بند دروازے کھل چکے ہیں۔مغربی ممالک کیلئے یہ ممکن نہیں رہا کہ وہ اپنی اجارہ داری قائم رکھ سکیں۔وہ اب بھی قدغنوں اور پابندیوں کے ذریعے ان اقوام کے وسائل کو اپنی مٹھی میں لینا چاہتے ہیں۔اب بھارت، چین، برازیل، بلکہ ایشیاء، افریقہ، اور لاطینی امریکہ کی ترقی سے تیل پیدا کرنے والے ممالک کو صارف دستیاب ہیں۔یہ ممالک ایک دوسرے کی ضرورت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بن گئے تو امریکہ اور مغربی ممالک کا مہنگا طرزِ زندگی خود ان کی معاشی موت کا سبب بن جائیگا اور مصنوعی نظام دھڑام سے آ نیچے گرے گا، امریکہ کی زراعت بھی اس مہنگی معیشت کا بوجھ نہیں سہار سکے گی۔

وسائل کی نامنصفانہ تقسیم اور عالمی سطح کے غلط فیصلوں نے ترقی پذیر قوموں کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ اگر اسرائیل کے ایٹمی پروگرام کو قبول کر لیا گیا ہے تو ایران اور پاکستان پر اعتراض کیوں ہے؟ اگر امریکہ کو اپنے وسائل پر اختیار حاصل ہے تو وینزویلا، نائیجیریا، سعودی عرب، افغانستان، ایران، اور عراق کو یہ اختیار کیوں حاصل نہیں؟ یہ سادہ سوالات ہیں جن کا جواب امریکہ اور مغربی تو میں دینا نہیں چاہتیں۔

امریکہ اور مغربی اقوام نے حقائق کا سامنا کرنے کی بجائے اِسے عقائد کی جنگ بنا دیا ہے، کبھی وہ انہیں صلیبی جنگوں کا نام دیتے ہیں، کبھی تہذیبوں کے ٹکراؤ کا نام دیتے ہیں، کبھی ہمارے طرزِ بود و باش کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں، کبھی اسلام کو دہشت گرد مذہب ہونے کا طعنہ دیتے ہیں اور اب براہِ راست رسالت مآب ﷺ کی زندگی کو نعوذ باللہ دہشت گردی کی علامت بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ یہ ان کی ذہنی پسماندگی کی واضح علامات ہیں۔ اصل وجہ معاشی بدحالی کا خوف ہے جو اژدھا بن کر اُنکے سامنے کھڑا ہے۔ وہ تبدیلی کے اس عمل کو روکنے کیلئے جن چیزوں کا سہارا لے رہے ہیں۔ تاریخ ثابت کر چکی ہے کہ وہ عارضی سہارے ہیں۔ تاریخ کے پہیئے کو اُلٹا نہیں گھمایا جا سکتا، جو ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ ہر عمل کا ردِعمل لازمی ہے۔ تاریخ کا پنڈولم حرکت میں ہے۔ فرق صرف اِتنا ہے کہ اس مرتبہ یہ مغرب اور مشرق کی بجائے شمال اور جنوب کے درمیان حرکت کر رہا ہے۔

مغرب کے مادہ پرست اپنی ہوس کا علاج روحانیت میں تلاش کر رہے ہیں: ''عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے''۔

والسّلام!

تمہارا والد!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حیاتِ جاودانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

5 فروری 2006ء

بخشی جی !

السلام علیکم!

آج کل زندگی بر سرِ مقتل گذر رہی ہے۔ میرے اور تختہ دار کے درمیان بس ایک دیوار حائل ہے۔ آج صبح کنجِ قفس سے دیوارِ مقتل کا منظر عجیب تھا۔ دیوار کی بیل پر ایک پھول مسکرا رہا تھا۔ پسِ منظر مین گڑھی ہوئی صلیب میرے آنگن میں جھانک رہی تھی، مرغانِ خوش نوا نے جشنِ طرب بپا کیا ہوا تھا۔ پھولوں اور پرندوں نے متنوع رنگوں اور آوازوں سے فضائے بسیط کو حُسن اور موسیقی کی لازوال دُھنوں کا نذرانہ پیش کیا۔

دیوار کا پھول زندگی اور موت کا فلسفہ سمجھا رہا تھا۔ اُس کے ساتھ بیٹھا ہوا بُلبُل خاموش تھا۔ میں سمجھا شاید وہ میرے ساتھ مل کر آہ و زاری کرنا چاہتا ہے۔ ورنہ پھول کی قربت میں کس چیز کا شکوہ؟ اور زندگی کی موجودگی میں کیسا ماتم؟ ہم دونوں میں درد کا اشتراک نہ تھا۔ اُسے وصالِ یار نصیب ہو رہا تھا اور میں دردِ تنہائی میں مبتلا! ہمارے ہاں مرنے کو بھی وصال کہتے ہیں۔ جب میرے والدِ محترم کا وصال ہوا تھا تو مجھے بچھڑنے میں وصال کی جھلک نظر آئی تھی۔ شاید میری تڑپ کو بُلبُل نے وصالِ یار سمجھ لیا تھا، پھر بھی میرا فیصلہ یہی تھا کہ میرا رونا بُلبُل کا رونا نہیں یہ تو چمن کا رونا ہے۔

اِس مرتبہ موسمِ بہار اپنے وقت سے پہلے آ گیا۔ فصلِ گُل جوبن پر ہے، سردیاں مختصر ہو گئی ہیں، مجھے قبل اَز وقت بہار کا آنا اچھا نہیں لگا۔ گندم کی نرم و نازک بالیاں اِس دُھوپ کی حِدت برداشت نہیں کر سکتیں۔ اُن کی نشو و نما میں کمی رہ جاتی ہے۔ نتیجتاً گندم کی پیداوار کم ہو گی۔ میں اپنی گندم کے کھیت کنارے جا بیٹھا۔ اگر انسان کو تصور کی طاقت نہ ملتی تو اِسکی دُنیا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کتنی تاریک ہوجاتی ۔ میں چشمِ تصور سے گندم کے لہلہاتے کھیت دیکھنے لگا، نیلگوں سبزہ کی بہار میری آنکھوں کو طراوت دینے لگی۔

ایک مرتبہ میمونہ اور میں جہاز میں سفر کر رہے تھے۔ اُس کی عمر چار برس کے لگ بھگ ہوگی۔ ملتان ائرپورٹ سے جونہی جہاز نے اُڑان بھری گندم کے کھیتوں پر نظر پڑتے ہی میمونہ نے اپنی توتلی زبان میں سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ پھر وہ ہر ایک سوال کا جواب بھی خود دیتی! وہ کہہ رہی تھی کہ یہ گندم سبز سے سنہری ہو جائیگی، میں نے کہا ہاں، کہنے لگی پھر اس کی فصل کاٹی جائیگی، میں نے پھر ہاں کہا، وہ کہنے لگی کیا گندم کو بھوسے سے الگ کیا جائیگا؟ گویا اس نے گندم کے گھر آنے، چکی پر اس کے آٹا پیسنے اور آٹا گوندھنے کے تمام مراحل کو بیان کر دیا، آخر میں کہنے لگی آپ کیلئے توے پر روٹی میں بناؤں گی، وہ دُخترِ کسان تھی، اُسے پورے عمل کی سمجھ تھی، اُس کے کانوں نے شب و روز یہی گفتگو سنی تھی۔

مجھے نہیں معلوم میں کون ساذکر چھیڑ بیٹھا ہوں۔ میں تصورات کی دنیا میں اپنے ٹیوب ویل سے نکلتے ہوئے پانی کو دیکھ رہا ہوں، وہ گائیں اور بھینسیں وہ درختوں کے جُھنڈ جن کی چھاؤں میں میرا بچپن گذرا تھا، اب مجھے ٹھٹھرتی ہوئی راتوں کا سناٹا یاد آ رہا ہے، میں پیر بخش کو کھیتوں کو پانی دیتے دیکھ رہا ہوں، برفیلے پانی میں اُس کی سوکھی کانپتی پنڈلیوں پر میری نظر ہے، اُس کے بچوں کی بھوک بڑھاپے میں بھی اسے چین نہیں لینے دیتی، ایک کھیت سے دوسرے کھیت تک پانی کیلئے راستہ بناتے بناتے، اُس کے بازو شل ہو رہے ہیں۔ چودھویں کے چاند کی اُداس اور ٹھٹھرتی ہوئی کرنیں اپنا حُسن کھو رہی ہیں، میں سخت نگران کا رُوپ دھار چکا ہوں۔ جو نہ سوتا ہے، نہ دوسروں کو سونے دیتا ہے۔ کھیت مجھے مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ یہ زمین سے رشتے کی طاقت ہے یا زیادہ سے زیادہ فصل اُگانے کا لالچ؟

یہ سب کچھ بار بار کیوں یاد آ رہا ہے، کہیں میں حقیقت کی دنیا سے آنکھیں چرانے کی کوشش تو نہیں کر رہا۔ مجھے بہار کے قبل از وقت آنے پر بھی اعتراض ہے، بہار تو بہار ہے، غنچہ دِل کھلنے کا موسم، شاخوں پر کونپلیں پھوٹنے کا موسم، میری نظر جیل احاطے کے آم کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پودے پر ہے، جسکی شاخیں بُور سے بھر گئی ہیں۔

میں جامعہ پنجاب سے فارغ ہوا تو ایک الوداعی تقریب میں عہد کر بیٹھا کہ جب بھی مادرِ وطن کو میری ضرورت پڑیگی ہل کی ہتھی چھوڑ کر میدان کارزار میں کود جاؤ نگا۔ جان دے دُونگا، مگر حرمت وطن پر کوئی آنچ نہ آنے دونگا۔ تم جانتی ہو میں عہد شکن نہیں ہوں، خود شکنی اور خودنگری مجھے آزمائشوں کا سامنا کرنے میں مدد دیتی ہے۔ ذات کے عفریت سے نکل کر تصور اور تخیل کی دُنیا میں چلا جاتا ہوں۔ انسان کے تصورات نے دنیا کو کئی رنگوں کا لباس پہنایا۔ سوچ کا بہتا دریا ہر نئے انقلاب کی بنیاد ہوتا ہے۔ خدا نے کہا ہو جا اور وہ ہوگیا (کُن فیکون)۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ایک درباری نے کہا تھا پل جھپکیں اور ملکہ سبا کا تخت آپکے سامنے ہوگا، قران گواہ ہے ایسا ہی ہوا۔ خدا فرماتا ہے میں نے کائنات کو انسان کے قبضہ قدرت میں دیدیا ہے۔

سُبحان اللہ الذی سخرلنا ھذاو ما کُنا لہ مقرنین

مگر انسان کیلئے مشکل کام خود کو مسخر کرنا ہے۔ جب انسان نے دوسروں پر کنٹرول حاصل کرنے کی بجائے خود کو کنٹرول کرلیا تو یہ فتح مبین ہوگی۔ کائنات کی ہر چیز اس کے اشارہ ابرو کی منتظر ہوگی۔

مقتل کی خشک ٹہنی پر موت رقص کرتی ہے۔ پھول نہیں کھلتے۔ جس ٹہنی نے زمین سے رشتہ توڑ لیا وہ دوسروں کو تو موت بانٹ سکتی ہے، خود کو زندگی نہیں دے سکتی۔ میرے سامنے والے پھول کی مسکراہٹ میں اُداسی کا رنگ غالب آ گیا ہے۔ چند لمحوں کا ساتھی مرجھا گیا ہے، بلبل وہاں سے اُڑ کر نیم کے ٹُنڈ مُنڈ درخت پر آ بیٹھا ہے۔ وہ شجر سے پیوستہ رہ کر قافلہ بہار کا استقبال کرنا چاہتا ہے۔ میں یہ سارے واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں، تم میرا خط پڑھتے ہوئے اسکا تصور کرسکتی ہو۔ حقیقت اور تصور کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تم تصورات کی دُنیا کو جتنا حسین کرلوگی، دُنیا اتنی حسین ہو جائیگی۔ اگر تم نے میری جیل کی پابندیوں کے تصور کو خود پر حاوی کرلیا تو میں تم پر مغلوب گماں ہونے کا فتویٰ صادر کردونگا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں نے ایسا نہ بھی کیا تو زمانہ تم پر کم ہمتی کا الزام دھرے گا۔ تم تصور کی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں لوٹ آؤ۔ حقیقت ازلی یہی ہے کہ نہ میں نے اس دنیا میں ہمیشہ رہنا اور نہ تم نے۔ کردار کو موت نہیں آتی، اپنے عمل کو احترام آدمیت کیلئے وقف کر دو۔

میرے سامنے والا پھول اب بکھر چکا ہے مگر اس کی خوشبو ہوا کو معطر کر رہی ہے بلبل کو موسم بہار کے نئے پھولوں کا انتظار ہے۔

والسلام!

تمہارا والد!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

زرعی فارم کی کہانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

میمونہ بی بی!

السلام علیکم!

آج تمہیں اپنے معاشرتی ڈھانچے کے حوالے سے کچھ باتیں بتانا چاہتا ہوں۔ اِس کو سمجھنے کیلئے تمہارے لئے آسان طریقہ یہ ہوگا کہ تم اُس جگہ کی معاشرت کو سمجھو جہاں تم پیدا ہوئی ہو۔ میمونہ بی بی تمہارے دادا محترم بہت بڑے زمیندار نہیں تھے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ ذہنی طور پر زمیندار تھے ہی نہیں۔ وہ ایک فقیر آدمی تھے، سارا علاقہ انھیں ایک انصاف پسند، دیندار اور ولی اللہ کے طور پر جانتا تھا۔ زندگی بھر انھوں نے کسی کو دُکھ نہیں دیا، کسی سے اونچی آواز میں بات نہیں کی۔ اپنے ملازموں کو بھی برابری کا درجہ دیا، اُنھوں نے سادہ زندگی گذاری۔ وہ شان وشوکت کے دلدادہ ہرگز نہ تھے۔ تمہارے پردادا نے اپنے دونوں بیٹوں کیلئے الگ الگ گھر بنوائے۔ ہمارے حصہ میں جو گھر آیا اُس کی عمارت بھی تمہارے پردادا کی بنائی ہوئی تھی۔ تمہارے دادا نے اس میں ایک اینٹ کا اضافہ نہیں کیا، دو کنال میں چند کمرے اور اُنکے سامنے خوبصورت نقش ونگار سے مزین لکڑی کا چھجہ اور اس کے ساتھ ہی ایک بغیر چھت کے کمرہ تھا جس کو تمہارے پردادا غُسل خانے کے طور پر استعمال کرتے تھے، اس کے ساتھ ایک اور اضافی کمرہ تھا۔ جب بڑے بھائی کی شادی ہوئی تو انھیں وہ کمرہ دے دیا گیا۔ جب دوسرے بھائی کی شادی ہوئی تو غُسل خانے پر چھت ڈال کر اُنکا بیڈروم بنا دیا گیا۔ غلے کا گودام جسے صُفہ کہتے تھے، یہ ایک بڑا ہال تھا۔ اِس کے اندر ایک اور دِیوار کھڑی کر کے ایک کمرہ مجھے دے دیا گیا۔ ڈیوڑھی سے بھی مہمان خانے کا کام لینا شروع کر دیا گیا۔ تمہیں اب دُنیا سے اُنکی بے رغبتی کا اندازہ ہو گیا ہوگا، اُنکی چال ڈھال، اُنکا لباس اِس بات کا غماز تھا کہ اُن کا اِس دُنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ میں نے ساری زندگی انھیں سفید

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لباس کے علاوہ کسی اور رنگ کے کپڑوں میں نہیں دیکھا۔

میں نے اُنہیں لوگوں کے اندر مال تقسیم کرتے بھی نہیں دیکھا۔ تمہاری دادی پورا گھر اٹھا کر دے دیتیں، اُنہوں نے اِس پر بھی کبھی اعتراض نہیں کیا۔ ایسے لگتا تھا کہ مال اور دولت سے اُن کا دور کا واسطہ نہ تھا۔ اِسکے باوجود ہمارے چھوٹے سے زرعی فارم پر کام کرنیوالوں کے حالات قابلِ رشک نہ تھے۔ مجھے یاد ہے ہمارا ایک ملازم جندوڈا ہمارا آٹا پسواتے ہوئے مشین کی زد میں آکر اس دنیا سے چلا گیا، اُسکی بیوی ظہراں مائی بڑھاپے میں بے یارو مددگار تھی۔ اُس کے دونوں ہاتھ بھی کانپتے تھے، اُسکی بیٹی کو کسی نے اغواء کیا اور حیدرآباد میں لے جا کر بیچ دیا۔ ظہراں مائی کو ہمارے گھر سے روٹی تو مل جاتی تھی۔ اس کو دیگر ضروریات کیلئے لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلانے پڑتے تھے، مجھے یہ بات کبھی اچھی نہیں لگی۔ ہمارا ملازم اللہ بخش فقیر ہمارے کھیتوں میں کام کرتا تھا، اُس کی بینائی چلی گئی، وہ ہمارے گھر تک دھکے کھاتے ہوئے آتا اُس کو بھی روٹی مل جاتی۔ باقی ضروریات کیلئے وہ گلیوں میں بھیک مانگتا نظر آیا۔ اسی طرح گاموں بڑا لمبا تڑنگا اور طاقتور آدمی تھا، وہ اتنا شہ زور تھا کہ کہا جاتا تھا کہ اِس پر جن کا اثر ہے۔ وہ کافی دیر تک ہل چلاتا رہتا، کسی سے کام کرتے ہوئے، گھاس کترنے کی مشین چلاتے ہوئے وہ واقعی جن لگتا تھا، آخری عمر میں اُسکی بینائی ختم ہوگئی، اکثر ہمارے دروازے پر کھڑا ہوتا تھا، روٹی اسے بھی مل جاتی تھی۔ اسی طرح ہمارا ایک ملازم اللہ بخش جس کو منشی اللہ بخش کہتے تھے، پر شدید بیماری کا حملہ ہوا۔ وہ چارپائی سے لگ کر گھر بیٹھ گیا، اس کی آنکھوں میں ویرانی ہوتی۔ ہم پاس سے گذر جاتے، روٹی اس کو بھی مل جاتی تھی، لیکن اس کی بے کسی کا کوئی چارہ ساز نہیں تھا۔ رمضی مصلّی اسکے دو اور بھائی سرور اور الٰہی بخش ہمارے کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ کوئی ان کو اپنے ساتھ بٹھا کر روٹی کھلاتا نہ ان کو کوئی اپنے برابر بیٹھنے دیتا۔ میں اپنے والد کو ظالم نہیں سمجھتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ خدا کا نظام ہے، میں خدا کو بھی ظالم نہیں سمجھتا، خدا ظالم کیسے ہوسکتا ہے؟ اِس نظام کے اندر اتنی درندگی ہے۔ کہ افراد جتنے بھی پارسا ہوں، وہ بھی اِس نظام کا حصہ بن جاتے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں۔ وہ اِس ظلم اور زیادتی کو برائی ہی نہیں سمجھتے۔ جسکے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے وہ بھی اِس کو برا نہیں سمجھتا۔ اگر صورتحال یہی رہی تو آئندہ سو سال میں بھی ان کی زندگیوں میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوسکتی اور نہ ہی پاکستان کی ترقی کا خواب پورا ہوسکتا ہے۔ ہمیں ایسا نظام لانا ہوگا جسکی وجہ سے علم، انصاف اور علاج غریب کے دروازے پر دستک دے۔ اگر یہ تبدیلی رونما نہیں ہوتی تو ہماری قوم ترقی یافتہ کہلانے کی مستحق کیسے ہوسکتی ہے؟۔

میمونہ بی بی! یہ ایک زرعی فارم کی کہانی نہیں۔ پاکستان کے ہر شہر کی کہانی ہے۔ سوچنا یہ ہے کہ کب تک لوگ اندھیروں میں بھٹکتے رہیں گے، کب تک نظام کے جبر کی چکیوں میں ان کی ہڈیاں پستی رہیں گی، غریبوں کی زبانیں بند کر کے انھیں گونگے اور بہرے بنا کر ان کی آنکھوں کی روشنی چھین کر ان کو ذات پات کی زنجیروں میں باندھ کر ان کے انسان اور مسلمان ہونے پر شکوک وشبہات کی چادر ڈال کر ان کے وجود کی نفی کرتے رہیں گے، کون جواب دے گا؟ آخرت میں تو دینا ہی دینا ہے، اس دنیا میں راہنمائی کس نے کرنی ہے؟

جب ہم اپنے لوگوں کی عزت اور آبرو کی حفاظت کریں گے، تبھی جا کر ہم اللہ کی حفاظت میں ہونگے۔ صرف خدا حافظ کے لفظ کو اللہ حافظ کے لفظ میں بدل دینے سے ہم اللہ کی حفاظت میں نہیں آسکتے!

والسلام!

تمہارا والد!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نیب کی عدالت میں بیان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

15 فروری 2006ء

بشریٰ بی بی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میرے معاشی معاملات کیا ہیں؟ پچھلے سال جب مومنہ اور جویریہ کی فیس ادا نہ ہو سکی تو وہ پریشان ہو گئیں، تم نے انہیں جب یہ بتایا کہ تمہاری تعلیم کے دوران کوئی ایک بھی موقع نہ آیا کہ فیس بروقت ادا کی گئی ہو تو یہ سچ تھا تمہاری فیس ہر دفعہ لیٹ ہو گئی جو مع جرمانہ ادا کی گئی۔ یہ بھی سچ ہے کہ تمہارے خاندان کی مالی حیثیت اتنی مستحکم تھی کہ 1951ء میں پاکستان بننے کے بعد قائم ہونے والی پہلی ٹیکسٹائل ملز میں میرے ددھیال اور ننھیال مالکانہ حقوق رکھتے تھے۔ جب تمہاری ماں، بہنوں کو اور تمہیں عدالت میں پیش کیا گیا کہ تمہارے پاس ناجائز اثاثے ہیں تو جتنے اضطراب کا سامنا مجھے کرنا پڑا وہ میں ہی جانتا ہوں، اُس روز مجھے اپنی کم ہمتی کا بھی شدید احساس ہوا تھا۔

نیب کی عدالت میں حکومت کی طرف سے گواہیاں مکمل کرنے کے بعد مجھے اپنی صفائی میں عدالتی بیان داخل کرانے کو کہا گیا۔ میں یہ ساری تفصیلات پہلے ہی مختلف پیرائے میں بیان کر چکا ہوں۔ قانونی تقاضے پورے کرنے کیلئے جو تحریر عدالت میں جمع کرائی ہے۔ اُسے اِس خط کا حصہ بنا رہا ہوں۔

جنابِ والا!

میرے خاندان کا نسبی تعلق رسالت مآب حضرت محمد ﷺ سے ہے۔ میرے آباؤ اجداد عرب سے ہجرت کر کے، براستہ افغانستان، برصغیر پاک و ہند میں آئے۔ گذشتہ گیارہ بارہ سو سال سے ہمارا خاندان ایک ہی علاقے میں مقیم ہے۔ اڑھائی سو برس تک اُنہوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نے دریائے سندھ اور دریائے ستلج کے علاقوں پر حکمرانی کی۔ اُن کی قلمرو میں موجودہ ضلع لیہ، لال عیسن کروڑ سے لے کر دیپالپور اور ملتان کا پورا علاقہ شامل تھا۔

میری پچھلی پانچ نسلوں کی جائیداد میں بدستور اضافہ ہوا ہے۔ میرے دادا کے دادا حضرت مخدوم محمد شاہ صاحبؒ سے لے کر، میرے پردادا حضرت مخدوم بہار شاہ صاحب رحمۃ اللہ، میرے دادا حضرت محمد نور چراغ شاہ صاحب رحمۃ اللہ، اور میرے والد محترم حضرت مخدوم محمد شاہ ثانی صاحب رحمہ اللہ تک، ہر ایک کی جائیداد اڑھائی سو سالہ سرکاری ریکارڈ کے مطابق بڑھتی رہی ہے۔ یہ تمام جائیداد خریدی گئی ہے۔ اِس جائیداد میں ایک مرلہ زمین بھی مُغلوں، سکھوں اور انگریزوں کی طرف سے جاگیر نہیں ہے۔ ہمارے مریدین سندھ، پنجاب، بلوچستان اور سرحد کے مختلف شہروں میں آباد ہیں۔

میں موجودہ حکومت کا شروع دن سے ہی مخالف ہوں۔ 12 اکتوبر 1999ء سے اکتوبر 2001ء تک مجھے مختلف سیاسی مقدمات میں گرفتار کیا گیا اور پھر عدالتوں کے حکم پر رہا کیا گیا۔ اِس دوران مجھ پر ذہنی و جسمانی تشدد کے پہاڑ توڑے گئے۔ میں نے فوجی حکمرانوں کے غیر آئینی اقدامات کی مخالفت جاری رکھی اور قید و بند کی دُشواریاں بھی مجھے اپنے راستے سے نہ ہٹا سکیں۔ فوجی حکومت قائم ہونے کے اڑھائی سال بعد حکمرانوں نے جنوری 2002ء میں میرے خلاف نیب کی عدالت میں ریفرنس دائر کر دیا اور اتنی تاخیر سے دائر کرنے کی کوئی وجہ بھی بیان نہیں کی گئی۔ ریفرنس میں گھناؤنے اِلزامات کو شامل کیا گیا، جنہیں میری گرفتاری کا جواز بنانے اور میری کردار کشی کرنے کیلئے بار بار پریس میں اُچھالا گیا، پاکستان ٹیلی ویژن پر اُن الزامات کی تشہیر کی گئی۔ میں حیران ہوں کہ ریفرنس میں مذکورہ الزامات ثابت کرنے کی بجائے واپس لے لئے گئے۔ جو الزامات واپس لئے گئے ہیں، واپس لیے گئے الزامات وہ درج ذیل ہیں:

1۔ میرے کروڑوں روپے کے اندرون و بیرون ملک بینک اکاؤنٹ پکڑے گئے ہیں۔

2۔ میں نے غریبوں، بیواؤں اور یتیموں کے پچاس پچاس ہزار روپے خرد برد کر لیے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

3۔میری بیٹی نے سکولوں کے ذریعے کروڑوں روپے کی تنخواہ وصول کر کے متعلقہ افراد تک نہیں پہنچائی۔

جناب والا!

الزامات تو واپس ہو گئے مگر اس سے قوم کے سامنے جو میری اور میرے خاندان کی تضحیک ہوئی ہے، اُس کا حساب کون دے گا۔ میں چودہ ماہ جیل میں رہا، جیل سے قومی اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لیا، تمام تر نامساعد حالات کے باوجود میرے حلقہ انتخاب کے باشعور عوام نے مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے مجھے اپنی نیابت کیلئے موزوں قرار دیا۔ یہ نیب کے جھوٹے پراپیگنڈے کا عوام کی طرف سے بھرپور جواب تھا۔ ہائی کورٹ نے مجھے رہا کر دیا۔ میں نے قومی اسمبلی میں پہنچتے ہی ایل ایف او کے غیر آئینی اقدامات کے خلاف تحریک چلائی۔ مجھے 17 سیاسی جماعتوں، جو اے آر ڈی کے پلیٹ فارم پر متحد ہیں، کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ اسمبلی میں میرے ہوتے ہوئے حکمرانوں کو، ایل ایف او کو، آئین کا حصہ بنانا ناممکن نظر آ رہا تھا۔ اُنہوں نے میری جمہوری سیاسی سرگرمیوں سے خائف ہو کر مجھے بغاوت کے ایک جھوٹے مقدمے میں گرفتار کر لیا۔ میں نے جیل سے وزیر اعظم کے انتخاب میں حصہ لیا۔ متحدہ اپوزیشن جس کے ممبران کی تعداد 153 کے قریب ہے۔ اُنہوں نے میری بھرپور حمایت کی، موجودہ ریفرنس اسی پس منظر میں دائر کیا گیا۔

جناب والا!

میرے خلاف تمام الزامات جھوٹ کا پلندہ ہیں۔ نیب کا ادارہ سیاسی انتقام کیلئے بنایا گیا۔ اس ادارے کو موجودہ حکمرانوں کے خلاف ایک بھی ریفرنس دائر کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر پچھلے چھ سالوں میں حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف میں سے کسی ایک سیاستدان نے بھی کرپشن نہیں کی تو پھر فوجی وردی یا فوجی اقتدار کا کیا جواز ہے۔

جناب والا!

قومی ادارہ برائے احتساب National Accountability Bureau کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مخفف NAB ہے، جس کا مطلب ہے پکڑ لینا۔ مدنیت کے ساتھ ہی احتساب کے عمل کو لازمی قرار دیا گیا۔ کوئی معاشرہ احتساب کے بغیر پنپ ہی نہیں سکتا۔ ہمارے مذہب نے بھی احتساب کا حکم دیا ہے۔ جہاں حکام کے پاس بے لگام طاقت ہو، وہاں کرپشن اور رشوت خوری کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ پاکستان میں طاقت تین گروہوں کے پاس رہی ہے۔ جاگیر دار، جرنیل اور افسر شاہی۔ کاروباری طبقہ بھی عوام کو لوٹنے کیلئے رشوت اور کرپشن کا ایک بڑا عمل ہے۔ تیسری دُنیا کے بے بس عوام اِن طاقتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ جمہوری معاشروں میں احتساب ووٹ کے ذریعے بھی ہو جاتا ہے اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے بھی۔ بعض اوقات کسی اخبار میں ناقابلِ تردید بیان، کسی بھی سیاستدان جنرل یا افسر کو ہمیشہ کیلئے پبلک آفس سے باہر نکال پھینکنے کیلئے کافی ہوتا ہے۔ احتساب کے اِس عمل سے معاشرتی قدریں اُجاگر ہوتی ہیں۔ ہر غلط کار کا انجام دوسروں کے لئے سبق آموز ہوتا ہے۔ پاکستان میں بھی دوسروں معاشروں کی طرح احتساب کا نعرہ بہت مقبول ہے، ہر فوجی حکومت اسے اپنے فوجی مقاصد کیلئے استعمال کرتی ہے۔ یہ معاشرے کو کرپشن اور رشوت خوری سے بچانے کے نعرے پر اقتدار کا جواز تراشتی ہے۔ ایبڈو جیسے قانون بنا کر اور فوجی عدالتیں لگا کر اپنے مخالفین کو خوفزدہ کر دیتی ہیں۔ ایوب خان نے سینکڑوں سیاستدانوں کو "ایبڈو" قانون کے تحت سیاست بدر کر دیا۔ کچھ سر پھروں نے ایبڈو کے خلاف مقدمے لڑے مگر سیاسی طور پر کمزور ہو کر مٹ گئے۔ جب ایوب خان کو سیاسی حمایت کی ضرورت تھی تو اُنہوں نے انہی ایبڈو زدہ سیاستدانوں کے دروازوں پر دستک دی۔ اِن میں سے ایک مثال مخدوم زادہ حسن محمود کی ہے۔ ایوب خان مادرِ ملت کے خلاف حمایت حاصل کرنے کیلئے جمال دین والی (رحیم یار خان) جیسے دُور افتادہ گاؤں میں سر کے بل گئے تھے۔

جناب والا!

ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ کا دائرہ اختیار نیب کے معاملے میں محدود ہوتا ہے۔ ان کا اپنا چیئرمین، فوجی وردی میں ملبوس، ایک لیفٹیننٹ جنرل ہوتا ہے۔ لیکن وہ کسی فوجی کا احتساب

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نہیں کرسکتا۔ عملی طور پر جاگیردار بھی اِس احتساب سے ماورا ہیں۔ متوسط طبقے کے سیاستدان اُنکا پسندیدہ اور آسان ہدف ہیں۔ دُنیا کو دکھانے کیلئے شروع میں چند صنعت کار اور بیوروکریٹ بھی پکڑے گئے کیونکہ دُنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کیلئے یہ ضروری تھا۔ ایک آدھ ریٹائرڈ فوجی افسر پر بھی مقدمہ بنایا گیا اور انہیں اتنی آسائشیں پہنچائیں جو کسی والیِ سیاست کو تخت پر حاصل ہوتی ہیں۔

اِنتہا تو یہ ہے کہ جن سیاستدانوں کے خلاف اِسی حکومت نے فردِ جرم عائد کیا، اُنہیں سالہا سال جیلوں میں رکھا، بعد میں اِنہی کو وزارتیں دی گئیں۔ اگر کوئی تنقید کرے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ اُنہیں عوام نے منتخب کیا ہے لیکن اب اُن سے کون پوچھے کہ چلیئے عوام نے کم علمی کی بنیاد پر منتخب کر لیا لیکن آپ تو اُن کے اعمال سے باخبر تھے۔ آپ کے نزدیک تو وہ چور ہیں، آپ نے چوروں کو خزانہ کیوں سونپ دیا؟ لیکن جو حقیقت سے پردہ اٹھائے، وہ غدار ہے یا باغی۔ نیب کی اصلیت عوام پر آشکار ہو چکی ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ عوام کا ہر طرح کے احتساب سے اعتماد اُٹھ گیا ہے۔ وہ کسے چور سمجھیں اور کسے چوکیدار۔

میرے لئے نیب کی گرفتاری ناقابلِ یقین تھی۔ میں نے اپنے پورے سیاسی کیریئر کو اِس انداز سے ڈھال رکھا تھا کہ اس میں دولت جمع کرنے یا اختیارات کے ناجائز استعمال کا تصور تک نہ تھا۔ میں نے ساری زندگی کبھی بجلی یا ٹیلی فون کے بل ادا کرنے میں بھی کوتاہی نہیں برتی۔ پوری زندگی میں نے کبھی ٹریفک کے اشارے کی خلاف ورزی نہیں کی۔ اپنے خاندان میں کسی کو ملازمت نہیں دلوائی۔ میرا بھانجا تسلیم عالم ملازمت کے شوق میں بی اے، ایل ایل بی (B.A,L.L.B) کرنے کے بعد عمر زیادہ ہونے سے بچنے کیلئے پولیس میں کانسٹیبل بھرتی ہو گیا۔ دوسرا بھانجا فیض مصطفیٰ شاہ بی اے، پی ٹی سی (B.A,P.T.C) کر کے پرائمری سکول کا ٹیچر ہے۔ میرے خاندان کے اکثر افراد اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ شاہد بہار ہاشمی جو میرا بھتیجا اور داماد ہے، ایم اے۔ ایل ایل بی (M.A,L.L.B) ہے۔ وہ کاشت کاری کر رہا ہے۔ ایک بھتیجا علمدار حسین شاہ ایم بی اے (M.B.A) ہے، وہ کاشت کاری

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کر رہا ہے۔ اور ایک بھتیجا عالم ایل ایل بی (L.L.B) ہے۔ میں نے کبھی اپنے کسی عزیز کو ملازمت دلانے کیلئے اپنا سیاسی اثر و رسوخ استعمال نہیں کیا۔ میری دو بھانجیاں اور دو بھتیجیاں ایم اے پاس ہیں۔ باقی بھانجیاں، بھتیجیاں بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ میری ایک بیٹی ایم اے اکنامکس (M.A-Economics) ہے، دوسری بیٹی نے ایم بی اے کیا ہے اور تیسری بیٹی نے ماس کمیونیکیشن میں ایم اے کیا ہے۔ میری چوتھی بیٹی کنئیرڈ کالج لاہور سے گریجوایٹ ہے، تاہم میرا کوئی بھی دُور نزدیک کا رشتہ دار سرکاری ملازمت میں نہیں ہے۔

میری جائیداد ہی ہے جو میرے آباؤ اجداد کے پاس انگریزوں کے آنے سے پہلے تھی یا میرے دادا اور والد نے خریدی۔ میں خاندان کا پہلا شخص ہوں جس نے دو سو سال پہلے کی جائیداد فروخت کر کے سیاست کی۔ میری بیوی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے، اس کو اپنے والد محترم مخدوم مہر حسین شاہ اور مخدوم ہادی شاہ کی ساری زرعی جائیداد اپنے ورثے میں ملی اور یہ جائیداد بھی انگریزوں کے دور سے پہلے کی ہے۔ ہماری ساری جائیداد 1846ء کے بندوبست اراضی میں موجود تھی۔ اس کا ریکارڈ نیب کو فراہم کر دیا گیا ہے اور ملتان کے ضلعی سرکاری دفاتر میں موجود ہے۔ کچھ جائیدادیں فروخت کر کے میں نے اسلام آباد میں پلاٹ خریدا، یہاں کوئی بیوقوف ہی پلاٹ خریدتا ہے۔ بااثر لوگوں کیلئے یہ مفت کا شہر ہے۔ گھر بنانے کیلئے تمام سرکاری ملازمین اور قومی اسمبلی کے ارکان کو زمین تقریباً مفت ملتی ہے بلکہ کمرشل پلازے اور ان پر عمارتیں تعمیر کرنے کیلئے کروڑوں روپے کے قرضے بھی دیئے جاتے ہیں۔ میں نے اپنی رقم سے گھر تعمیر کرایا۔ اسمبلی توڑی گئی تو میں واپس ملتان چلا گیا۔ اسلام آباد کا گھر فروخت کر کے ملتان میں گھر کی تعمیر شروع کی جو آج دس سال بعد بھی مکمل نہیں ہو سکی۔ اسلام آباد کے گھر کی فروخت سے ایک گاڑی بھی خریدی جو ملتان کے گھر کی قسط ادا کرنے کے کام آئی۔

اب میرے پاس صرف 1985ء ماڈل کی ایک گاڑی ہے، اُنیس سال پرانی یہ گاڑی اکثر بیچ سڑک کھڑی ہو جاتی ہے۔ یہ نامکمل گھر اور چلنے سے زیادہ تھکنے والی یہ گاڑی، میری

www.iqbalkalmati.blogspot.com

زندگی بھر کی کمائی ہے۔ وراثتی زرعی جائیداد کی آمدن نیب کے سرکاری گواہوں کے مطابق کروڑوں میں بنتی ہے اور میری بیوی کی زرعی زمینیں بھی اب سرکار کی تحویل میں ہیں۔ مجھے نیب کی عدالت میں پیش کیا گیا، میں نے عدالت کو فیض احمد فیض کے چند اشعار سنائے۔

ہم خستہ تنوں سے محتسبو کیا مال و منال کا پوچھتے ہو
جو عمر سے ہم نے بھر پایا سب سامنے لائے دیتے ہیں
دامن میں ہے مشت خاک جگر، ساغر میں ہے خون حسرت مے
لو ہم نے دامن جھاڑ دیا لو جام الٹائے دیتے ہیں

57 دن تک مجھے شدید ذہنی اور جسمانی تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ انہی دنوں نیب کے عقوبت خانے میں، جہانگیر بدر کے ایک ساتھی نے جان کی بازی ہار دی تھی۔ مجھے اُس سے بھی زیادہ تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ میری گرفتاری پر جو فردِ جرم عدالت میں پیش کی گئی وہ خوفناک تھی۔ مجھ پر سینکڑوں سکول کھول کر کروڑوں روپے سرکاری خزانے سے لینے کا الزام تھا۔ یہ الزام بھی تھا کہ غریبوں کے نام پر پچاس ہزار کے صوابدیدی فنڈ زمیں نے اپنی ذات پر خرچ کیے۔ بیرون ملک اکاؤنٹس میں کروڑوں جمع کرانے کا الزام بھی لگایا گیا، اِن الزامات کی ٹی وی، ریڈیو اور اخبارات میں تشہیر کی گئی۔ میرے زیر تعمیر گھر کی ایسی تصاویر شائع کی گئیں کہ مجھے بھی وہ تاج محل نظر آنے لگا۔ میں سوچنے لگا اگر میں نے یہ سب کچھ کیا ہے تو بہت برا کیا ہے مگر عدالت میں نیب نے سارے الزامات واپس لے لئے اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہونے دی۔ قوم کے سامنے میرا مسخ شدہ چہرہ پیش کرنے والوں کا اپنا چہرہ مسخ ہو گیا۔ درحقیقت یہ نیب کی حکمت عملی کا حصہ ہے کہ وہ عوام کے سامنے سیاستدانوں کی بھیانک تصویر پیش کرتے ہیں۔ ہر آدمی متعلقہ شخص سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ اس کے بعد نیب کیلئے آسانی ہو جاتی ہے کہ وہ اسے جتنا عرصہ چاہے جیل میں رکھے یا اس کے خاندان پر ظلم کرے۔ میں نے اس ظالمانہ شکنجے کو عوام کے سامنے بے نقاب کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ آئندہ بلیک میلنگ کا کوئی ہتھیار فوجی حکمرانوں کے پاس نہ رہے۔ فوجی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قیادت نے یہ شکنجہ بہت سوچ سمجھ کر بنایا تھا۔ جس سے ملٹری کورٹس والا کام لینا تھا۔ احتساب کے نام پر عدالتوں کی آزادی سلب کر لی گئی۔ ذرائع ابلاغ کو صرف تصویر کا ایک رُخ دکھانے کی اجازت دی گئی۔ اخبارات کے بلیک میلرز کو جس نے چندہ دینے سے انکار کیا، انہیں نیب کے ذریعے چن چن کر انتقام کا نشانہ بنایا گیا۔ متوسط طبقے کی قیادت کی کردار کُشی کچھ اخبارات کا محبوب مشغلہ ہے۔ جو بھی اُن کی بلیک میلنگ میں نہیں آتا، اسکے خلاف فیچر چھاپ دیتے اور نیب والے ان لوگوں کے پیچھے پڑ جاتے۔ چونکہ نیب کے پاس بنیادی مواد جمع کرنے کا نظام نہیں تھا اور نہ ہی وہ احتساب کے عمل کو سنجیدگی سے لے رہے تھے، وہ اس طرح کے اخبارات کے جھوٹے پروپیگنڈے کو خوشدلی سے قبول کر کے اسے اپنی کامیابیوں کی فہرست میں شامل کر لیتے۔ بلیک میلرز کو مزید لوٹنے اور ان کی جائیدادوں پر ناجائز قبضے کا کھلا لائسنس مل جاتا۔ ایک بلیک میلر نے مجھ سے بھی بیس لاکھ روپے کا مطالبہ کیا۔ میں اُس کی اس جسارت پر حیران رہ گیا۔ میں نے اُس کے ساتھی کو کہا" کسی ناخوشگوار واقعے سے بچنے کیلئے اُسے یہاں سے لے جائیں۔ وہ کئی سال تک میرے خلاف جھوٹی خبریں چھاپتے رہے، میں نے اس کی پرواہ نہیں کی۔ "مجھ پر اپنی آمدن سے چالیس لاکھ کے زائد اثاثے کا الزام لگایا گیا ہے۔ میری تین لاکھ کی 19 سالہ بوڑھی گاڑھی کی قیمت 20 لاکھ بتائی گئی۔ میں نے نیب حکام سے کہا" آپ اُسے دو لاکھ میں مجھ سے خرید لیں۔ "دوسری گاڑی جو میں نے بیچ کر 20 لاکھ کے مکان کی قسط ادا کر دی، وہ قسط کے 20 لاکھ میرے مکان کی مالیت میں شمار کرتے ہیں اور پھر یہ کہتے ہیں، وہ گاڑی ابھی تک اضافی جائیداد کے طور پر گنی جائے گی۔

انہوں نے گوجرانوالہ میں گاڑی کے نئے مالکوں کو جا پکڑا۔ دو سال قبل میں اپنے دوست اور ساتھی رانا تنویر سے جیل میں ملاقات کیلئے گیا، کہنے لگے "نیب نے گذشتہ 9 ماہ سے کسی سیاستدان کو گرفتار کیا اور نہ ہی کسی کے خلاف نیا مقدمہ بنایا ہے۔" دو مہینے بعد میں ان کے ساتھ جیل میں تھا۔ میں نے اس سے کہا" مقدمہ بھی موجود ہے اور ملزم بھی حاضر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوں اور رہونگا۔ میں نے حکومت کی سیاسی معاشی پالیسیوں کو قومی مفادات کے خلاف پایا ہے۔فوج کے سیاسی کردار کو غیر آئینی سمجھتا ہوں۔ میں پاکستان مسلم لیگ (ن) کا قائم مقام صدر ہوں۔اے آرڈی اور مسلم لیگ دونوں کی پارلیمانی پارٹیوں کا منتخب لیڈر رہوں۔فوجی حکمران مجھے اپنے غیر آئینی اقدامات کے راستے کی سب سے بڑی دیوار سمجھتے ہیں۔مشرف دور حکومت میں مجھے دسویں بار گرفتار کیا گیا ہے۔

جناب والا!

مجھ پر جتنے الزامات عائد کئے گئے ہیں ان میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔لیکن اپنے اصولی موقف کی وجہ سے میں ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار تھا۔ مجھے یقین تھا کہ موجودہ حکمران مجھے اپنے بدترین انتقام کا نشانہ بنائیں گے۔لیکن یہ تصور بھی نہ تھا کہ مجھے بغاوت،غداری،سازش،جعلسازی اور کرپشن جیسے بے بنیاد الزامات کا سامنا کرنا پڑیگا۔

دستخط!

جاوید ہاشمی

وطن کی بیٹیو!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

السلام علیکم!

میں آپ سے ایسے مقام سے مخاطب ہوں جہاں ذہن پر لگے ہوئے کئی جالے اُترنا شروع ہوتے ہیں اور چیزوں کی شناخت میں آسانی ہو جاتی ہے۔ پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ

الطلبو العلم فریضة علیٰ کل مسلمة و مسلما

اللہ کے رسول ﷺ کا حکم ہے کہ تمام مسلمان مرد اور عورتوں پر علم حاصل کرنا فرض ہے۔ چودہ سو سال میں علماء دین نے عورتوں کی تعلیم پر کوئی شرعی پابندی نہیں لگائی۔ رسالت مآب ﷺ کی زندگی اور اس کے بعد کے دور میں خواتین دین کا علم آگے منتقل کرنے میں مردوں سے کسی صورت میں پیچھے نہیں رہیں۔ حضرت عائشہؓ، حضرت خدیجہؓ، حضرت اُمِ سلمہؓ نے احادیث کا علم آگے منتقل کیا۔ حضرت زینبؓ، حضرت فاطمہ الزہراؓ کی زندگی پوری اُمت کیلئے مشعلِ راہ ہے۔ خلافتِ راشدہ کے دور میں ان کے علم کے حصول پر کوئی قدغن نہیں رہی۔ لیکن جونہی بادشاہوں کا دور شروع ہوا، قبائلیت عود کر آئی۔ بادشاہت نے عورتوں کی آزادی اور ان کے علم کے حصول پر سب سے زیادہ حملہ کیا اور بعد میں قبائلیت نے عورتوں پر تعلیم کے دروازے بند کر دیئے۔ نہ صرف دروازے بند کیے بلکہ اس کو شریعت کا تقاضا کہہ کر دین اسلام کی توہین کی۔

جو جگہ علم کا منبع تھی اب اسی سعودی عرب میں عورتوں کی تعلیم کی شرح پوری دنیا میں سب سے کم ہے۔ اگر میں مبالغہ نہیں کر رہا تو دوسرے مسلم معاشروں میں بھی عورتوں کو ایک طرف اٹھا کر پھینک دیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ سے محبت کا دعویٰ کرنیوالوں نے ان کے اس حکم کی تعمیل نہیں کی بلکہ اس حکم کی توہین کی۔ آج جو تعلیم آپ حاصل کر رہی ہیں، یہ ہمارے مذہب کے تقاضوں کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ہمیں اعتراف کرنا پڑے گا کہ بچیوں کی تعلیم کی جو یلغار

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے یہ مغربی معاشروں کے دباؤ کی وجہ سے ہے۔ انھوں نے اپنی عورتوں کو اپنے معاشرتی معاملات میں برابری کی سطح پر لا کر کھڑا کر دیا ہے اور یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ کچھ معاملات میں انھوں نے اپنی عورتوں کے کندھوں پر ایسا بوجھ ڈال دیا ہے جو فطری طور پر عورتوں کے اٹھانے کا نہیں تھا۔ روشنی کی کرن جو آپ تک پہنچی ہے یہ اسلامی معاشرے کی وجہ سے نہیں ہے لیکن ہے عین اسلام۔ اللہ تعالیٰ نے قران حکیم میں فرمایا کہ "اگر تم نے میری بات کو آگے نہ بڑھایا تو میں دوسری قوم پیدا کرلونگا" یہ حقیقت اپنی جگہ پر موجود ہے کہ یہ کام ہم مغربی معاشرے کی وجہ سے سرانجام دے رہے ہیں اور اللہ نے یہ کام دوسری جماعتوں اور معاشروں سے لے لیا ہے۔ رسالت مآب ﷺ کا بنیادی فریضے کیلئے جو حکم تھا، اس پر عملدرآمد ہم غیروں کی وجہ سے کر رہے ہیں۔

دوسری بات جو میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ پردے کے احکامات اسلام میں بالکل موجود ہیں اور میں حجاب کے حق میں ہوں۔ مگر ہندو مذہب میں اگر آپ راجپوت ہندوؤں اور گجروں کے پردے کی تفصیلات میں جائیں تو آپ دنگ رہ جائیں گی کہ وہاں پر لوگوں کی موجودگی میں بیوی ساری عمر اپنے میاں سے پردہ کرتی ہے، خواہ ان کی عمر نوے سال سے بھی بڑھ جائے۔ میں کئی ایسے خاندانوں کو جانتا ہوں جن میں یہ پردہ آج بھی اسی طرح سے موجود ہے۔ پردے کی بات صرف اسلام نے نہیں کی اور معاشروں میں بھی یہ بات موجود ہے۔ اسلام پردہ کی پابندی مردوں پر بھی لگاتا ہے۔ افریقہ کے کئی قبائل اور ملک ایسے ہیں جہاں اب بھی مرد پردہ کرتے ہیں لیکن عورتیں نہیں کرتیں۔ جہاں تک بالوں کی نمائش کا تعلق ہے تو یہ عرب معاشرے میں مردوں کو بھی ہر حالت میں چھپانے پڑتے ہیں، اس کیلئے اسی طرح کا لباس تیار کرنا پڑتا ہے جیسا عورتوں کے بال چھپانے کے لئے ہے۔ آپ نے کسی سعودی عرب کے باشندے یا کسی عالم دین کو شاید ہی کبھی ننگے سر دیکھا ہو۔ اگر عورت چہرے کا پردہ کئے بغیر طواف کرسکتی ہے تو عملی زندگی کی مشکلات کے پیش نظر اس پر اجتہاد کیا جا سکتا ہے۔ دیہات میں نوے فیصد عورتیں رات دن محنت مزدوری والے کام

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کرتی ہیں ان کے لئے خاص قسم کا پردہ کرنا ممکن ہی نہیں دس فیصد برقعہ سٹیٹس سمبل کے طور پر اوڑھتی ہیں قرآن حکیم میں کام کرنے والی عورتوں (کنیزوں) اور محصنات کے لئے پردے کا الگ معیار قائم کیا ہے۔

میں کوئی مذہبی سکالر نہیں ہوں لیکن میں یہ بات ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ آپ آگے بڑھ کر مردوں کے شانہ بشانہ اپنی سرگرمیوں کو منظم کریں۔ اسلام نے آپکے انجینئر، ڈاکٹر ہونے پر بھی پابندی نہیں لگائی۔ آپکے کاشتکار یا دکاندار ہونے پر پابندی نہیں لگائی، آپکے اخبار نویس یا استاد ہونے پر بھی پابندی نہیں لگائی۔ کسی بھی معاشرتی کام میں آگے بڑھنے پر قران وحدیث نے کہیں بھی پابندی نہیں لگائی۔ نہ ہی آپکو پیچھے رکھ کر آپکی معاشرتی سرگرمیوں کو محدود کیا گیا ہے۔ قران وحدیث نے عورت کے سربراہ ہونے پر بھی پابندی نہیں لگائی، اس کے حکومتی معاملات چلانے میں مشاورت پر کہیں پابندی نہیں۔

عورت کا جو تصور آج ہمارے معاشروں میں ہے، اسلامی تعلیمات میں اس کا وجود نہیں ہے۔ آپکو اس دور میں آگے بڑھنا ہوگا۔ نیلی وردیوں میں سکول جانیوالی بچیاں میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں۔ جب میں انھیں دیکھتا ہوں تو میرا دل خوشی سے بھر جاتا ہے۔ مجھے جب ہسپتال یا عدالتوں میں پیشیوں کیلئے لیجاتے ہیں، میں سڑکوں پر چھوٹی چھوٹی بچیوں کو سکولوں کی طرف رواں دواں دیکھتا ہوں، تو یہ پھولوں کی لہلہاتی ہوئی کیاریاں بہت اچھی لگتی ہیں۔ ان کے چہروں پر عزم کی داستاں لکھی ہوتی ہے۔ آگے بڑھنے کا جذبہ موجود ہوتا ہے۔ وہ بھرپور کردار ادا کرنے کی تیاری میں لگی ہوئی ہیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی بچیاں کل کی راہنما ہیں۔ میں اِن تعلیم یافتہ ماؤں کی آغوش میں آنے والی نسل کا تصور آنکھوں میں بسالیتا ہوں۔ قوس وقزح کے یہ رنگ میرے اندر سے یوں پھوٹتے ہیں کہ میں اِن میں نہا جاتا ہوں۔ میری خوشی اُبل کر میرے لفظوں میں ڈھلنا چاہتی ہے۔ خدا کرے تم آگے بڑھتی رہو۔ اس بھٹکی ہوئی قوم کو تم ہی راہ راست پر لا سکتی ہو۔ میں آج بھی اُس بچی کی آواز سن رہا ہوں جو حشر کے دن اپنے ننھے منے ہاتھ اٹھا کر کھڑی ہو جائیگی اور اللہ سے پوچھے گی کہ مجھے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کس جرم کی سزا میں زندہ گاڑا گیا تھا:

فَبِأَيِّ ذَنبٍ قُتِلَت

"بتاؤ مجھے کس جرم میں زندہ گاڑا گیا تھا"

تمہاری صلاحیتوں کو قتل کرنے اور تمہاری شخصیت کی توڑ پھوڑ کرنیوالوں سے بھی ضرور پوچھا جائیگا اور تمھاری صلاحیتوں پر عدم اعتماد کرنے والوں سے بھی پوچھا جائے گا۔ مرد کو انسانیت کی معراج پر پہنچایا گیا ہے، تمہیں ان سے الگ کر کے سوچنا تمہیں قتل کرنے کے برابر ہے۔ اس قتل عام میں ہماری کئی نسلیں شریک رہی ہیں مگر اب ہر ایک کو باور کرانا ہے کہ ہماری بیٹیاں ہمارے مستقبل کی امین ہیں۔ تخلیق کا عمل، ایک نسل کی تربیت کا عمل، معراج انسانیت کا عمل ہے۔

میری بیٹیو!

آگے بڑھو، آنیوالا زمانہ آپکا ہے، آپکے راستہ میں کھڑی ہوئی جہالت کی دیواریں گر رہی ہیں، فرد کی بالادستی کی دیواریں گر رہی ہیں، اب اپنے آپ کو کمزور مت سمجھنا، ناتوانی کا دور ختم ہو چکا ہے۔

اپنے علم، فکر اور سوچ سے دُنیا میں اُجالا کرنے کیلئے خود کو تیار کرو۔ ماں کے پاؤں تلے جنت ہوتی ہے، تم اس دھرتی کو بھی جنت میں تبدیل کر سکتی ہو۔ تمہیں گھر کی چار دیواری میں بند کر کے تمہاری صلاحیتوں کی توہین کرنے کا زمانہ گذر چکا ہے۔ اپنے آپ کو علم کی طاقت سے مسلح کر لو اور اپنے فکر کی روشنی کو بلندیوں پر پہنچا دو۔ زمانہ آپکی یلغار کا منتظر ہے، وہ قوم کبھی بھی ترقی نہیں کر سکتی جس کی مائیں علم کی دولت سے بہرہ ور نہیں ہیں۔ آدھی آبادی کو قید میں ڈال کر ترقی کا خواب دیکھنا دیوانگی ہے اور پھر تم تو ایک ایسے دین کی پیروکار ہو جو اس وقت تمہیں علم پھیلانے کی ہدایت کر رہا تھا، جس وقت بیٹیوں کو زندہ دفن کیا جاتا تھا۔ عورت کو بھی جائیداد سمجھ کر وراثت میں تقسیم کر دیا جاتا تھا، اس وقت تمھاری وراثت کا حق تسلیم کیا گیا۔ مگر آج تک ہم میں سے کوئی بھی تمہیں تمہارا حق دینے کو تیار نہیں۔ تم میں اتنی سکت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہونی چاہئے کہ تم اپنا حق چھین سکو۔ بعض مذاہب میں عورتوں کو مجرد رکھ کر ساری زندگی داسی کے طور پر یا نن کے طور پر گذارنا پڑتی ہے، لیکن قران نے عورت کی زندگی کو رہبانیت کے حوالے کر کے ویرانے میں نہیں ڈالا، اس کی جیتی جاگتی صلاحیتوں کو دفن نہیں کیا۔

یورپ نے سولہویں صدی عیسوی میں عورت کی آزادی کی بات شروع کی لیکن اُس کو ووٹ کا حق 1940ء تک حاصل نہ تھا۔ روسو (Rousseau) اور والٹیئر (Voltaire) پہلے فلاسفر ہیں جنہوں نے عورت کے حق میں آواز اُٹھائی۔

مصر، یونان، ایران اور عربوں کی قدیم تہذیبیں، تمام ناکردہ گناہوں کا بوجھ عورت پر ڈالتی تھیں۔ کمیونزم کے قائم ہو جانے کے بعد بھی رُوس میں عورتوں کی خرید وفروخت ہوتی رہی۔ لینن (LENIN) نے اپنی ناکامی کا اعتراف کیا۔ حضور ﷺ اُس معاشرے میں جہاں بیٹیاں زندہ گاڑی جارہی تھیں، اپنی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی آمد پر اُن کے استقبال کیلئے کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔

پانچ ہزار سال پہلے موہنجوداڑو میں ناچنے والی لڑکی کی روح چیخ چیخ کر پوچھ رہی ہے کہ عورت کو دل بہلانے کا کھلونا کب تک سمجھا جاتا رہے گا؟ تم اپنے ہاتھ میں اللہ کی کتاب پکڑ کر جواب دے سکتی ہو!!!۔

والسلام!

خیر اندیش!

جاوید ہاشمی!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ماں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

بشریٰ بی بی!

السلام علیکم!

آج اخبار میں پڑھا کہ مجیب الرحمان شامی صاحب کی والدہ محترمہ اِس دنیا سے کوچ کر گئی ہیں (انا للّٰہ وانا الیہ راجعون) ہم سب انہیں امی جی کہتے تھے۔ اخبار میں جب ان کا نام چھپا تو میں حیران رہ گیا کہ ان کا کوئی اور نام بھی تھا۔ مجھے جیل میں پابندیوں کا احساس رہتا ہے لیکن جب کسی عزیز ترین ہستی کی موت کی خبر ملتی ہے تو یہ درد سوا ہو جاتا ہے۔ امی جی کی موت پر میرا پہلا ردعمل یہ تھا کہ میری ماں کو دوسری مرتبہ موت نے آن گھیرا ہے۔ امی جی عمر رسیدہ تھیں، میں نے اُن کی زندگی کے آخری تیس سال دیکھے ہیں۔ ان کے دو روپ تھے۔ اس کے علاوہ میں نے ان کی زندگی کا کوئی رنگ نہیں دیکھا، وہ پہلے بیوی تھیں اور پھر ماں۔

انہوں نے مجھے جتنا پیار دیا، اِس کا اظہار الفاظ میں ممکن ہی نہیں۔ صرف اِس بات سے اندازہ کر لو کہ میرے کھانے پینے کی عادات کا جتنا علم امی جی کو تھا، اتنا میری والدہ محترمہ کو بھی نہیں تھا۔ امی جی کو معلوم تھا کہ میں گڑ والے چاولوں میں کتنا میٹھا پسند کرتا ہوں، کس سالن میں نمک تیز کھاتا ہوں، اور کس سالن میں کم، میرے اِن ذائقوں سے میری والدہ واقف نہیں تھیں۔ اِس طرح تم جان سکتی ہو کہ وہ کتنا خیال رکھنے والی ماں تھیں۔ ملازمین، رشتہ دار اور غریب لوگوں سے ملنے کا انداز ماں جیسا تھا۔ محترم مجیب الرحمٰن شامی صاحب سے میرا تعارف 1971ء میں ہوا۔ ذہنی ہم آہنگی کی وجہ سے یہ تعلق بھائی چارہ میں تبدیل ہو گیا۔ مجیب الرحمٰن شامی سے اس بھائی چارے کی وجہ سے یونیورسٹی سے باہر کی دُنیا میں اُن کیساتھ آنا جانا بڑھ گیا۔ اسی دوران شامی صاحب کیساتھ ساہیوال میں امی جی کو پہلی مرتبہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ ایک مہربان چہرہ تھا جو میری آنکھوں میں رچ بس گیا۔ امی جی ہم سے ملنے کے بعد فوراً رسوئی میں گھس گئیں اور اُن کی ملازمہ نے اُن کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا ہمارے سامنے رکھ دیا۔ اس کھانے کا ذائقہ میں آج تک نہیں بھول سکا۔ امی جی ایک قناعت پسند خاتون تھیں، وہ دوسروں کی خدمت کر کے خوش ہوتی تھیں، وہ تمام بچوں سے یکساں پیار کرتی تھیں۔ لیکن مجیب الرحمٰن شامی کے ساتھ رہنا انہیں پسند تھا۔ حج کے موقع پر جب ان کے میاں محترم صاحبزادہ فیض الرحمان شامی صاحب حج کی بھیڑ میں گم ہو گئے تو انہیں تنہا واپس آنا پڑا، واپس پہنچیں تو ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھیں۔ انھیں اپنے ساتھی کے یوں بچھڑ جانے کا شدید صدمہ تھا۔ مجیب شامی صاحب کو زندگی میں آگے بڑھنے کے مواقع ملے۔ جب اِن کی شادی ہوئی تو وہ قریشی برادران کے ادارے میں ملازم تھے، لیکن ولیمہ کے دن انہیں ملازمت سے فارغ کر دیا گیا، انہوں نے رسالہ نکالنے کا فیصلہ کیا۔ اِس ادارے کے قیام کیلئے بہت سارے دوستوں نے خدمات پیش کیں۔ میری حقیر کوششیں بھی اس ادارے کے قیام میں شامل تھیں۔ معاشی حالات بہتر ہوئے تو شامی صاحب کے والدین ساہیوال سے لاہور منتقل ہو گئے، یوں امی جی سے ملاقاتوں میں تسلسل پیدا ہوا۔ میں نے 1974ء میں یونیورسٹی چھوڑی، 1977ء تک جب لاہور میں ہوتا، تو میرا قیام شامی صاحب کے گھر پر ہوتا۔ اُن کی بیوی طاہرہ بی بی نے میری خدمت بہن بن کر کی۔ 1974ء میں گاڑی کے حادثے کیوجہ سے مجھے اپنے بڑے بھائی سے محروم ہونا پڑا۔ طاہرہ بی بی کی اِس حادثے میں ٹانگ ٹوٹ گئی۔ شامی صاحب بیہوش تھے۔ میری اِس پریشان حالی کے اس دور میں وہ مخدوم رشید میں ہمارے ہاں رہنے لگے۔ طاہرہ بی بی نشتر ہسپتال میں زیر علاج تھیں، وہیں ان کے بڑے صاحبزادے فیصل مجیب نے جنم لیا۔

امی جی نے مصیبت کے ان دنوں میں مجھے بے پناہ محبت سے نوازا، میرے مرحوم بھائی کے بڑے بیٹے زاہد بہار کو ہم تعلیم کیلئے لاہور لے آئے، وہ رات دِن اِس کا خیال رکھتی تھیں۔ جب میں راتوں کو دیر سے گھر آتا تو پورچ میں گاڑی آہستگی سے داخل کرتا۔ امی جی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے کان میرے قدموں کی چاپ پر لگے ہوتے، وہ پوچھتیں کہ جاوید اتنی دیر سے کیوں آئے ہو تو ان کا سامنا نہ کرنے کی خواہش کا بھانڈا پھوٹ جاتا۔ امی جی آج اِس دنیا میں نہیں ہیں لیکن اِن کی ساری اولاد ترقی کے عروج پر ہے۔ جواں سال بیٹے رضا شامی کی موت کے علاوہ انھیں زندگی میں بے حد خوشیاں ملیں، اُنکے بڑے بیٹے ضیاء الرحمان شامی، اُن کی بیٹیاں آپا وسیم، آپا یاسمین، روبینہ اور ثمینہ معاشرے میں اپنا اپنا مقام رکھتے ہیں۔ صبر و قناعت کا جو عالم ان کی زندگی میں پہلی دفعہ ساہیوال میں دیکھا، وہ آخری دم تک قائم رہا۔ جیل سے رابطہ کر کے ان سے بات کی تو کہنے لگیں جاوید تو ہسپتال سے آ کیوں نہیں جاتا، انھیں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ وہ میری بیٹیوں سے بھی بہت محبت کرتی تھیں، نہ صرف میری بہنوں بھائیوں کے حالات، بلکہ ان کی اولاد کے معاملات سے بھی باخبر ہوتی تھیں، ان کی تعلیم میں دلچسپی لیتیں، اُن کی بہتری کا سُن کر خوش ہوتی تھیں۔ ان کی یادیں آج چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں، میں ان کی محبتوں کو بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن محبت تو بحرِ بے کراں ہے اس کا احاطہ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ کبھی اس میں سکوت ہوتا ہے اور کبھی طوفان۔ وہ نوے سال اس دنیا میں رہیں، اس عمر میں جانے پر عزیز و اقربا بھی مطمئن ہوتے ہیں کہ ایک بھرپور زندگی گذارنے پر آخر جانا ہی تھا، وہ چلی گئیں لیکن میری آنکھیں اُن کی موت کی خبر سن کر بھیگ گئیں۔ میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں، ہر ایک کو جانا ہوتا ہے، دیر یا سویر! لیکن یہ عجیب بات ہے دنیا کے عظیم شاعروں اور ادیبوں نے ماں کے رُخصت ہونے کے درد بہترین ادبی شہ پاروں میں سمویا ہے، باپ کی وفات کا ذِکر اِس انداز سے نہیں کر سکے۔ ماں خواہ ایک صدی گذار کر جا رہی ہو اُسکے جاتے ہی بے بسی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور جوں جوں وقت گذرتا جاتا ہے ماں کی یاد کی خوشبو چارسُو پھیلتی جاتی ہے۔

رات کو سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ بلیوں کے بے ہنگم شور نے نیند میری آنکھوں سے اُچک لی، بلی اور اُسکے بچوں پر دو تین بلوں نے حملہ کر دیا تھا، یہ جنگ ساری رات جاری

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رہی ، ماستا کی آواز چیخوں میں بدل گئی اور پھر اُس نے دھاڑنا شروع کردیا ، میں تالہ بند ہونے کی وجہ سے بے بس تھا اُسکی کوئی مدد نہ کرسکا ، اُس کی غراہٹ زخمی شیرنی کی گونج میں تبدیل ہو گئی ، صبح تالہ کھلتے ہی میں نے جیل ملازم کو چھت پر بھیجا اُس نے خونخوار بلوں کو بھگادیا ، اِس دوران اُس کا ایک بچہ مرچکا تھا ، اُس نے اپنے بچے کی لاش پر جو آوازیں نکالیں اُس سے ماحول سوگوار ہوگیا۔ وہ بچے کی لاش کے قریب آنے والے ہر فرد پر جھپٹتی تھی ، میرے سمیت ہر ایک کو شک سے دیکھتی تھی کہ کوئی اس کا بچہ اُٹھا کر نہ لے جائے پھر اُس نے باقی بچوں کو میرے کمرے میں لاکر الماری کے اندر چھپالیا اور جب کوئی اُس جگہ کے قریب سے گذرتا تو اُسے کھانے کو دوڑتی ، کئی روز تک گوشت اور دودھ اُسکے سامنے پڑا رہا وہ اُسکے قریب نہ گئی۔

ماں نہ ہوتی تو خدا اپنی مخلوق کی تخلیق کیسے کرتا۔ ذرا تصور تو کر کے دیکھو ، انسان تو انسان ، ایک جراثیم پیدا کرنے کیلئے بھی پہلے ماں کی تخلیق ضروری ہے۔ خدا نے ماں کی تخلیق کی اور ماں نے خدا کی تخلیق کردہ روح کو اپنے جسم سے جسم عطا کیا۔ باپ کے بغیر پیدا ہونے کا تصور ایک پیغمبر کے بارے میں موجود ہے مگر بچے کی پیدائش صرف خالق کائنات کرسکتا ہے یا ماں۔

والسّلام

تمہارا والد!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

شکمِ سامانِ موت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

بشریٰ بی بی!

السلام علیکم!

اگر چہ نو گرفتار نہیں ہوں، پھر بھی اپنے ہم سفروں سے دُور تہہ دام تڑپنے پھڑکنے کی توفیق سے بہرہ مند ہوں۔ دلِ مرتضےٰ بھی رکھتا ہوں اور سوزِ صدیق بھی۔ آج کل اپنی صحت اور غذا پر بھرپور توجہ دے رہا ہوں۔ روزانہ کئی گھنٹے سیر کرتا ہوں، شام کو بیڈمنٹن کھیلتا ہوں، خود کو چاک و چوبند محسوس کرتا ہوں۔ میں نے جب سے کھانا آدھا کیا ہے، سوچنے اور لکھنے کی رفتار میں تیزی آ گئی ہے۔

جب معدہ ضرورت سے زیادہ بھر جائے تو سوچ کا عمل سست ہو جاتا ہے۔ افراد کی طرح امیر قومیں بھی جب خود کو معاشی طور پر بہت طاقتور محسوس کرتی ہیں، ان کے سوچنے اور سمجھنے کی رفتار سست پڑ جاتی ہے۔ جس طرح ایک بھوکا شخص کفر کے قریب چلا جاتا ہے، اس کی تمام صلاحیتیں مردہ ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح غریب قومیں بھی جہالت اور بیماریوں کا مرقع بن جاتی ہیں۔ صرف متوازن معاشی ترقی کسی فرد یا قوم کی صحت کی ضمانت دیتی ہے۔

آج صبح سیر کرتے ہوئے میں نے دیکھا، بلی کے منہ سے کوا گوشت کا ٹکڑا چھین کر بھاگ گیا۔ دراصل بلی کا پیٹ بھر چکا تھا اور وہ کوے کے حملے کو روکنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ کوے کی بھوک نے اسے ہر قسم کے خطرے کا سامنا کرنے کیلئے تیار کیا۔ قوموں کی زندگی میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ دنیا پر حکمرانی کرنے والی قومیں آرام پرستی کا شکار ہو کر نیست و نابود ہو گئیں۔ ان کی طاقت، جلال و حشم کو وقت کی دیمک نے چاٹ لیا۔ تاریخ عالم پر اُچٹتی نظر ڈالیں تو عجیب قسم کے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔

زیادہ دور کی بات نہیں، ماضی قریب کے چار ملک ایسے ہیں جو دنیا کے بیشتر حصوں پر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حکمرانی کرتے رہے ہیں۔ ان میں سنٹرل ایشیاء، ترکی، برطانیہ، اور روس کا تذکرہ برمحل ہوگا۔ افغانستان کے حکمران مفتوحہ ممالک خصوصاً برصغیر ہندوپاک سے بے پناہ دولت اپنے ملک میں لے گئے تھے، مگر آج منگولیا اور افغانستان دنیا کے پسماندہ ترین ملک بن چکے ہیں۔ اس مال و دولت کا کیا ہوا؟ اسی طرح ترکی کی سلطنت عثمانیہ میں ایشیاء، افریقہ اور یورپ کے بیشمار ملکوں کی دولت تھی۔ آج حالت یہ ہے کہ یورپی یونین کمزور معیشت کی وجہ سے اسے اپنا رکن بنانے پر آمادہ نہیں۔ برطانیہ نے امریکہ، کینیڈا، چین، ہندوستان سمیت اکسٹھ ملکوں پر اپنا سکہ چلایا۔ دوسری جنگ عظیم یعنی 1944ء تک دنیا کی قسمت کے فیصلے لندن میں ہوتے تھے، مگر صرف تیس سال کے اندر اندر یعنی 1974ء میں برطانیہ والوں کی غربت کی وجہ سے یورپی دنیا کے ممالک انہیں اپنے ہاں مزدوری کیلئے ویزا دینے کو تیار نہیں تھے۔ اسی طرح روس کی عظیم طاقت تو تمہارے سامنے تحلیل ہوئی ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ان کے اہم فوجی عہدیداروں کو ماسکو اور پیٹرز برگ کی سڑکوں پر کھڑے بھیک مانگتے دیکھا ہے۔ وہاں کے لوگ روٹی کے ٹکڑوں کیلئے ترس رہے ہیں۔ یہ برطانیہ کی خوش قسمتی ہے کہ 1976ء میں وہاں کے سمندروں سے تیل نکل آیا۔ قدرت اگر ان کی امداد نہ کرتی تو آٹھ سو سالہ دورِ حکمرانی اُن کی نسلوں کو بھوک کی سوغات کے علاوہ کچھ بھی تو نہ دے سکتا۔ آج کی عظیم طاقت امریکہ ہے۔ تمام دنیا اس کے فیصلوں سے متاثر ہوتی ہے۔ امریکہ کا پیٹ ضرورت سے زیادہ بھر گیا ہے، سوچنے کے عمل میں کمی آچکی ہے۔ تاریخ اپنے آپکو بار بار دہراتی ہے، کیا امریکہ کو اس عمل سے مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہے؟ آثار اچھے نہیں خدا خیر کرے۔

والسّلام!

تمہارا والد!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

روشنی کا دریچہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

22 فروری 2006ء

بشریٰ بی بی! السلام علیکم!

آج محتسبوں کے حضور پیش ہونا تھا، دن جلدی شروع ہو گیا، آنکھ کھلی تو کوئل کی کوک سنائی دے رہی تھی، میں نے صبح کی سیر کی اور تیار ہو کر بیٹھ گیا۔ ڈیوڑھی کے ملازم نے آ کر کہا کہ "گارد" پہنچ گئی ہے۔ میں دروازوں اور تالوں کو کھلتے اور بند ہوتے دیکھتا رہا۔ حصارِ بام و در سے باہر آیا تو گاڑیوں کی لمبی قطار موجود تھی۔ دُور تک وردیاں ہی وردیاں، ٹوپیاں ہی ٹوپیاں نظر آ رہی تھیں۔ ہر وردی والا مسلح تھا، بندوقوں کی چھاؤں میں یہ قافلہ عدالت کی طرف روانہ ہو گیا۔ وائرلیس سیٹ پر آواز گونجی ''مہمان روانہ ہے''۔

جیل میں تھا تو اپنے گھر میں تھا اور پہرے داروں کے بدلتے ہی میں مہمان بن گیا تھا، زبردستی کا مہمان تو سنا تھا، زبردستی کے میزبان یہاں آ کر دیکھے۔ دراصل یہ پولیس کی خفیہ زبان ہے، اِسے استعارہ کی زبان بھی کہا جا سکتا ہے۔ اہم شاہراہوں پر ٹریفک روکنے کے احکامات جاری ہونے لگے۔ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے پولیس آفیسر نے کہا! سر جب آپ بطور وزیر لاہور آتے تھے تو آپ کو پروٹوکول کی ایک گاڑی ملتی تھی۔ اِس وقت سات گاڑیاں اور سو کے قریب پولیس والے آپ کے جلوس میں شامل ہیں، وہ مجھے میری اہمیت کا احساس دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

جیل سے باہر نکلا تو دائیں طرف کے کھیتوں میں قیدیوں کو آلو کی فصل برداشت کرتے دیکھا۔ بائیں جانب گندم کی فصل سے خوشہ گندم سر نکال رہا تھا، خمارِ گندم نے منظر کو دو آتشہ کر دیا، میں نے فضا میں قلابازی لگائی اور اپنے کھیت کنارے پہنچ گیا لیکن وائرلیس کی آوازوں نے مجھے واپس بلا لیا۔ ہم سبزی منڈی سے گذر رہے تھے۔ قریبی گاؤں کے کسان

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گدھا گاڑیوں اور بیل گاڑیوں میں پھل، سبزیاں اور جانوروں کیلئے چارہ لئے بیچارگی کیساتھ بیٹھ ہوئے تھے،ان کے چہرے کی ہڈیوں پر ماس نہیں تھا تن ڈھانپنے والے کپڑے پھٹے پرانے اور میلے کچیلے تھے۔ پولیس والے انہیں غصیلی نظروں سے دیکھتے تو وہ لجاجت سے عرض حال بیان کرتے نظر آتے، جیسے کہہ رہے ہوں معاف کر دیں، ہماری روزی کا سوال ہے، یہ ساری گفتگو اشاروں کنایوں میں ہو رہی تھی۔ بالا دستوں کے چہرے کے خوفناک زاویئے زیر دستوں کی جھکی ہوئی نگاہوں کے آر پار ہو رہے تھے۔ بے زبانی زبان بنی ہوئی تھی۔ مجھے اِن میں اپنے گاؤں کے ہر کسان کا عکس نظر آنے لگا اور پھر دنیا کے تمام کسانوں کی بے بسی اور بیچارگی میرے سامنے تھی۔ انکی ترجمانی کا دعویٰ کرنے والے چہرے بھی سامنے آگئے، جوان کا نام استعمال کر کے اپنے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔

ہم آگے بڑھے تو ایک موچی جوتے چمکا رہا تھا۔ اسکی چار پانچ سال کی دو معصوم بچیاں سامنے کھڑی تھیں، ان کے تن پر پھٹے ہوئے کپڑے تھے اور ان کے چہرے بھی ہڈیوں کے ڈھانچے تھے، ان کے بال خاک آلودہ تھے، وہ آنیوالے وقت کی پرچھائیوں سے بے خبر تھیں، ان کے والد نے انھیں دو مالٹے تھمائے اور وہ خوش ہوگئیں۔ چند قدم کے فاصلے پر ان کی ہم عمر بچیاں خوبصورت نیلی وردیاں زیب تن کئے سکول کی طرف رواں دواں تھیں، دو چھوٹے چھوٹے بچے گدھا گاڑی چلاتے ہوئے تلاشِ معاش میں سرگرداں تھے۔ چھوٹے بچوں کی مشقت کو روکنے والی تنظیمیں اگر اس چوک میں آ کر ان بچوں کے حالات کو دیکھیں تو انہیں اپنی کارکردگی کا اندازہ ہو جائے گا۔

جب ہم عدالت کے احاطے میں پہنچے تو پولیس کی مزید قطاریں میری منتظر تھیں۔ ڈیڑھ منٹ کی عدالتی کارروائی کے بعد ہم فارغ تھے۔ جج صاحب نے مجھے چند دوستوں اور عزیزوں سے ملنے کی اجازت دے دی۔ ہماری پارٹی کے سرکردہ راہنما اور انجمن شہریان لاہور کے صدر اور بزرگ سیاستدان رانا نذ الرحمٰن تشریف لائے۔ وہ ملکی حالات پر آزردہ تھے، جماعتی معاملات پر بھی بات چیت ہوتی رہی۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حالات کی سنگینی کے باوجود مجھے مایوسی کی کوئی وجہ نظر نہیں آئی۔ اگر چند راہنما قربانیاں دینے کیلئے آگے آئیں تو قوم ان کا ساتھ دینے کیلئے تیار ہے اور اگر قیادت نے حالات کی نزاکت کو نہ سمجھا تو لوگ خود قیادت سنبھال لیں گے۔ سیاسی بحرانوں سے قیادت جنم لیتی ہے۔ انہوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور "مہمان" اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

واپسی پر ہمارا کارواں قینچی امر سدھو کے قریب ٹریفک میں پھنس گیا، ریڑھیوں، بیل گاڑیوں، ٹرالیوں اور ٹرکوں کے اژدھام میں موٹر سائیکلوں نے بھی دخل در معقولات کو اپنا حق سمجھ لیا۔ میرے سامنے ایک بھاری بھر کم شخص، جس کی شیو بڑھی ہوئی تھی، اپنے موٹر سائیکل پر بیٹھا تھا، موٹر سائیکل پر سبز چارہ لدا ہوا تھا اور دونوں طرف دُودھ کے ڈبے لٹک رہے تھے۔ میں نے سوچا اس شخص کو اتنا بھی معلوم نہیں ہوگا کہ میں اِس کے حقوق کی جنگ لڑتے ہوئے اپنی آزادی کی قربانی دے رہا ہوں، نہ ہی ارد گرد کے لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ مَیں کون ہوں؟ ایک دم موٹر سائیکل والے شخص نے میری طرف دیکھ کر انگلیوں سے فتح کا نشان بنایا اور مُسکرا کر ہاتھ ہلانے لگا گویا وہ مجھے اِحساس دلا رہا تھا کہ میں نے اپنی قوم کے سیاسی شعور کے بارے میں اندازہ لگاتے ہوئے انصاف نہیں کیا۔ میں اپنی اس سوچ پر شرمندگی محسوس کرنے لگا، میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، حصارِ ذات میں روشنی کا دریچہ کھل گیا، میں ایک اور دنیا میں پہنچ گیا، اندر کی دنیا جس میں ضمیر کی حکمرانی ہے۔ نہ وہاں بندوقوں کا سایہ ہے اور نہ ہی بام و در کا حصار، جہاں آزادی ہی آزادی ہے۔ میں اُس موٹر سائیکل والے شخص کا شکر گزار ہوں جسکی مُسکراہٹ مجھے مایوس نہیں ہونے دیتی۔ اندھیرے میں اس کے چہرے کی چمک مجھے اپنی منزل کا پتہ دیتی ہے۔

تمہارا والد!

جاوید ہاشمی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سیکولرازم اور اسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

6 جنوری 2006ء

بشریٰ جی! السلام علیکم!

تم نے پوچھا ہے کہ سیکولرازم اور لبرل ازم کے بارے میں میرے خیالات کیا ہیں؟ اسلام اور سیکولرازم میں کیا فرق ہے؟ اور ہندوستان کے سیکولرازم، لبرل ازم اور جمہوریت کے بارے میں میری کیا رائے ہے؟

سب سے پہلے میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی نظریاتی اساس اسلام کے سوا کچھ نہیں مگر حکمرانوں نے ہمیشہ اسلام کو صرف اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا ہے حالانکہ اسلام حکمرانوں کا نہیں عوام کا مذہب ہے۔ قیام پاکستان سے لے کر اب تک پاکستان پر برطانیہ کی نوآبادیات کے لئے تربیت یافتہ انتظامیہ چھائی ہوئی ہے۔ وہ اسلام کے بنیادی نظام کو پرانے وقتوں کی چیز سمجھتی ہے اس نے اسلام کے علاوہ ہر نظام کا تجربہ کر کے پاکستان کو ایک تجربہ گاہ میں تبدیل کر دیا ہے۔ آج کل سیکولرازم فوجی حکمرانوں کے سیاسی ایجنڈے پر سرفہرست ہے۔ پچھلے فوجی دور میں اسلام کا نام استعمال کرنے کی ضرورت تھی کیونکہ امریکہ اس وقت اسلام کے ذریعے روس کو شکست دینا چاہتا تھا۔ اس لئے ہمارے حکمران بھی اسلام کے نفاذ میں ''مخلص'' نظر آتے تھے۔ آج امریکہ اسلام کو شکست دینے کے لئے سیکولرازم کا نعرہ بلند کر رہا ہے۔ لہٰذا ہمارے حکمران بھی سیکولرازم کو تمام مسائل کا حل قرار دے رہے ہیں۔ جس طرح کا سیکولرازم ہمارے حکمران لا رہے ہیں یورپ میں اسے انتہا پسندوں کا سیکولرازم سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے مغرب زدہ طبقے اپنی بے راہ روی کو بھی سوشلزم اور کبھی سیکولرازم کے پردے میں چھپانا چاہتے ہیں انہیں سوشلزم یا سیکولرازم کے مقاصد سے کوئی غرض نہیں ہے۔ قرآن حکیم میں اسلام کو میانہ روی کا مذہب کہا گیا ہے وہ یکسر نہ تو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سوشلزم کو مسترد کرتا ہے اور نہ ہی سیکولرازم کو۔ وہ صرف سوشلزم اور سیکولرازم کی انتہا پسندی کے خلاف ہے۔ اسلام تو ہر نئے علم کو سیکھنے کی تلقین کرتا ہے اور اچھی سوچ کا خیر مقدم کر کے اسے مومن کی گم شدہ میراث کہتا ہے۔

تمہارے سوالوں کا مختصر جواب یوں دیا جا سکتا ہے کہ اسلام زندگی گزارنے کا مکمل ضابطہ حیات ہے۔ سیکولرازم معاشرتی آزادیوں کی تحریک ہے۔ ہندوستان کی جمہوریت لبرل ازم اور سیکولرازم ایک ایسا گورکھ دھندہ ہے جس پر موروثیت، رام راج اور ذات پات کی چھاپ نمایاں ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ چند ابتدائی معلومات کے ذریعے اپنی بات واضح کر سکوں۔

اسلام اور سیکولرازم میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ دونوں مذہبی رواداری اور برداشت میں یقین رکھتے ہیں دونوں پاپائیت اور مذہبی اجارہ داری کے خلاف ہیں دونوں انسان پر انسان کی بالادستی کے خلاف ہیں اور معراج انسانیت میں یقین رکھتے ہیں۔ بنیادی اختلاف یہ کہ اسلام ضابطہ حیات پر عمل درآمد کیلئے ریاست کا قیام عمل میں لاتا ہے جبکہ سیکولرازم ریاست کی بنیاد کے لئے کسی نظریئے کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ تمام معاملات افراد کی منشاء پر چھوڑ دیتا ہے۔ مغربی سیکولرازم اب نائیجیریا، ایران، لبنان اور فلسطین میں عوام کی جمہوری فتح کو تسلیم کرنے سے انکار کر رہا ہے۔ وہ مسلمان ملکوں میں فردِ واحد کی حکمرانی کا محافظ بن گیا ہے۔ مسلمان بھی جمہوریت کو سیکولرازم کی کوکھ سے جنم لینے والا بچہ سمجھ کر بادشاہت اور آمریت کو قبول کر چکے ہیں حالانکہ جمہوریت نے اپنے سفر کا آغاز پانچ ہزار سال پہلے یونان سے کیا تھا۔ اس طرح کے رویئے سے گویا مسلمانوں اور عیسائیوں نے سیکولرازم مخالف قوت کا روپ دھار کر بنیاد پرستی کو اپنا شعار بنالیا ہے۔

سیکولرازم کی بنیادی تعریف مذہبی امتیاز کی بناء پر سیاست نہ کرنا ہے۔ پاپائیت کے محدود مذہبی تصور نے عیسائیت کو خون میں نہلا دیا تھا۔ آرتھوڈوکسی، کیتھولک اور پروٹسٹنٹ میں بٹے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں نے لاکھوں کی تعداد میں ایک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دوسرے کو قتل کیا۔ ہزاروں بستیاں اور شہر اجاڑ دیئے گئے۔ ان المناک داستانوں نے سیکولر ازم کو مذہب مخالف نظریہ کا رنگ دے دیا۔ اسلام میں بھی احناف نے خود کو مذہب حنفیہ کا پیروکار کہا اور مذہب حنفیہ دارم ملت حضرت خلیل کا نعرہ بلند کیا۔ اہل تشیع نے ملت جعفریہ کے طور پر خود کو متعارف کرانا بہتر سمجھا۔ اسلامی مفکرین نے مذہب کے اس محدود تصور کو رد کر دیا۔ علامہ اقبال نے مذہبی تنگ نظری کے خلاف جنگ لڑی اور مذہب کی بجائے دین کے پرچم کو سربلند رکھا۔ وہ فرماتے ہیں۔

جدا ہو دین سیاست سے
تو رہ جاتی ہے چنگیزی!

سیکولر ازم فرد کی آزادی کو اہمیت دیتا ہے اور ریاست کو ان آزادیوں کا محافظ قرار دیتا ہے۔ یورپ کے رینے سانس (Renai Ssance) جدیدیت یا نشاۃ ثانیہ میں اس تحریک نے اہم کردار ادا کیا۔ پاپائیت کے بوجھ تلے دبا ہوا جاں بلب یورپ سیکولر ازم کی بیساکھیوں کے سہارے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مغرب اب مذہب کے مدرسے سے بھاگا ہوا ایسا بچہ ہے جو سمجھتا ہے کہ اگر اسے مذہب کے مدرسے میں واپس لایا گیا تو اس کی آزادی زنجیروں میں جکڑ دی جائے گی حالانکہ مذہب دنیا کی اتنی بڑی حقیقت ہے کہ اس سے انکار ناممکن ہے پوری دنیا مذاہب کی گرفت میں ہے۔ عیسائیت، اسلام، ہندومت، یہودیت، بدھ مت، جین مت، سکھ، پارسی سب کے سب صدیوں سے خدا کو مانتے چلے آرہے ہیں یا خدا ان سب سے خود کو منوا رہا ہے۔

اسلام واحد مذہب ہے جو ریاست کا نظام قائم کرتا ہے اور زکوۃ عشر خمس اور دیگر معاشی اقدامات کے ذریعے ذرائع آمدنی میں غریبوں کو بطور استحقاق حصہ دار بناتا ہے اور ان کا حق کھانے والوں سے جنگ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ سیکولر ازم اسلام کے اس نظریئے سے متصادم نہیں ہے نہ سیکولر ازم اپنی آزادی کے لئے جانیں دینے والوں کو دہشت گرد کہتا ہے بلکہ وہ دنیا بھر کے آزادی پسندوں کی حمایت کرتا ہے۔ عراق پر حملے کے خلاف دنیا بھر میں

کروڑوں انسانوں نے مظاہرے کیے خاص طور پر امریکہ اور یورپ کے سیکولر طبقے نے جتنی شدت سے اس حملے کو مسترد کیا اسلامی دنیا اس کا عشرِ عشیر بھی نہ کر سکی۔

میری دانست میں سیکولرازم کوئی نظریہ نہیں بلکہ یہ صرف ایک تحریک ہے، جس کا اسلام سے براہ راست کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ یہودیوں نے اسے اپنے تحفظ کے لئے استعمال کیا ہے، مغرب نے مادر پدر آزاد معاشرے کے لئے، ہندو نے تقسیم در تقسیم قوموں اور علاقوں والے خطے ہندوستان کو ایک رکھنے کے لئے، مسلمان علماء نے تبلیغ دین، اور کمیونسٹوں نے اپنے نظریے کو پھیلانے کے لئے۔ سیکولرازم کو مسلمانوں کے بہترین ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ آزاد فضا میں حقیقت کے اظہار کا ماحول میسّر آتا ہے، جسکے پاس سچائی ہوتی ہے اُسے اپنے نظریئے کو پھیلانے کا موقع ملتا ہے۔

تمہیں یہ بات عجیب لگے گی کہ پاکستان کے علماء سیکولرازم کے سخت خلاف ہیں، مگر ہندوستان کے مسلمانوں کو سیکولرازم کی چھتری نے پناہ دے رکھی ہے۔ وہاں کے مسلمان علماء سیکولرازم کے حق میں ہیں جب کہ ہندو پنڈت سیکولرازم کے خلاف اور رام راج کے مذہبی فلسفے کے حق میں ہیں۔ تمہیں یہ بات اور بھی عجیب لگے گی کہ ہندوستان سیکولرازم کے نام پر بنا، مگر وہاں پر حکومتیں رام راج کے نام پر بننے لگی ہیں۔ پاکستان ایک نظریئے کی بنا پر معرضِ وجود میں آیا۔ لیکن پاکستانی عوام نے ہمیشہ معاشی اور سماجی حالات کو بہتر بنانے کے دعویداروں کو حقِ حکمرانی سے سرفراز کیا۔ یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ دُنیا کی سب سے بڑی سیکولرسٹ جمہوریت میں ایک ہی خاندان کی پانچ نسلیں حکمرانی کرتی رہی ہیں۔ موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، اندرا گاندھی، راجیو گاندھی، سنجے گاندھی، سونیا گاندھی اور اب راہول گاندھی کانگرس کے صدر یا ملک کے وزیرِ اعظم رہے ہیں یا امیدوار ہیں۔ آج کے جمہوری دور میں دُنیا میں کسی اور ملک میں اس طرح کی مثال موجود نہیں۔ نہرو کی بیٹی نے ایک پارسی فیروز گاندھی سے شادی کی اور قائداعظم کی بیٹی کا انتخاب بھی ایک پارسی تھا۔ قائداعظم کی بیٹی زندہ ہے۔ اس کے بچے جو قائداعظم کے نواسے ہیں۔ اس دنیا میں موجود ہیں۔ قائداعظم نے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انہیں اپنا جانشین بنایا اور نہ ہی مسلم معاشرے نے انہیں قبول کیا۔ ایوب کا بیٹا گوہر ایوب بھی جانشین نہ بن سکا۔ یحییٰ کے بیٹے موجود ہیں، اسی طرح ضیاء الحق کا بیٹا بھی سیاست میں دھکے کھا رہا ہے۔ البتہ ذوالفقار علی بھٹو کی جان کی قربانی نے بے نظیر کیلئے سیاست کا دروازہ کھولا۔ پاکستان کے عوام نے جمہوریت کی طویل جنگ لڑی ہے اور ہتھیار نہیں پھینکے۔ قائداعظم نے پاکستان کی اساس اسلامی نظریئے کو قرار دیا، مگر اُنہوں نے بارہا اپنی تقاریر میں کہا کہ پاکستان کے آئین اور قانون کی نظر میں تمام شہری برابر ہیں اور مذہب کی بنا پر ان سے امتیازی سلوک نہیں ہوگا۔ قائداعظم بخوبی جانتے تھے کہ سیکولرازم اور اسلام میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔

اب میں تمہیں بتانے کی کوشش کرونگا کہ مسلم معاشرے میں سیکولرازم کا کیا مقام ہے؟

درحقیقت، مغرب میں پاپائیت کے خلاف صدیوں پر مشتمل تحریک کو سیکولرازم کا نام دیا گیا۔ مذہب کے نام پر حکومت کرنے کا قلادہ عیسائیوں کے گلے میں پڑا ہوا تھا، وہ انہوں نے اتار پھینکا۔ ہمارے علماء اور مفکرین نے سیکولرازم کے خلاف کلیسا کی شکست کو مذہب کی شکست سمجھا، حالانکہ، کلیسا سے نجات کے بعد یورپ کے لوگوں نے نظری اور فکری آزادی حاصل کر لی اور انہیں اپنی منزل آسمانوں میں نظر آنے لگی۔ ان پر دنیا کے دروازے کھلنے لگے۔ معاشی نظریات کو انسانی زندگی سدھارنے کا موقع میسر آیا، سائنسی دریافتیں ہونے لگیں۔ جس معاشرے میں زمین گول ہونے کا دعویٰ کرنے والوں کو سزائیں دی جاتی تھیں وہاں کے سائنسدان دعویٰ کرنے لگے کہ وہ مذہبی رہنماؤں سے زیادہ خدا جانتے اور مانتے ہیں۔

یورپ اور مغربی ممالک سیکولرازم کے خلاف ہونے والی ہر بات کو جہالت سمجھتے ہیں اور کسی حد تک وہ اس میں حق بجانب بھی ہیں۔ لیکن جن نظریات کو مغربی قومیں انسانی ترقی کی بنیاد سمجھتی ہیں وہ اِسلام سے ہرگز متصادم نہیں ہیں۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ سیکولرازم نے اِسلام کے لئے راستہ ہموار کیا ہے۔ وہ انسانی معاشرے کو آزاد رویوں کی تلقین کرتا ہے۔ اس آزادی کا سب سے زیادہ فائدہ اسلام کو پہنچتا ہے۔ کیونکہ جہاں پر شعور بیدار ہو وہاں پر اسلام کے نظریات کو پھیلانے کا دریچہ کھلتا ہے۔ آزاد ماحول میں اسلامی نظریات کی تبلیغ اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ترویج میں آسانی ہوتی ہے۔ میں بار بار یو چھتا رہتا ہوں کہ تبلیغی جماعت کا اجتماع سعودی عرب میں کیوں نہیں ہو سکتا؟ طالبان کی اِسلامی حکومت نے اُنہیں افغانستان میں کیوں گرفتار کیا تھا؟؟ یہ اجتماع ہندوستان، سری لنکا، بنگلہ دیش، برطانیہ، اور امریکہ میں کیوں ہوتا ہے؟؟؟ درحقیقت، جس نظام میں لوگوں کے اجتماع سے خطرہ محسوس نہیں کیا جائیگا وہی اسلام ہے۔ اجتماع پر اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔

سیکولرازم مذہب اور مذہب کی تبلیغ کے خلاف نہیں، بلکہ وہ آزادی اظہار کا زبردست حامی ہے۔ اسی آزادی کی وجہ سے مسلمان علماء کو مغربی معاشرے میں دین اسلام پھیلانے کا حق حاصل ہے۔ سیکولرازم ریاست کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ لوگوں پر اپنا مذہب مسلّط کرے۔ وہ لوگوں کو یہ حق ضرور دیتا ہے کہ وہ اپنی مرضی کے دین کے مطابق زندگی گذارنے کیلئے قانون نافذ کریں۔ سیکولرازم اسلام نہیں مگر اُسے لادینیت کے ہم پلہ قرار دینا قرینِ انصاف نہیں ہے۔ اسلام بھی اپنے نظام کو ریاست میں رہنے والی اقلیتوں پر جبراً مسلّط نہیں کرتا۔ ریاستی مداخلت کی حدود کو متعین کر دیا گیا ہے۔ اسلامی ریاست مدینہ روئے زمین کی پہلی ریاست تھی جس نے اقلیتوں کے حقوق مسلمانوں کے برابر تسلیم کیے۔ علماء اس بات پر متفق ہیں کہ ریاست کے باہر کے مسلمانوں کے حقوق مقامی اقلیتوں کے برابر نہیں ہو سکتے۔ اس کے مقابلے میں آج بھی دنیا کی کئی حکومتیں ہیں جن میں ہر شہری کو عیسائی نام لازمی طور پر رکھنا پڑتا ہے۔ خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو۔ میں برازیل گیا تو وہاں ایک عجیب واقعہ دیکھنے کو ملا۔ پاکستان کے ایک سفارتی اہلکار کی بیٹی پیدا ہوئی، اس کی بیوی کو (57) ستاون روز تک ہسپتال سے گھر جانے کی اجازت نہیں مل رہی تھی۔ ان پر دباؤ تھا کہ وہ بچی کا عیسائی نام رکھیں۔ سفارتکار کا مؤقف تھا کہ میں برازیل کا شہری ہوں اور نہ اس ملک کی ملازمت میں ہوں۔ بڑی مشکل سے اس کا مؤقف تسلیم کیا گیا اور اس نے بچی کا اسلامی نام رکھا۔

سیکولرازم سے پہلے عیسائی، آتش پرست یا رومی کسی مخالف مذہب رکھنے والوں کو اپنے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ملک میں نہیں رہنے دیتے تھے، بلکہ وہ جس شہر یا علاقے کو فتح کرتے، وہاں سے دوسرے مذاہب کے لوگوں کو یا تو تہ تیغ کر دیتے یا انہیں دور دھکیل دیتے۔ یہ شرف اسلام کو حاصل ہے کہ اس وقت سے لے کر آج تک عراق، شام، سعودی عرب اور فلسطین میں عیسائیوں اور یہودیوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ بلکہ سات سو سال تک یہودیوں کی سب سے بڑی پناہ گاہیں ہسپانیہ، اندلس، استنبول (ترکی) ایران اور مصر میں تھیں۔ یہاں انہیں عیسائی ملکوں کی نسبت نہ صرف مذہبی آزادی حاصل تھی بلکہ عثمانی خلیفہ سلیمان اعظم نے کہا تھا کہ وہ شہر شہر نہیں کہلا سکتا جس میں یہودیوں کی آبادیاں نہ ہوں۔ یہودی اسلام کے ان احسانات کا اپنی کتابوں میں برملا اعتراف کرتے رہے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک گھر میں دیوار پھاند کر داخل ہو گئے، گھر کے مالک نے انہیں کہا کہ آپ کو اس طرح آنے کی اجازت شریعت نے نہیں دی۔ حضرت عمرؓ نے صحابیؓ کا موقف تسلیم کر لیا۔ سیکولرازم انفرادی آزادی کا دعویدار ہے۔ اسلام تو ہے ہی مذہبی اور انفرادی آزادی کا محافظ، البتہ، یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ جس طرح پاکستان اور ہندوستان میں سیکولرازم کے معنی مختلف ہیں۔ اسی طرح یورپ اور دیگر ممالک میں اسکی تشریح مقامی حالات کے مطابق کر لی گئی۔ ہندوستان کے لوگوں کا ذہن ابھی تک راجکماروں کے تصور سے آزاد نہیں اور نہ ہی سیکولرازم وہاں پوری طرح رائج ہو سکا اسی لئے ہندوستان دنیا کے معاملات میں بنیادی کردار ادا کرنے کے قابل نہ ہو سکا۔

پاکستان کا وجود ہی نظریہ سے وابستہ ہے۔ اس لئے مملکت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی گذارنے کیلئے اہتمام کرے۔ اگر اس نظریہ کو پاکستان کے وجود سے نکال دیا جائے تو بنیاد ختم ہو جائیگی۔

میں سمجھتا ہوں کہ آج کی مغربی معاشرت دوسری انتہا پر پہنچ گئی ہے۔ وہ سیکولرازم یا لبرل ازم کے نام پر فرد کی آزادی کو معاشرے کے اجتماعی ضمیر پر ترجیح دیتی ہے۔ اس طرح کی بے لگام آزادی کو معاشرے قبول کرنے لگیں تو تاریخ گواہ ہے۔ وہ اجتماعی خودکشی کے انجام کو پہنچ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جاتے ہیں۔ یورپ کی اقوام تسلیم کرتی ہیں کہ جب یورپ تاریک دور (DARKAGES) سے گذر رہا تھا تو مسلمان انسانیت کی فکری اور عملی راہنمائی کا فریضہ سرانجام دے رہے تھے۔ ہسپانیہ کی ترقی کی چکا چوند سے یورپ کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں تھیں، جسکی وجہ سے لوگوں نے ترقی کے راستے میں رکاوٹ بننے والے نظام کا جُوا اپنے کاندھوں سے اُتار پھینکا۔

اب جبکہ مغربی اقوام نے آسمان کی بلندیوں کو چھو لیا ہے اُنکی ترقی معکوس کا عمل شروع ہوگیا ہے۔ معاشرتی بدنظمی کا دور دورہ ہے۔ وہاں کی مائیں اب بچے نہیں جننا چاہتیں اور باپ اُنہیں پالنے سے انکاری ہیں، تخلیق کے اس عمل سے جانور بھی گریزاں نہیں ہیں۔ آزادی کا عمل جب انسان کو فطرتی تقاضے پورے کرنے سے روک دے، تو اُس نظام کی ناکامی یقینی ہے۔ یہ سیکولرازم کا منفی پہلو ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، سیکولرازم کوئی ضابطہ حیات نہیں ہے، اِس سے خائف ہونے کی کوئی وجہ مجھے نظر نہیں آتی۔ ہمارے علماء یورپ اور امریکہ میں داخل ہوتے ہی اسی سیکولرازم کا فائدہ اٹھا کر اسلام کی تبلیغ کرتے ہیں۔ امریکہ اور یورپ میں اب سیکولرازم کمزور ہونے لگا ہے۔ معاشرے پر بنیاد پرستی غالب آرہی ہے۔ اب وہ اپنے مذہب کو بنیاد بنا رہے ہیں۔ آنے والے وقت میں اگر یورپ اور امریکہ سیکولرازم کے اصولوں پر قائم نہ رہے تو وہاں کی مسلم آبادیوں کو بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا، مگر اِس کا سب سے زیادہ نقصان مغربی معاشروں کو ہوگا۔ اب پوری دنیا ایک بڑے گاؤں میں تبدیل ہوچکی ہے اور اس میں رہنے والے زندگی گذارنے کے لئے اپنے اپنے طریقے اپنائے ہوئے ہیں جنہیں تبدیل کرانا آسان نہیں۔ ہاں، یہ بات درست ہے کہ قربتیں بڑھنے کی وجہ سے بالآخر وہی طریقہ حیات زندہ رہے گا جو انسان کی بالادستی تسلیم کرے گا۔ میرا ایمان ہے کہ اسلام ہی وہ ضابطہ حیات ہے۔ سیکولرازم کی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی کو اپنی سوچ دوسرے پر مسلط کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام بھی انسانوں کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن اعلان کرتا ہے:

لَآ اکرہ فی الدین یعنی دین زبردستی مسلط نہیں کیا جاسکتا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایسا فلسفہ جدید معاشرے کی بنیاد بن سکتا ہے جس میں تمام مذاہب کے زندہ رہنے کی ضمانت موجود ہو۔ قرآن نے حتمی فیصلہ دے دیا کہ تمہارے لئے تمہارا دین اور ہمارے لئے ہمارا دین۔ یہی جیو اور جینے دو کا وہ زریں اصول ہے۔ جس پر قائم رہ کر دنیا کو امن کا گہوارہ بنایا جا سکتا ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ سیکولر ازم لبرل ازم اور جمہوریت کا پرچار کرنے والا امریکہ بنیاد پرستی کا شکار ہو گیا ہے وہ کروسیڈ (مذہبی اور صلیبی جنگیں) لڑنے کا اعلان کرتا ہے وہ امریکہ جو دنیا بھر میں سیکولر ازم اور جمہوریت کا حامی ہونے کی وجہ سے ماضی میں محکوم قوموں کی آزادی کی جنگوں کی حمایت کرتا رہا ہے۔ آج عراق فلسطین، کشمیر، لبنان اور افغانستان میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے والوں کو خودکش بمبار اور دہشت گرد کہہ کر سیکولر ازم اور جمہوریت کا مذاق اڑا رہا ہے کل تک جو امریکہ کے نزدیک مجاہدین آزادی (Freedom Fighters) تھے آج امریکہ کی بنیاد پرستی کا شکار ہیں۔

میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ ایک طویل موضوع ہے اور رات بھی گہری ہو گئی ہے پھر کبھی موقع ملا تو اس پر مزید گفتگو کریں گے۔

والسلام!

تمہارا والد!

جاوید ہاشمی!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کوے کی لاش

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

2 مارچ 2006ء

بشو بی بی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

کل مارچ کی پہلی تاریخ تھی، موسم بہار جوبن پہ تھا۔ صبح سویرے تالہ کھلنے کی آواز آئی تو میں لپک کر باہر آ گیا۔ ابھی دُھند لکا سا تھا اور ہوا میں بھی خاصی خنکی تھی۔ مسبری کے پھولوں کی آنکھیں نیم وا ہو چکی تھیں، یہ پھول سورج نکلنے کے ساتھ جاگ جاتے ہیں اور سورج غروب ہوتے ہی پتیاں ایک دوسرے کے ساتھ لپٹ کر سو جاتی ہیں، ان پھولوں کو بچوں کی طرح جلد سونے کی عادت ہے۔ چند قدم آگے چلا تو سامنے کوے کی لاش پڑی تھی۔ ٹہنیوں پر اس کے عزیز و اقربا گُم سُم بیٹھے تھے، جونہی سورج کی پہلی کرن نمودار ہوئی تو اِنکے شور سے ایک حشر بپا ہو گیا۔ وہ ہر قیمت پر اس کی لاش اُٹھا لے جانا چاہتے تھے۔ ایک قیدی نے وہ لاش اٹھائی تو غول نے اُس پر حملہ کر دیا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ یہ اِس مردہ کوے سے اپنائیت کا اتنا اظہار کیوں کر رہے ہیں۔ جب لاش پھینکی جا رہی تھی تو وہ ایک بھاری جنازے کا منظر تھا۔ لاش دفن کرنے کا طریقہ سکھانے میں تو کوا ویسے بھی انسان کا استاد ہے۔ مجھے ایک اور کوے کی لاش یاد آ گئی جو کسان اپنے کھیتوں میں کسی اونچی جگہ پر ٹانگ دیتے ہیں، تاکہ زندہ کوے اسکے عبرت ناک انجام سے سبق حاصل کریں اور واقعہ بھی یہی ہے کہ کوے اس کھیت کے قریب نہیں آتے۔

انسانوں، پرندوں، درندوں اور جانوروں کی بہت سی عادات ایک دوسرے سے کافی قریب ہیں۔ دورِ حاضر کا انسان درندگی کو کامیابی قرار دینے پر تُلا ہوا ہے۔ صبح کے اخبارات میں یہ خبر پڑھ کر دل بجھ سا گیا کہ شمالی وزیرستان میں بیسیوں انسانوں کو اپنی فوج نے تہ تیغ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کردیا۔ ان بستیوں میں رہنے والوں کا جرم کیا تھا۔ معصوم بچے، عورتیں، بوڑھے سب راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو گئے، انسانی درندگی کے اس مظاہرے پر زمین پھٹ کیوں نہیں گئی۔ انسان اتنی جلدی "ثم رددنہ اسفل سافلین" کے مقام پر کیوں پہنچ جاتا ہے۔

3 مارچ یعنی کل امریکہ کے صدر بش نے چند گھنٹے کیلئے پاکستان آنا ہے۔ فوجداروں نے اپنے آقا کو پچاس جانوں کا بلیدان پیش کیا۔ گزشتہ چھ سال کی حکمرانی میں ہمارے فوجیوں نے وطیرہ بنالیا ہے کہ وہ امریکہ جائیں یا امریکہ سے کوئی آقا پاکستان آئے، لوگوں کو ہلاک کر کے اعلان کر دیا جاتا ہے کہ دہشت گردوں کا مکمل خاتمہ کر دیا گیا، دوسرے دورے کیلئے نئی کھیپ تیار کر لی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسا خونچکاں سلسلہ ہے جو بند ہونے کو نہیں آرہا۔ فوجی حکمران اس طرح دور اقتدار کی سند حاصل کر لیتے ہیں اور وردی کی صورت میں خلعت فاخرہ بھی۔ جس طرح روم کے جرنیل انسانوں کو شیروں کے پنجرے میں ڈال کر ان کی خوفناک چیخوں سے تفنن طبع پیدا کر لیتے تھے اور اپنے بادشاہوں سے داد بھی وصول کرتے تھے۔ ہمارے فوجدار بھی یہ خونی کھیل جاری رکھے ہوئے ہیں۔

امریکہ نے افغانستان اور عراق کو خون میں نہلا دیا۔ اب ایران اور پاکستان کی باری ہے۔ امریکہ اس مقصد کیلئے ہندوستان اور اسرائیل کو فطری حلیف سمجھتا ہے، ان کے ذریعے وہ اس خطے کے قدرتی وسائل پر قابض ہونا چاہتا ہے۔ اَب تک اُسے شدید ناکامیوں کا سامنا ہے، ساؤتھ ایشیا میں وسائل پر قبضے کا خواب چکنا چور ہو رہا ہے۔

انسانی تاریخ میں لاشوں کو بہت اہمیت حاصل رہی ہے۔ فاتحین لاشوں کے مینار بناتے رہے ہیں۔ تا کہ ان کا خوف محکوموں پر طاری ہو جائے۔ کچھ لاشیں درسِ عبرت بن گئیں اور کچھ لاشیں منارہ نور بن کر تاریخ کے زریں صفحات پر زندگی کی علامات بنیں۔

امام حسین علیہ السلام، سقراط، منصور حلاج، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو موت بھی نہیں مار سکی۔ دُنیا کی چھ ارب آبادی میں سے چار ارب کو یقین ہے کہ حضرت عیسیٰ زندہ ہیں۔ پھانسی کا پھندا اُنکا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فرعون کی لاش دریائے نیل کی موجیں بھی نہ نگل سکیں۔ خُدائی کا دعویٰ کرنیوالے کے فلسفہ فرعونیت کو قبول کرنیکی جرأت کوئی نہ کرسکا، آج بھی خدائی کے دعویدار موجود ہیں، موسیٰؑ کا وجود تقاضائے فطرت ہے۔ شاید اسی لئے خدا نے اپنی آخری کتاب میں فرمایا کہ فرعون کی لاش کو عبرت کیلئے محفوظ کردیا گیا ہے تاکہ اگر کوئی کلیم پیدا نہ ہو تو، فرعون کی لاش خود اپنی داستان سنانے کیلئے موجود ہو۔

میری توجہ ایک اور لاش کی طرف چلی گئی۔ یہ لاش ٹامس کراموئیل (Cromwell) کی تھی جس نے آئینی حکومت کا تختہ اُلٹ کر اقتدار پر قبضہ کرلیا، قوم نے اُسکے مرنے کے بعد بھی اِس گناہ کو معاف نہیں کیا، اُس پر اُس کی موت کے بعد مقدمہ چلایا گیا، عدالت نے اُسے سزائے موت دی، اُسکی قبر کھود کر لاش نکالی گئی، اُسے لندن شہر کے تاریخی مقام "ٹریفالگر سکوائر" کے درمیان پھانسی دیدی گئی، یہ لاش کئی ماہ تک لٹکتی رہی۔ اِس اقدام سے برطانیہ فوجی طالع آزماؤں کی دسترس سے ہمیشہ کیلئے محفوظ ہوگیا، جمہوریت کی جڑیں اِتنی گہری ہوگئیں کہ آج تک برگ وبار لارہی ہیں۔

ہمیں لاشوں کی سیاست کی بجائے عوام کی بالادستی کو قبول کرلینا چاہیے۔ ضروری نہیں لاشوں سے سبق حاصل کیا جائے۔

والسلام

تمہارا والد

جاوید ہاشمی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دلیل، نہ وکیل، فقط تعمیل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

میمونہ بی بی!

السّلام علیکم! مزاج بخیر!

ذوالفقار علی بھٹو کو جب بار بار عدالتوں کے دھکے کھانا پڑے تو انہوں نے سرائیکی کے ایک شعر میں اس دردناک لمحوں کا نقشہ کھینچا انہوں نے کہا

ورداں دی ماری جندڑی علیل اے

سوہنا سَیں سندا ڈکھ دی اپیل اے

چند روز پہلے جیل حکام نے مجھ سے ایک نوٹس کی تعمیل کرائی، تو میں اسی کیفیت میں مبتلا تھا اس نوٹس میں انکم ٹیکس ٹربیونل کی طرف سے حکم تھا کہ 06-09-2005 تاریخ کو میرے خلاف چیف انکم ٹیکس کمشنر نے نالہ وفریاد کی ہے کہ انکم ٹیکس کمشنر ملتان نے کیوں مجھ پر پچاس لاکھ کا بوجھ لادنے سے انکار کیا ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ محترمہ بینظیر کے دورِ حکومت میں میرے خلاف ساٹھ لاکھ انکم ٹیکس کا مقدمہ بنا دیا گیا اور تمہاری والدہ کے خلاف بھی تقریباً تیس لاکھ واجب الادا ٹھہرائے گئے۔

ہماری حکومت کے زمانے میں ہمیں کوئی نوٹس نہ ملا تو ہم نے سمجھا کہ سیاسی انتقام کے تحت بنایا گیا مقدمہ آپ اپنی موت مر گیا۔ ہم دونوں میاں بیوی مع بچوں کے خوش و خرم زندگی گذار رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ بن مانگے انصاف مل گیا ہے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ پھر ہماری حکومت نہ رہی۔ دیکھو میں کتنا بھلا مانس بن گیا ہوں کہ فوجی حکمرانوں کی بجائے حکومت کی تبدیلی کا ذمہ دار خدا کو ٹھہرا رہا ہوں تاکہ راضی رہے ضیا دبھی........

ہماری حکومت کے جاتے ہی انکم ٹیکس کی فائلوں نے سر نکالا اور ہمیں جوابدہی کیلئے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

طلب کرلیا گیا۔ میرا وکیل ہانپتا کانپتا میرے پاس آیا اور حالِ غم سُنانے لگا۔ میں اِس ناگہانی مصیبت کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار بیٹھا تھا۔ انکم ٹیکس کمشنر سندھ کا کوئی اوڈھ راجپوت تھا۔ اُسکی رگِ انصاف اِس بے انصافی کے دور میں پھڑک اُٹھی اُس نے مقدمہ کا تفصیلی فیصلہ تمہارے والدین کے حق میں لکھ مارا۔ آج کے دور میں اِس جنسِ نایاب کا ملنا اگرچہ کافی دُشوار ہے، قدرت مجھے بتانا چاہتی تھی کہ ایسے لوگ موجود ہیں جن کے دم سے ابھی انسانیت قائم ہے۔ فیصلے کے آتے ہی حکومتی ایوانوں میں بھونچال آگیا کہ ایسے فرد کو مسٹر کلین ہونے کا سرٹیفکیٹ کیوں جاری کیا گیا جسے وہ نمونۂ عبرت بنانا چاہتے ہیں۔ لہٰذا حکومت کی طرف سے انکم ٹیکس ٹربیونل میں اِس فیصلے کیخلاف اپیل دائر کر دی گئی۔ دراصل میں اُسی نوٹس کا ذکر کر رہا تھا جو مجھے ٹربیونل کی طرف سے جیل میں ملا۔

تم یہ بات اچھی طرح جانتی ہو کہ مقدمات کی بھرمار نے مجھے اُنکے نتائج سے بے نیاز کر دیا ہے۔ میں نے سوچا تیرہ سال سے اِس مقدمے کی پیروی کر رہا ہوں جو کسی طور بھی مجھ سے متعلق نہیں ہے۔ میں تنگ آیا ہوا تھا، میں نے تمہاری والدہ سے مشورہ کیا کہ جو ہونا ہے ہونے دیں۔ ہمارے پاس ہے کیا، جسکے بچاؤ کی جنگ لڑیں اور یہ بات بھی اپنی جگہ بالکل دُرست ہے کہ میرے پاس مقدمے کے اخراجات کیلئے اضافی اخراجات کا حصول بھی آسان نہ تھا۔ اِس لئے کسی وکیل کو پیش ہونے کیلئے نہ کہا۔

آج انکم ٹیکس ٹربیونل کی طرف سے اُن کا فیصلہ موصول ہوا ہے جس میں ہماری غیر حاضری کے باوجود حکومتی اپیل مسترد کر دی گئی اور یہ بھی لکھ دیا کہ مدعا علیہ یعنی میری طرف سے کوئی دفاع کیلئے پیش نہیں ہوا۔ میں خوش بھی تھا اور حیران بھی.... اِسی قسم کا فیصلہ تمہاری والدہ کے مقدمے میں بھی کیا گیا۔

مجھے اپنے حق میں فیصلے کی خوشی سے بھی زیادہ خوشی اِس بات کی تھی کہ ابھی خیر کا عنصر معاشرے میں موجود ہے۔ تیرہ سال جس طرح مجھے اِس مقدمے میں زچ کیا جاتا رہا، وہ ایک طویل داستان ہے، جسکی تفصیل میں جانے کا نہ موقع ہے اور نہ اِسکی ضرورت۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں اُس فیصلے کو اپنی جدو جہد کے صبر آزما مرحلے کا حصہ سمجھتا ہوں۔ اِسی لئے اِسے کتاب کا حصہ بنا کر تاریخ کا حصہ بنانا چاہتا ہوں۔ اتفاق سے ایک جج کا نام منصف خاں ہے انہوں نے اپنے نام کی لاج رکھ لی ہے۔

والسّلام!

تمہارا والد!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

شناخت پریڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

میمونہ بی بی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

جیل کے اندر کی زندگی میں ہر قیدی کی شناخت ختم کر کے اسے نمبر الاٹ کر دیا جاتا ہے لہٰذا قیدی نمبر 6492 جیل کے درخت نمبر 435 کے نیچے بیٹھ کر یہ خط لکھ رہا ہے۔

آج ڈیوڑھی میں گیا تو ایک مجسٹریٹ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں پہلے سے موجود تھے، گرم جوشی سے ملے۔ میرے دریافت کرنے پر کہا کہ میں ایک شناخت پریڈ کے سلسلے میں آیا ہوں، اُن کی بات سُنتے ہی میں 1970ء کی دہائی میں چلا گیا۔

مارچ 1972ء کی رات کو اسی جیل میں میری شناخت پریڈ ہوئی تھی، مجھ پر اور میرے دیگر تین ساتھیوں سمیت قتل کا مقدمہ بنایا گیا تھا۔ حفیظ خان، رانا نذر الرحمان اور نعمان بٹ سمیت سب ملزمان اِس شناخت پریڈ میں شریک تھے، ہم دُعا مانگ رہے تھے کہ خدا کرے ہمیں کوئی شناخت نہ کر سکے۔ بُلھے شاہ نے کہا ہے

اُٹھ بُلھیا چل اوتھے چلیے جتھے سارے اَنّھے
ناں کوئی ساڈی ذات پچھانے، نہ کوئی ساڈی مَنّے

اور پھر وہی ہوا، ہم میں سے کسی کی شناخت نہ ہو سکی، گویا شناخت کھو دینا کامیابی کی دلیل ٹھہرا۔

سات سال سماعت کے بعد عدالت نے ہمیں بری کر دیا، لیکن جس ذہنی کیفیت سے ہم اور ہمارے عزیز و اقارب گذرے اُسکے بیان کی چنداں ضرورت نہیں۔ اب 35 سال بعد راجہ انور نے اخبار میں کالم لکھ کر تاریخ کا قرض اُتار دیا ہے، جو اُس کے ذمے تھا۔ وہ ہمارے فریق مخالف تھے اور ذوالفقار علی بھٹو صاحب کے مشیر کے عہدے پر فائز رہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اُنہوں نے انکشاف کیا کہ برکات احمد مرحوم کا قتل اُن کے اپنے ساتھی کی گولی سے ہوا اور بعد میں قاتل کسی دوسرے ساتھی کی آبرو سے کھیلتے ہوئے خود قتل ہو گیا۔ راجہ انور نے مجھے ایک ملاقات میں بتایا کہ اگرچہ اِس واقعہ کو کافی عرصہ بیت گیا تھا، مگر میں چاہتا تھا حقیقت حال چھپائے رکھنے سے بہتر ہے کہ اُسے ریکارڈ پر لایا جائے، اتنا عرصہ بعد حقیقت حال بیان کرنے پر میں راجہ صاحب کا شکر گذار ہوں، اُنہوں نے مجھے مزید وضاحت سے بچا لیا۔ یہ قتل اُس وقت ہوا تھا جس وقت انتخابی نتائج کا اعلان کرنے کیلئے پنجاب یونیورسٹی کے اولڈ کیمپس میں ووٹوں کی گنتی جاری تھی۔ پنجاب یونیورسٹی کا ہر فرد جانتا تھا کہ میں تقریباً بلا مقابلہ صدر منتخب ہو چکا تھا، خود اپنی کامیابی کے نتیجے کو روکنے کیلئے میں یا میرا گروپ جھگڑے کی صورت کیوں پیدا کرتا؟ پچھلے دنوں برکات رشید کے خالہ زاد اور اس کے مقدمے کے مدعی مجھے ملنے آئے تو سارے گِلے جاتے رہے، ملک طارق خورشید پیپلز پارٹی کے سرگرم راہنما ہیں انہوں نے ایک کتاب سوئے دار لکھی ہے جس میں ان کی آٹھ سالہ قید کی داستان ہے انہیں اٹک قلعہ سے لے کر پنجاب کی ساری جیلوں میں پھرایا گیا مگر ان کے قدم کبھی نہ ڈگمگائے میں ان کی جدو جہد کو سلام پیش کرتا ہوں۔

آج کل اخبارات میں ایک اور شناخت پریڈ کا بہت چرچا ہے۔ توہین رسالت ﷺ کے سلسلہ میں نکلنے والے جلوسوں کا سارا ملبہ خواجہ سعد رفیق اور زعیم قادری پر ڈالنے کے لئے انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ صرف گرفتاری پر اکتفا نہ کیا گیا بلکہ عدالتوں میں پیش کرتے وقت زعیم قادری کے سر اور منہ کو ایک سیاہ تو بڑے سے ڈھانپ دیا گیا۔ اخبارات میں چھپنے والی تصویر انتہائی ذلت آمیز تھی۔ جب اخبارات میں اس طریقہ کار پر تنقید کی گئی تو حکومت نے جو جواب دیا وہ انتہائی مضحکہ خیز تھا۔ کہا گیا چونکہ ان کی شناخت پریڈ ہونا باقی ہے، اس لئے ان کا چہرہ ڈھانپنا ضروری تھا۔

خواجہ سعد رفیق اور زعیم قادری کو کون نہیں جانتا۔ خواجہ سعد رفیق اس دور میں قوم کی آبرو ہیں۔ وہ قومی اسمبلی کے منتخب ممبر بھی ہیں۔ ان کے والد محترم سے بھی پورا پاکستان

www.iqbalkalmati.blogspot.com

واقف ہے۔اسی طرح سید زعیم قادری بھی، نہ صرف پاکستان مسلم لیگ (ن) پنجاب کے سیکرٹری جنرل ہیں اور وہ میاں نواز شریف کے ترجمان بھی ہیں، ان کا خاندان برصغیر کے نامور اور ممتاز خاندانوں میں سے ایک ہے۔ کیا وہ رسالت مآب کی آبرو کے تحفظ کے جلوسوں میں شریک ہو کر اپنی شناخت کھو چکے ہیں۔ یہ کسی بیمار ذہنیت کی سوچ ہے کوئی ذی شعور ایسی حرکت کا سوچ بھی نہیں سکتا۔

پاکستان میں ایسے حکمرانوں کو لایا گیا جنہیں اپنی والدہ کی قبر کا نشان تلاش کرنے میں مشکل درپیش تھی۔ موجودہ وزیر اعظم کے بارے میں بھی کوئی نہیں جانتا۔ وہ کس جگہ کے رہنے والے ہیں۔ اگر وہ اپنی جائے رہائش کا بتا دیتے تو ان کے ہمسایوں کی ان کے بارے میں رائے پر اعتماد کیا جا سکتا تھا۔ ہماری معیشت ٹھیک کرنے کے لئے ایسے لوگ لائے گئے جنہوں نے پاکستان میں مرنا اور دفن ہونا بھی پسند نہ کیا۔ انہوں نے پاکستان کو اپنے اقتدار کے لئے استعمال کیا، مگر پاکستان کو اپنی شناخت نہ بننے دیا۔ اب ان کی شناخت پریڈ ہونی چاہیے جنہوں نے پاکستان کی شناخت خراب کی ہے۔

والسلام

تمہارا والد!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انقلاب کے آثار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

میمونہ بی بی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

دو روز قبل تیز ہوا کے جھونکوں سے بکائن کا وہ درخت زمین بوس ہو گیا، جس کے سائے تلے بیٹھ کر میں آنے والے وقتوں کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ اِس درخت کی عمر تقریباً دس سال تھی۔ جب وہ گرا تو معلوم ہوا کہ اُس کے تنے کو مٹی نے چاٹ لیا تھا۔ وہ بظاہر صحت مند تھا۔ گرنے پر معلوم ہوا کہ اُس کی جڑیں اُس کا ساتھ پہلے ہی چھوڑ چکی تھیں۔ میں نے شاخوں پر اُس کے بیجوں کا تذکرہ ایک خط میں کیا تھا۔ وہ بیج بھی صفائی والے عملے نے دالان سے باہر پھینک دیئے۔ میں درخت گرنے سے مغموم تھا۔ ساتھی کہہ رہے تھے کہ اللہ نے آپ کو بچا لیا ہے، آپ شکر ادا کریں۔ دراصل جہاں درخت گرا، چند لمحے پہلے وہاں میں بیڈمنٹن کھیل رہا تھا، وہ میری جان بچنے پر مجھے مبارکباد دے رہے تھے۔ میں ساری رات اُس کی جدائی میں اداس رہا۔

ہمارے ملک میں ایسے نظام چلائے جا رہے ہیں۔ جو، بظاہر، شجر سایہ دار کی طرح ہیں۔ لیکن اُن کے تنے کھوکھلے ہو چکے ہیں۔ اُن کے سروں پر بُرائی کا بیج ہے، جو ہوا کے ایک جھونکے سے لرز جاتے ہیں۔ کیونکہ اُن کی جڑیں زمین کی گہرائی تک نہیں پہنچتیں۔ وہ تپتے صحراؤں کی دھوپ میں قوم کو تنہا چھوڑ کر منہ کے بل گر جاتے ہیں۔ صرف وہی نظام زندہ رہتے ہیں جنکی جڑیں عوام میں ہوں۔

1988ء میں جب جناب ضیاء الحق کی تدفین کی تقریب ایسے پرشکوہ انداز میں ہو رہی تھی کہ، شاید ہی کسی شہنشاہ کو اِس انداز سے لحد میں اُتارا گیا ہو۔ دُنیا بھر کے عالی مرتبت نمائندگان موجود تھے۔ افواجِ پاکستان کے ڈسپلن نے بھی سماں باندھ رکھا تھا۔ خبر رساں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ادارے پل پل کی خبر براہ راست لوگوں تک پہنچا رہے تھے۔ میرے ساتھ بیٹھی ہوئی مشہور مؤرخ "ایما ڈنکن" (EMA DANCON) نے کہا: کہ دیکھ لینا" دس سال کے اندر فوج اقتدار سنبھال لے گی" مجھے اس بات کی منطق سمجھ نہ آئی تو اُس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ایک ایسا شخص جس نے دس سال تک ملک پر آمریت مُسلط کیے رکھی اُسے قوم اتنے شاندار انداز سے الوداع کر رہی ہے۔ تو آج کے میجر یا کرنل کے دِل میں ایسی موت کی تمنا کیوں پیدا نہ ہو گی، صرف اُنہیں جنرل یا کمانڈر انچیف بننے کا انتظار کرنا ہو گا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اُس وقت کے کرنیل اور میجر ہی اِس وقت ملک پر حکمرانی کر رہے ہیں۔

میں کل ڈیوڑھی میں ملاقات کر رہا تھا کہ ایک کپتان اور میجر پاک فوج کی وردی میں ملبوس کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ جیل حکام سے کسی مسئلہ پر بات کرنے کیلئے آئے تھے۔ مجھے دیکھ کر میرے پاس آ گئے اور کہنے لگے، ہم آپکی صحت کے بارے میں متفکر رہتے ہیں۔ میں نے اُنہیں بتایا کہ اللہ نے مجھے بہترین صحت سے نوازا ہے، آپکی ہمدردی کیلئے آپکا شکر گذار ہوں، اُنہوں نے مجھے اپنی دُعاؤں سے نوازا۔ میرے ایک ساتھی نے کپتان کی وردی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ فوج میں کپتان کی وردی تمام وردیوں سے خوبصورت ہوتی ہے۔ نوجوان کپتان نے کہا کہ اگر کوئی آپ کے کہنے پر وردی نہیں اُتارتا تو میں حاضر ہوں، میجر نے میرے قریب آ کر کہا خدا آپکو اپنے مقصد میں کامیابی دے، آپ ہم سب کا سرمایہ ہیں۔

پچھلے دِنوں مجھے ایک نوجوان ملنے کیلئے آیا تو اُس نے ایک دلچسپ واقعہ سُنایا، اُس نے بتایا کہ وہ مقابلہ کا امتحان پاس کر چکا ہے اور اب آفیسرز اکیڈمی میں تربیت حاصل کر رہا ہے، کہنے لگا میں جب سروسز ٹریبونل میں پیش ہوا، انٹرویو کے دوران سروسز ٹریبونل کے چیئرمین جنرل جمشید کیانی نے کہا کہ آپکی زندگی کا آئیڈیل کون ہے تو میں نے دو نام لیے ایک آپکا اور دوسرا ڈاکٹر شاہد عمران کا، میں انٹرویو دیکر باہر آیا تو دوستوں نے کہا تم نے حماقت کی ہے، میں نے اُنہیں کہا کہ میں سچ کہنے سے اپنے آپکو باز نہ رکھ سکا اِس لیے میرا ضمیر مطمئن ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جب مجھے سیلیکٹ (Select) کر لیا گیا تو سب حیران تھے اور خود مجھے بھی حیرانی ہوئی۔
آج اخبارات سے پتا چلا کہ جنرل جمشید کیانی نے وزیر اعظم اور جنرل کی مداخلت کے
خلاف بطور احتجاج استعفیٰ دیدیا ہے۔

بشریٰ بی بی! ایماڈنکن تو شاید لندن میں ہو گی تم بتاؤ کہ آنیوالی بیوروکریسی خواہ وہ فوجی
ہو یا سول دس سال بعد پاکستان کے سیاسی منظر پر اُسی طرح چھائی رہے گی جیسے اب ہے؟
میں سمجھتا ہوں کہ احساسِ زیاں پیدا ہو چکا ہے یہی احساس قوموں کا سرمایہ ہوتا ہے خدا
کرے رویوں میں تبدیلی برپا ہونے میں اتنی دیر نہ ہو جائے کہ کہنا پڑے!

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

والسلام

تمہارا والد!

جاوید ہاشمی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ناکام ریاست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

3 مئی 2006ء

میمونہ بیٹی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

آج کی شام بہت اُداس تھی، سوچا آپ سے بات کر کے دل کا بوجھ ہلکا کرلوں، میں کسی اور کو اپنی اُداسیوں میں شریک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تمہیں تو اپنی اداسیوں کا وافر حصہ پہلے ہی منتقل کر چکا ہوں۔

آج کل گرمی زوروں پر ہے۔ بجلی چلی جاتی ہے تو رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں دم گھٹتا ہے۔ ویسے بھی میرے کمرے کو جالیوں کے نام پر چاروں جانب سے لوہے کے غلاف میں ڈھانپ دیا گیا ہے جہاں پر ہوا آسکتی ہے اور نہ روشنی۔ بجلی ہو بھی تو اُسکا ہونا نہ ہونا ایک برابر ہے۔ وہ اتنی کمزور ہوتی ہے کہ بلب ٹمٹماتا رہتا ہے اور پنکھا چلنے کی بجائے رینگتا ہے۔ یہ سب کچھ تو ہے، مگر میری اُداسی کا سبب کچھ اور ہے۔ پچھلے دنوں ایک جھکڑ کی زد میں آ کر ہمارا نیم کا درخت زمین بوس ہو گیا۔ مارچ کے مہینے میں اُس کی شاخوں پر کونپلیں پھوٹی تھیں اور دیکھتے دیکھتے وہ ہرا بھرا ہو گیا۔ جنوری فروری میں وہ بالکل ٹنڈ مُنڈ تھا مگر اب میں اُسکی چھاؤں میں بیٹھ کر مطالعہ کیا کرتا تھا۔ جب وہ گرا تو انکشاف ہوا وہ اندر سے کھوکھلا ہو چکا تھا۔ ہمارے عالمی نظام کی طرح چھال کے سہارے صحت مند اور توانا نظر آتا تھا۔ چھلکا اُترا تو اپنا وجود برقرار نہ رکھ سکا۔

میری اُداسی کا سبب اخبارات میں چھپنے والی وہ خبر تھی جس میں کہا گیا کہ پاکستان دُنیا کی اُن نو مملکتوں میں سے ہے جو فیل ہو گئی ہیں۔ اِس رپورٹ میں باقی ملکوں میں زمبابوے، صومالیہ، آئیوری کوسٹ، جمہوریہ کانگو، ہیٹی، عراق اور سوڈان شامل ہیں۔ جنوبی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایشیاء میں ناکام ریاستوں میں پاکستان کا نام سرِفہرست ہے۔ پہلے یہ نام چونتیسویں (34) نمبر پر تھا۔

ناکام ریاستوں کی ناکامی کا اندازہ کئی عوامل کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔ ناکام ریاست کی تعریف یہ بتائی گئی ہے۔

1- جس ملک کی حکومت کا ملک پر موثر کنٹرول نہ ہو۔

2- جس میں عوام کی بڑی تعداد حکومت کو جابرانہ سمجھتی ہو۔

3- جس میں حکومت اپنے شہریوں کو بنیادی سہولتیں فراہم نہ کر رہی ہو۔

4- جہاں حکومت پر فوج کے علاوہ دیگر مسلح گروہ حاوی ہوں۔

اس فہرست میں گنی، لائبیریا، بنگلہ دیش اور برونڈی جیسے ملکوں کو پاکستان سے زیادہ مستحکم ملک تسلیم کیا گیا ہے۔

اب تم بتاؤ میری اُداسی جائز ہے یا ناجائز۔ ہمارے فوجی حکمرانوں نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا ویسے تو موجودہ عالمی نظام میں امیر ترین ملک بھی اپنے عوام کی زبوں حالی کا حل تلاش نہیں کر سکے۔

میں ایک کانفرنس کے سلسلے میں دُنیا کے امیر ترین ملک سویڈن (SWEDEN) کے دارالحکومت سٹاک ہوم میں تھا، جہاں خودکشی کرنے والوں کی شرح دُنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے۔ میں ایک ٹھٹھرتی شام کو ہوٹل کے باہر چہل قدمی کیلئے نکلا۔ ایک لڑکی میری طرف غور سے دیکھ رہی تھی، میں نے دیکھا اُسکے چہرے پر خوف اور استعجاب تھا، (کہیں وہ مجھے دہشت گرد تو نہیں سمجھ رہی تھی) میں واپس مُڑ کر ہوٹل میں داخل ہوا تو لڑکی تیزی سے بھاگتی ہوئی ایک ڈسٹ بن (DUSTBIN) کے قریب جا کر کھڑی ہوگئی۔ جب اُسے یقین ہو گیا کہ اُسے کوئی نہیں دیکھ رہا تو گندگی میں سے چیزیں نکال کر کھانے لگی۔ میں حیرت میں ڈوب گیا۔ اگلے دِن میں نے کانفرنس میں سویڈن کے دوستوں سے اِس واقعہ کا ذِکر کیا تو کہنے لگے اِس طرح کے واقعات معمول کا حصہ ہیں، آپ پریشان نہ ہوں، یہ لوگ اپنی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

محرومیوں کا حل اِسی طرح نکالتے ہیں۔ دُنیا کی اِس کامیاب ترین ریاست کو ناکام کہنے والے کی بات پر کوئی یقین کرے گا؟

اِسی طرح ایک مرتبہ نیویارک میں ایک خاتون جس نے اپنا نام ڈورتھی (Dorthi) بتایا، اپنے ناک نقشے سے ہسپانوی لگ رہی تھی۔ میرے پاس آ کر بے تکلفی سے کہنے لگی، آپ میرے بھائی ہیں یا LOVER، مجھے اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، میری بچی کیلئے بوتل میں دودھ نہیں ہے، مجھے دودھ کیلئے پیسے چاہئیں اس کے بدلے میں حاضر ہوں۔ میں شدید صدمے سے دوچار ہو گیا۔ امریکہ نے نیو ورلڈ آرڈر متعارف کرایا ہے ساری دُنیا کے حقوق کا خدائی خدمت گار اپنے گھر کی خبر لینے کو تیار نہیں۔

جاپان میں قوم کی نوجوان بچیاں تعلیمی اخراجات پورے کرنے کیلئے زیادہ عمر کے بوڑھوں کے پاس وقت گذارتی ہیں۔ یہ مناظر آپ کو ٹوکیو (TOKYO) میں عام نظر آئیں گے۔ کہ ایک مالدار بوڑھا نوجوان لڑکی کے ساتھ جا رہا ہے۔ آپ اُنھیں باپ بیٹی سمجھیں گے۔ لیکن رشتوں کا تقدس پامال ہو رہا ہے۔ اب حکومتِ جاپان نے تنگ آ کر قانون سازی کی ہے تاکہ معاشرے کے اِس روگ کا علاج کیا جا سکے۔ جاپان کو کون ناکام ریاست ہونے کا طعنہ دے سکتا ہے؟۔ اگر اِسی طرح کی حرکت کوئی بوڑھا عرب کرے تو اِسے اسلام کی خامی کے طور پر پیش کیا جائے گا۔

ماسکو کا سارا شہر سرِ شام قحبہ خانے میں تبدیل ہو جاتا ہے، روس کی بچیاں پورے یورپ میں، حتیٰ کہ پاکستان اور دبئی میں سمگل کی جا رہی ہیں، ماسکو انسانوں کی خرید و فروخت کی سب سے بڑی منڈی بن چکا ہے۔ کیا ہمارے روشن خیال اِسی طرح کی روشنی کے آرزومند ہیں؟ ابھی ماضی قریب میں دُنیا کے ترقی پسند دانشور، روس کو مکہ اور مدینہ سے زیادہ مقدس سمجھتے تھے۔ وہ نظام جو اُنھیں بادشاہوں کی ہوسناکیوں سے بچانے آیا ناکامی و نامرادی کا شکار ہو گیا۔

برطانیہ، جس نے پوری دُنیا پر حکمرانی کی، اپنی قدامت پسندی کی وجہ سے لوگ اُسے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یورپ کا سعودی عرب کہتے تھے۔ آج اُس کا دارالحکومت لندن ایک تماشہ گاہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ سیاحت کے نام پر پیسے بٹورنے کیلئے تمام حدود و قیود توڑ دی گئی ہیں، عورت کی تذلیل انتہا کو پہنچ گئی۔ مصر کا بازار بھی لندن کی شاموں سے شرما جاتا ہے۔ پیٹ پالنے کیلئے انسان اتنی گراوٹ پر آسکتا ہے۔ یقین کرنے کو دل نہیں مانتا۔ بغیر مانے چارہ بھی نہیں۔

معیشت اور معاشرت کا یہ نظام دھڑام سے گرنے والا ہے۔ جس طرح ہمارے نیم کے درخت کو گرانے کیلئے ہوا کا ایک جھکڑ کافی تھا۔ روس جیسے طاقتور ملک کو کرچی کرچی ہوتے ہم سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ترقی پذیر ملکوں کے حکمران، درحقیقت، اِس مرنے والے نظام کے مہرے ہیں، جو اپنے انجام کو پہنچنے والے ہیں۔ ہمارے حکمران ناکام ہیں، ملک نہیں۔ جبکہ طاقتور ترین ملکوں کو بنیادی تبدیلیوں کا سامنا ہے۔

دُنیا کے کامیاب ملک کہلانے والے غریب ملکوں کے وسائل پر قابض ہو کر احساس برتری میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اُنھیں معلوم ہو چکا ہے کہ جہانِ پیر مر رہا ہے اور جہانِ تازہ اُبھر رہا ہے۔ میری اُداسی اُمید میں بدلنے لگی ہے۔ تپش اور حدت میں کمی محسوس ہونے لگی ہے، ہوا کے جھونکے لوریاں بن گئے ہیں۔ میری آنکھیں بوجھل ہونے لگی ہیں۔ میرے اندر سکون کی لہر نے تھپکیاں دے کر مجھے سُلا دیا ہے مگر میری روح بیدار ہو چکی ہے۔ مجھے پاکستان ناکام ریاست نہیں لگتا بلکہ مجھے تو اپنی منزل آسمانوں میں نظر آرہی ہے۔

خدا حافظ!

تمہارا والد!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ناقابلِ علاج

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

15 مئی 2006ء

میمونہ بی بی!

السلام علیکم!

تمہارے گلے کا کیا حال ہے؟ میرا گلہ بھی اکثر خراب رہتا تھا۔ جب سے جیل میں ہوں گلے کی خرابی دور ہوگئی ہے۔ اگر چہ یہ علاج خاصا مہنگا ہے مگر مجھے جس چیز سے افاقہ ہوا ہے اس مجرب نسخہ سے تمہیں محروم نہیں رکھنا چاہتا آزمائش شرط ہے۔

تمہاری ملتان، سرگودھا، نارووال اور لاہور کی تقریریں بس گزارہ تھیں۔ البتہ ٹوبہ ٹیک سنگھ، جھنگ، فیصل آباد اور گجرات کی تقریریں بہت پسند کی گئیں۔ لندن اور برمنگھم کے خطاب کی بہت اچھی رپورٹس ملی ہیں۔ ٹیلی ویژن پر تمہاری گفتگو سننے کا موقع ملا تو داد دینے کو جی چاہا، کافی متاثر کن تھی۔ تمہاری سرگرمیاں اخبارات کے ذریعے مجھ تک پہنچ رہی ہیں، جسے دیکھ کر خوش ہو جاتا ہوں۔

تمہارا 27 اور 28 مئی کا شیڈول دیکھا تو سوچا بیماری کے حالت میں اس پر عمل کرنا تمہارے لئے خاصا دشوار ہوگا۔ 27 مئی کو وکلاء کنونشن میں شرکت کے بعد تمہیں اسلام آباد پہنچنا ہے۔ وہاں سے 28 مئی کی صبح مردان میں یوم تکبیر کے سلسلہ میں منعقد ہونے والی تقریب میں حاضری دینا ہے۔ شام کو اسی سلسلے میں اسلام آباد کے منعقد ہونے والے جلسے میں پہنچنا بھی ضروری ہے۔ بات یہیں ختم نہیں ہوگی، بلکہ اس روز کی آخری اور بہت اہم تقریب لاہور میں منعقد ہو رہی ہے۔ وہاں کی جماعت کا بھی تمہاری شرکت پر اصرار ہے۔ بالکل اگلے روز یعنی 29 مئی کو پشاور میں صوبے بھر کے پارٹی کارکن اور راہنما اکٹھے ہو رہے ہیں۔ وہاں پر بھی تمہارا خطاب ضروری ہے۔ اتنی تقاریر کے بعد اگر گلا جواب نہ دے تو کیا کرے۔ میں نے تیر بہدف علاج بلاوجہ تجویز نہیں کیا تھا، پھر نہ کہنا بزرگوں نے رہنمائی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نہیں کی تھی۔تم تو جیل کو بری جگہ کہہ ہی نہیں سکتی۔ جہاں تمہارے والد کو بار بار رہنا پڑا ہوتم اسے بری جگہ کہہ کر اپنے والد کی شان میں بے ادبی نہ کر بیٹھنا۔ ہم تو نیک و بد حضور کو سمجھائے دیتے ہیں۔ آگے جو مرضی آپ کی۔

بھلی ہے ہم نفسو اس چمن میں خاموشی　　کہ خوشنواؤں کو پابند دام کرتے ہیں

تمہیں خط لکھ رہا تھا تو سزائے موت کی کوٹھڑی سے بھیجی گئی سردائی مل گئی۔ تمہیں کیا معلوم سردائی کیا ہے؟ تمہیں تو کوکا کولا اور سیون اپ کا پتہ ہوگا۔ اسی کو تو (Generatio Gape) جنریشن گیپ کہتے ہیں۔

رات کو ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں ٹیلی ویژن پر جرمنی اور اٹلی کے درمیان فٹ بال کا سیمی فائنل دیکھ رہا تھا؟ دونوں ٹیموں نے شاندار کھیل پیش کیا۔ میری ہمدردیاں اٹلی کے ساتھ تھیں۔ ایسا کیوں تھا؟ میرے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں۔ بہرحال اضافی وقت میں اٹلی نے یکے بعد دیگرے دو گول کر کے میچ جیت لیا۔ جرمن قوم کے چہرے آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ میں جیل کی کوٹھڑی میں بیٹھے ہوئے اپنی پسندیدہ ٹیم کی فتح کا جشن منانے کی بجائے جرمن قوم کی شکست کا حصہ دار بن گیا۔ صف ماتم بچھی تو اس میں میرے آنسو بھی شامل تھے۔

میں اپنے اس رویے پر غور کرنے لگا تو میرا ماضی میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ مجھے تمام عمر کمزور اور مظلوم لوگ اپنے اپنے سے لگے۔ بلکہ جب میں نے مزید غور کیا تو عجیب انکشافات ہونے لگے۔ میں جیل میں طاقتور بلیوں کے بلاوجہ خلاف ہو جاتا ہوں اور کمزور بلیوں سے دوستی کر لیتا ہوں۔ یہی حال پرندوں کا ہے، جب کوے کمزور چڑیوں کو دانہ دنکا نہیں چگنے دیتے، میں انہیں بھگاتے بھگاتے ہانپ جاتا ہوں۔

بنگالیوں کو ہم سے جدا ہوئے پینتیس چھتیس سال ہو گئے ہیں۔ ہوسکتا ہے بنگلہ دیش کا قیام ان کے لئے بہتری کے نتائج لایا ہو۔ ان کی فی کس آمدنی بھی ہم سے زیادہ اور ان کے زرمبادلہ کے ذخائر بھی زیادہ ہیں۔ مگر میں ان پر ہونے والی زیادتیوں پر ابھی تک آنسو بہاتا ہوں۔ ہمارے شاہ دماغ انہیں ہماری معیشت پر بوجھ سمجھتے تھے۔ انہیں بھوکے بنگالی کہہ کر ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ اب وہ ہم سے زیادہ امیر ہیں، مگر ان پر چلنے والی گولیوں کی آواز

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آج بھی میرے سکون کو درہم برہم کردیتی ہے۔

میں شاید شروع سے ہی ایسا تھا۔ میرے بچپن کے دوست وہی تھے۔ جنہیں معاشرہ دھتکار دیتا تھا۔ گاؤں کے انہی لوگوں سے میرا تعلق زیادہ بن جاتا تھا جن کو حقیر سمجھا جاتا تھا۔

دنیا بھر کے غریب، خواہ وہ افریقہ میں ہوں، لاطینی امریکہ میں ہوں یا دنیا کے کسی حصے میں، ان کی تکلیفیں یاد کر کر کے رونے لگتا ہوں۔ فلسطینیوں، کشمیریوں، عراقیوں، پشتونوں اور بلوچوں کے بارے میں زیادتی کی خبریں میرے لئے سوہان روح بن جاتی ہیں۔ میں تو اہرام مصر اور تاج محل بنانے والے مزدوروں کی اموات یاد کر کے بھی روتا ہوں۔ تمہیں علاج تجویز کر رہا ہوں خود نا قابل علاج ہوں۔

خدا حافظ!

تمہارا والد!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

موروثیت کی سیاست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

20 مئی 2006ء

میمونہ بی بی!

السلام علیکم!

میں نے ملاقاتوں میں بارہا آپ سے کہا ہے کہ میری محبتیں اپنی بیٹیوں پر نچھاور ہیں، لیکن آپ کا احترام میرے دل میں اس وقت پیدا ہوگا جب آپ میرے فیصلے اور میری کارکردگی کو ایک نقاد کی حیثیت سے دیکھیں گی۔ اگر آپ میری محبت میں میرے ہر فیصلے پر آنکھیں بند کر کے عمل کرنا شروع کر دیں تو یہ بات مجھے پسند نہ ہوگی۔

میں ایسے نظام کو کبھی پسند نہیں کر سکا، جس میں قیادت نسل در نسل، ایک خاندان میں مرکوز ہو جائے۔ حضور ﷺ نے اپنی خلافت کے بارے میں کسی فیصلے کا اعلان نہیں فرمایا اور نہ ہی اس سلسلے میں کوئی واضح حدیث موجود ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی حکمت کا تقاضا تھا۔ اتنا بڑا ضابطہ حیات دینے کے بعد، جس میں معمولی معمولی باتوں کی وضاحت کر دی گئی ہو، خلافت کی تصریح نہ کرنے، میں یقیناً کوئی مصلحت پوشیدہ ہے۔

حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے بھی اپنی اولادوں کو اس وراثت میں شامل نہیں کیا۔ حضرت علی علیہ السلام سے جب وقت شہادت پوچھا گیا کہ آپ کے بعد کسے خلیفہ تسلیم کریں تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا یہ آپ زندوں کا کام ہے۔ لوگوں نے حضرت حسن علیہ السلام کی طرف اشارہ کیا، آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا میں نے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا ہوں۔ حضرت علی علیہ السلام کے عمل کے برخلاف حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یزید کو اپنی زندگی میں خلافت کے لئے نامزد کر دیا جو کہ ایک ناپسندیدہ عمل ٹھہرا۔ خود یزید کے بیٹے نے یہ کہہ کر خلافت لینے سے انکار کر دیا کہ جس اقتدار کے لئے اتنا خون بہایا گیا، اس کی حیثیت ایک جلی ہوئی رسی کے برابر بھی نہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حضرت امام حسین علیہ السلام نے جب یہ کہا کہ میں ایک فاسق و فاجر کی بیعت کرنے کے بجائے عساکر اسلام میں شامل ہو کر جہاد کرتے ہوئے اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کردوں گا تو ثابت کردیا کہ خلافت کے لئے نسب کی بجائے اہلیت اور کردار کی اہمیت زیادہ ہے۔ امام عالی مقام کے اس عمل نے اسلام کو موروثیت کے بدبودار نظام سے بچالیا۔ بلکہ انہوں نے رائے اور ووٹ کے آزادانہ استعمال کے لئے اپنی جان دے کر اسلام کو جمہوریت کا روشن مینار بنادیا۔

آج کی دنیا میں وہی معاشرے ترقی یافتہ کہلانے کے حق دار ہیں جہاں آزادی اظہار کے ذرائع کو وسعت دی گئی ہے اور حکمرانی کو چند خاندانوں میں محدود نہیں کیا گیا۔ اس عمل سے بہترین دماغوں کا انتخاب کرنے میں مدد ملی ہے اور اجتماعی سوچ پیدا ہوئی ہے۔ جس سے ان قوموں نے بھی تاریخ میں مقام پیدا کرلیا ہے، جو عام طور پر اس امانت کے قابل ہی نہیں سمجھی جاتی تھیں۔

موجودہ دور کا مسلم معاشرہ ابھی تک فرد واحد کے شکنجہ میں جکڑا ہوا ہے۔ وہ ملوکیت سے خلافت کی طرف واپس نہیں آسکا۔ درحقیقت خلافت ہی جمہوریت ہے۔ اس عہد میں فقط برصغیر ہندو پاک کے مسلمان ایسا استثناء ہیں جنہوں نے سیاست کی ایسی بنیاد رکھی جس میں موروثیت کو ابتداء سے ہی رد کردیا گیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام سے اب تک کسی صدر کا بیٹا صدر نہیں بن سکا۔ اسی روایت کو قائداعظم نے برقرار رکھا۔ قیام پاکستان کے بعد بھی مسلم لیگ میں کوئی ایسی مثال قائم نہیں کی جاسکی۔ اگرچہ مسلم لیگی حضرات کا کردار، قیام پاکستان کے بعد، قابل رشک نہیں رہا۔ بلکہ بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ مسلم لیگ کو اقتدار کی باندی بنادیا گیا۔ اس کے باوجود مسلم لیگ پر کسی ایک خاندان کی چھاپ نہیں لگ سکی۔ اس کے مقابلے میں آل انڈیا کانگریس کا اگر جائزہ لیں تو ایسے نظر آتا ہے کہ شاید اسے صرف نہرو خاندان کے لئے بنایا گیا ہو۔ محدود وقت کے لئے کچھ لوگ کانگریس کے سربراہ بنے مگر وہ بھی برائے نام موجودہ حالات تو انتہائی مضحکہ خیز ہیں۔ کہ ایک ارب بیس کروڑ کی آبادی میں سونیا گاندھی کے علاوہ کوئی ایک فرد بھی اس لائق نہیں سمجھا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گیا۔ جس کے سر پر کانگریس کی صدارت کا تاج رکھا جا سکے۔ مجھے سونیا گاندھی کی صدارت سے اختلاف نہیں موروثیت کے نظام سے چڑ ہے۔ میں اسے انسان کی عظمت کے خلاف سمجھتا ہوں کہ اُسے نسل، رنگ اور ذات کے حوالے سے اہم یا غیر اہم سمجھا جائے۔

پاکستان میں تمام سیاسی جماعتوں پر موروثیت کا ٹھپہ لگا ہوا ہے۔ اس میں مذہبی اور ترقی پسند جماعتوں کی تخصیص بھی نہیں ہے۔ مذہبی جماعتوں میں جمعیت علماء اسلام کے سربراہوں مولانا فضل الرحمٰن اور مولانا سمیع الحق کی اہمیت اپنے والدین کی وجہ سے ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا مفتی محمود نے ہمیشہ حق کا ساتھ دیا مولانا فضل الرحمٰن کی سیاسی بصیرت مسلمہ ہے۔ اُن سے میری ذاتی نیازمندی ہے۔ مگر ضروری تو نہیں کہ ان کی جماعت میں کوئی دوسرا فرد اس قابل نہ ہو جو ان کی جگہ سنبھال سکے۔ ابھی مولانا شاہ احمد نورانی کی جگہ ان کے صاحبزادے انس نورانی کو اُن کی گدی پر بٹھایا گیا ہے۔ اسی طرح اہلحدیث اور اہل تشیع کی جماعتوں میں ان کی اولاد کو قیادت سونپی گئی ہے۔

سیاسی اور جمہوری جماعتوں کا حال بھی مختلف نہیں ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی بھٹو خاندان کی جماعت سمجھی جاتی ہے۔ کوئی غیر بھٹو پیپلز پارٹی کا سربراہ ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اگرچہ محترمہ بے نظیر نے اپنی سیاسی جدوجہد اور جاں گسل محنت سے اپنے آپ کو اس مقام کا حق دار ثابت کیا ہے۔ مگر پیپلز پارٹی کو بھٹو کی پارٹی ہی کہا جاتا ہے۔ سرحد میں تحریک آزادی میں نمایاں کردار کرنے والی پارٹی، باچا خان سے لے کر ان کے پوتے اسفند یار ولی تک ایک ہی خاندان کی گود میں ہے۔ میں اسفند یار کا خود کو نہ صرف دوست سمجھتا ہوں بلکہ اُس کی سیاسی فراست کا بھی قائل ہوں۔

صرف جماعت اسلامی، مسلم لیگ کے بعد ایک ایسی جماعت ہے جس کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے بیٹوں میں سے کسی کو اپنا جانشین نہیں بنایا اور آئندہ بھی کوئی ایسے آثار نہیں کہ جماعت اسلامی میں موروثیت جگہ پا سکے۔

گزشتہ چھ سو سال کی بات ہے، چنگیز خان اور کولمبس، دو ایسی ہستیاں پیدا ہوئیں۔ جنہوں نے دنیا کی نہ صرف تاریخ بدلی بلکہ جغرافیہ بھی بدل ڈالا۔ ان دو افراد کے چھوڑے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوئے نقوش انمٹ ہیں۔ میں نے کہیں پڑھا تھا اب تک چنگیز خان اور کولمبس کی قبروں کی تلاش جاری ہے مگر تا دمِ تحریر دونوں کا مدفن مل نہیں سکا۔ جس نے امریکہ دریافت کیا اس کی قبر دریافت نہیں ہو سکی اور جس نے پوری دنیا کو اپنے پاؤں تلے رونددیا اس کی روندی ہوئی لاش کا نام و نشان بھی نہیں مل رہا۔ کولمبس کے وارث آج کس حال میں ہیں؟ اور چنگیز کے وارث کہاں کے حکمران ہیں؟۔

آپ میری اُس جائیداد کی وارث ضرور ہیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے آپ کو بطور حق دی ہے، لیکن میری سوچ کی نہیں۔ سوچ کی وارث تب ہی بن سکیں گی، جب جدوجہد کو زندگی کا مقصد بنالیں گی۔

مجھے یہ معلوم کر کے دکھ ہوا کہ تم نے سپریم کورٹ کے رویئے سے مایوس ہو کر اپنے آپ کو کمرے تک محدود کر لیا ہے۔ اپنی جماعت کے ساتھیوں کے رویئے سے تمہارا دلبرداشتہ ہونا بھی مجھے پسند نہیں آیا، تمہارا پریشان حال ہونا بھی اچھا نہیں لگا۔ میں کسی کے کردار کی معمولی خامیوں سے تو درگزر کر سکتا ہوں مگر موقف کی کمزوری ناقابل برداشت ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میری ساڑھے چار سال کی قید نے آپ کو ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبا دیا ہے۔ آپ نے جس صبر اور حوصلے سے یہ تکلیفیں برداشت کیں اُن کی وجہ سے میں نے خندہ پیشانی سے جیل کاٹ لی۔ اگر آپ نے تکلیفوں کو اپنے سر پر سوار کر لیا تو میری قید تکلیف دہ ہو جائے گی۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم میرے بارے میں زیادہ پریشان ہو گئی ہو مگر اس کا اثر یہ ہوا ہے کہ میری راتیں تمہاری بیماری کی وجہ سے بے خواب ہو گئی ہیں۔ اگر حالات سازگار ملتے جائیں تو کامیابیاں ضرور حاصل ہوتی ہیں مگر صلاحیتیں بیدار نہیں ہوتیں۔ جب کوئی مشکل ترین حالات میں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرتا ہے دراصل تو وہی حاصل زندگی ہوتا ہے۔ سازگار حالات میں ہر کوئی کامیاب و کامران ہوتا ہے۔ زندگی کا مزہ تو اس میں ہے کہ آدمی عزم، حوصلے اور کردار کی پختگی سے مشکلات کی چوٹی سر کرے۔

میرے والد صاحب مجھے کہا کرتے تھے، بڑا بننے کا شوق ہے تو پہلے روڑی (کوڑا کرکٹ پھینکنے کی جگہ) بنو۔ تاکہ ہر کوئی اپنی ناکامیوں کو آپ کے سر ڈال دے اور اپنے غم و

www.iqbalkalmati.blogspot.com

غصہ کا غبار بھی آپ پر نکال سکے، اپنے دکھوں اور تکلیفوں کا ذمہ دار بھی آپ کو قرار دے، آپ ان ساری باتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کریں، اور ان کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھیں، بدخوئی سے بچیں، اگر آپ یہ کر سکتے ہیں۔ تو آپ بڑے ہیں، اگر یہ نہیں کر سکتے تو بڑا بننے کا مہنگا شوق مت پالیں۔ تمہیں تو قدرت نے بڑا پیدا کیا ہے۔ اپنے سے چھوٹوں کی ذمہ داریوں کا بوجھ آپ نے اٹھانا ہے۔ تکلیف میں مسکرانا، بلند حوصلہ لوگوں کا کام ہے۔

والسلام!

تمہارا والد

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تہذیبوں کی ناکامی اور نوشتۂ دیوار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

5 جون 2006ء

میمونہ بی بی!

السلام علیکم

آج شمالی کوریا نے بلیسٹک میزائل کا تجربہ کیا۔ کوریا کا دعویٰ ہے کہ امریکہ بھی اس میزائل کی زد میں آ گیا ہے۔ اس دعوے میں کتنی صداقت ہے؟ یہ تو وقت بتائے گا، مگر بین الاقوامی ردعمل سے دھماکے کی شدت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

امریکہ کو دریافت ہوئے پانچ سو سال کا عرصہ ہوا ہے۔ اس کو آزاد ہوئے دو سو سال ہو گئے ہیں۔ دنیا کے سیاسی نقشے پر اس کی اہمیت پہلی جنگ عظیم کے بعد ابھر کر آئی۔ دوسری جنگ عظیم میں اسے فیصلہ کن حیثیت حاصل ہو گئی۔ بیسویں صدی کے خاتمے پر امریکہ واحد عالمی طاقت کے طور پر اپنے آپ کو منوا چکا تھا۔ اکیسویں صدی کا آغاز بھی امریکی بالادستی سے ہوا۔

گزشتہ پانچ سو سال سے سفید فام اقوام کی گرفت دنیا کے معاملات پر انتہائی مضبوط تھی۔ ان اقوام نے اپنے علم، اپنی محنت اور اپنی جرأت سے تمام تہذیبوں کو زیر نگیں کر لیا۔ تجربے کی دولت سے مالا مال ہو کر ان اقوام نے دنیا کو زیر و زبر کر دیا۔ ان کے مقابل آنے کی کسی میں سکت نہیں تھی۔ چونکہ مغربی تہذیب کا دامن نظریے سے خالی تھا، لہٰذا ان کا باہمی ٹکراؤ نوشتۂ دیوار تھا۔ لوگوں کو غلام بنانے اور نوآبادیات پر قبضے کی خواہش نے انہیں دنیا کے بڑے قبضہ گروپوں میں تقسیم کر دیا۔ انہیں اپنی پیداوار کی فروخت کے لئے منڈیاں درکار تھیں، جہاں پر وہ مصنوعات کو منہ مانگے داموں بیچ سکیں اور اپنی رعایا کی جبری محنت کو سستے داموں خرید سکیں۔ غلاموں کی بہتر کارکردگی کے لئے انہوں نے جو نظام بنایا اور جو تعلیمی نظام دیا، وہ بھی استحصالی تھا۔ اس نظام کے خلاف چلنے والی تمام تحریکیں دم توڑ گئیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور سفید فام قومیں بلا شرکت غیرے کرہ ارض پر چھا گئیں۔

یورپ، جو پانچ سو سال پہلے تاریک دور (Dark Ages) میں رہ رہا تھا، اب اس کی چکا چوند سے آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔ قرطبہ کے مسلمانوں کے مدرسہ سے فارغ التحصیل طالب علم نے آکسفورڈ کے دینی مدرسے کی بنیاد رکھی جو آج دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹیوں میں سے ایک ہے۔

یورپی اقوام کو بندوق سے گولی چلانا آیا تو انہوں نے پوری دنیا کو علمی طاقت، اور اسلحے کی طاقت سے لیس ہو کر اپنی مرضی سے چلانا شروع کر دیا۔ ممالک محروسہ کی آمدنی سے یورپ کے پژمردہ چہرے پر رونق آ گئی۔ نت نئی ایجادات ہونے لگیں۔ مادی ترقی نے یورپ کو لامحدود کامیابیوں سے ہمکنار کیا۔ اہل یورپ نے خطہ ارضی پر موجود علوم کو یکجا کیا اور تحقیق کے بند دروازے کھول دیئے۔ بجلی، ٹیلی فون، ریل اور جہاز نے انسان کو پر لگا دیئے۔ اب وہ چاند اور ستاروں پر کامیابی سے اپنے جھنڈے گاڑ رہا ہے۔ ان کامیابیوں نے انسان کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔ اس کے اندر غربت اور بیماری کے خلاف جنگ لڑنے کی سکت آئی، انسانوں کی زندگی بہتر ہو گئی۔

انقلاب فرانس ایک ایسا بڑا واقعہ تھا جس نے یورپ کی سوچ کے دھارے تبدیل کر دیئے۔ یقیناً اس کے پیچھے اس وقت کے فلسفیوں کی سوچ کارفرما تھی سوچ کی تبدیلی سے یورپ کے عام آدمی کے گلے سے غلامی کا طوق اترنے لگا تو یورپ کے حکمرانوں نے انہیں نسلی تفاخر کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ اسی وجہ سے پہلی جنگ عظیم جیسا سانحہ پیش آیا۔ یورپ کے حکمرانوں کی توسیع پسندی کی ہوس نے انہیں ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا اپنے آپ کو تہذیب یافتہ کہنے والوں نے انسانی لاشوں کے انبار لگا دیئے، ان کے سامنے چنگیز اور ہلاکو کے مظالم بھی ہیچ نظر آنے لگے۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی اس خواہش کے بطن سے دوسری جنگ عظیم نے جنم لیا۔

ان دو ہولناک جنگوں کے بعد امریکہ اور یورپ نے مل کر ایک نئی بساط بچھائی۔ وقت کے ساتھ ساتھ، روس اور امریکہ کی اہمیت باقی یورپی اقوام سے بڑھ گئی۔ دنیا کو اس طرح

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تقسیم کیا گیا کہ کوئی ملک بھی اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے قابل نہ رہا۔ ہر قوم امریکہ یا روس کی دست نگر ہو گئی۔ امریکہ نے آزاد دنیا کا راہنما بن کر اپنا اثر و رسوخ بڑھایا اور روس نے انقلاب کے نام پر دنیا کو اپنا محکوم بنالیا۔ یورپ کے دوسرے ممالک صدیوں کی لوٹی ہوئی دولت پر اکتفا کر گئے باقی دنیا کے ملک بظاہر آزاد کر دیئے گئے مگر ان کی معیشت غلامی کی زنجیروں سے آزاد نہ ہو سکی۔

آج لاطینی امریکہ پر نظر ڈالیں یا افریقہ، مشرق وسطیٰ، وسط ایشیاء، جنوبی ایشیاء، یا مشرق بعید پر، قومیں ایک دوسرے سے دست و گریبان ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شمالی کوریا، جنوبی کوریا اور جاپان کی کشیدگی کا اسلام سے کیا تعلق ہے؟ ویت نام اور کمبوڈیا، تائیوان اور چین کے درمیان اختلاف کے بیج کس نے بوئے؟ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشمیر کی تلوار کس نے رکھی؟ افغانستان اور ایران، کویت اور عراق میں مسائل کس نے پیدا کیے؟ اسرائیل کا قیام کون عمل میں لایا؟ افریقہ میں لاگوس، گنی بساؤ، نمیبیا، کینیا میں کون سی اسلامی تحریک چل رہی ہے؟ لاطینی امریکہ میں وینز ویلا، چلی، کیوبا، برازیل میں کون سا اسلامی انقلاب آرہا ہے؟ کیا وہاں کے غیر مقبول حکمرانوں کو مغربی طاقتوں، اور خاص طور پر امریکہ، نے مسلط نہیں کیا ہوا؟۔

امریکہ اور یورپ، اگر جمہوریت میں ایمان رکھتے ہیں تو وہ پاکستان میں فوجی حکمرانوں کی حمایت کیوں کرتے ہیں؟ وہ نائجیریا میں انتخابی نتائج کو تسلیم کیوں نہیں کرتے؟ انہیں حماس کی جیت کیوں پریشان کر رہی ہے؟ یہ قومیں جمہوریت اپنے لئے پسند کرتی ہیں، یہ آزاد معیشت کا نعرہ بھی اپنے لئے پسند کرتے ہیں، دوسرے ممالک کی درآمدات پر کوٹا سسٹم نافذ کر کے معیشت کو پابند کر دیتے ہیں۔ اب وہ اپنے ممالک میں کام کرنے والے مسلمانوں کو پابندیوں میں جکڑ رہے ہیں۔ نوبت یہاں تک آ گئی ہے کہ محمد، احمد یا محمود نام والے افراد کو اپنی کمائی گھر بھیجنے میں بھی رکاوٹوں کا سامنا ہے۔ آزاد معیشت اور آزاد دنیا کے نعرے دم توڑ رہے ہیں۔ جب تک روس میدان میں موجود تھا، مغربی تہذیب کے داغ دھبے چھپے ہوئے تھے۔ انہیں روس کے مقابلے میں آزاد معاشرے کا راہنما ہونے کا اعزاز

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حاصل تھا۔مگراب ان کی خامیاں ظاہر ہونے لگی ہیں۔

دنیا کو تقسیم کرتے وقت امریکہ اور مغربی اقوام نے انتہائی سوچ بچار سے اپنے مفادات کا تحفظ کرلیا تھا۔مگرانہیں اندازہ نہیں تھا کہ قدرت کے پاس اس نظام کو کنٹرول میں رکھنے کے لئے کئی ظاہری اور خوابیدہ طاقتیں ہیں۔جس کا ادراک انسانی ذہن نہیں کرسکتا۔ جو نئے عوامل ظاہر ہوئے ہیں،انہوں نے طاقت کا توازن بگاڑ کرر کھ دیا ہے۔کسے معلوم تھا کہ گزشتہ صدی کے آخرتک روس،کرغزستان،صحرائے گوبی،افغانستان،ایران،پاکستان، سعودی عرب، وینزویلا، نائیجریا، انڈونیشاء،عراق، آذربائیجان، تاجکستان، ابوظہبی، کویت ، ازبکستان، تاتارستان کے تیل اور گیس کے ذخائر امریکہ اور یورپی اقوام کے کنٹرول میں نہیں رہیں گے،اوراس کے حصول کے لئے جنگیں لڑنا پڑیں گی،اوران جنگوں کودہشت گردی کا نام دینا پڑے گا۔انہیں آزاد معیشت کا نعرہ لگاتے ہوئے اندازہ نہیں تھا کہ چین، بھارت، ملائیشیاء، برازیل سستی اشیاء پیدا کر کے انہیں عالمی تجارت میں بے دست و پا کردیں گے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ امریکہ اور مغربی اقوام جمہوریت میں یقین رکھتی ہیں نہ آزاد معیشت میں اور نہ سول سوسائٹی کی بالادستی میں۔وقت نے ان کے چہروں سے نقاب اٹھا دیا ہے۔مغربی تہذیب ایک استحصالی قوت تھی، اب اس کی بنیادیں ہل گئی ہیں۔مغربی ممالک کی تیز رفتار ترقی نے پوری دنیا کے ماحولیات کوخراب کردیا ہے۔ان کے صنعتی اور ایٹمی فضلے نے اوزون کی تہوں میں سوراخ کر دیا ہے۔دنیا میں Poliution پھیلانے والے ممالک میں ستر فیصد حصہ ان ممالک کا ہے۔جس کی وجہ سے نئی نئی بیماریاں انسانوں کی ہلاکت کا باعث بن رہی ہیں۔

پانچ سو سال کی یلغار کا ڈراپ سین ہونے والا ہے۔بے مقصدیت نے یورپ اور مغربی تہذیب کو دیمک کی طرح چاٹ لیا ہے۔وہ صرف اپنی ذات کے لئے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔تمام رشتے دم توڑ چکے ہیں۔ترجیحات میں سب سے پہلے بھی ان کی ذات ہے اور سب سے آخر میں بھی ان کی ذات۔خاندان، ملک، معاشرہ، انسان یہ سب ترجیحات

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خلط ملط ہو چکی ہیں۔ جس معاشرے میں ماں بچے کو بوجھ سمجھے اور باپ اس کا باپ ہونے سے انکار کردے وہ معاشرہ بانجھ ہو جاتا ہے۔ اقبال نے اسی دن کے لئے کہا تھا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

یہ کیسے ممکن ہے کہ پورے ماحول میں گندگی پھیلا دی جائے اور اپنے گھر میں پھول اگا کر کہا جائے کہ آپ صاف و شفاف ماحول میں رہتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ دنیا میں جمہوریت کو کامیاب نہ ہونے دیں، اور اپنی جمہوریت پر فخر کریں۔ دنیا کی غلط تقسیم کی وجہ سے جنگیں ہوتی رہیں اور کمزور ممالک غیر محفوظ ہو کر اپنے دفاع کے لئے ان سے ہتھیار خریدیں۔ ہندوستان بھی دفاع کے لئے امریکہ کی تجوریاں بھرے اور پاکستان بھی، اسرائیل کو مضبوط کریں اور سعودی عرب کو دفاع کے نام پر لوٹیں۔ چین کے دروازے پر تائیوان میں ہتھیاروں کا ڈھیر لگا دیں، شمالی کوریا کا سامنا کرنے کے لئے جنوبی کوریا کی معیشت پر ہتھیاروں کا بوجھ لاد یں، خطہ ارضی کو جنگ کے دہانے پر لا کر اگر امریکہ اور یورپ یہ سمجھتے ہیں کہ تیسری جنگ ایشیاء میں لڑی جائے گی یا لاطینی امریکہ اور افریقہ اس جنگ کا ایندھن بنیں گے تو یہ ان کی بھول ہے۔ یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ اب ان ممالک کے عوام کا اتحاد استحصالی قوتوں کا مقابلہ کرے گا۔ طلوع صبح کے آثار پیدا ہو چکے ہیں۔ متوسط طبقوں میں اتنی قوت آ گئی ہے کہ وہ اپنی قیادت پیدا کر سکیں۔ ایران سے احمدی نژاد نے طبل جنگ بجا دیا ہے۔ یورپ کو فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ نئی ابھرنے والی قوت کا ساتھ دے کر اپنی معیشت اور معاشرت کو محفوظ کرتا ہے یا ٹکراؤ کی صورت اختیار کر کے دنیا کے امن کو تباہ کرنے کے عاقبت نا اندیشانہ فیصلوں کے آگے سر تسلیم خم کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں یورپی اقوام جنگ کی تباہ کاریوں کا سامنا نہیں کرنا چاہتیں۔ چونکہ امریکہ کو بیرونی حملوں کا کبھی سامنا نہیں کرنا پڑا اس لئے امریکی قیادت کے اندر اس احساس کی اتنی شدت نہیں ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں پرل ہاربر پر جاپانی حملہ اور اب ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی، دو ایسے واقعات ہیں، جس کے تناظر میں امریکی قوم کو ساری دنیا سے لڑانے کی تیاری کی جا رہی

ہے۔ اگر عالمی برادری کے متفقہ فیصلوں کو قبول نہ کیا گیا تو طاقت ور ترین تہذیبوں کا سراغ لگانے کے لئے بھی آثار قدیمہ کے ماہرین کے فیصلوں کا انتظار کرنا پڑے گا۔

غیر منصفانہ معاشی تقسیم کی وجہ سے تیسری دنیا غربت، بیماری اور جہالت کے سمندر میں ڈبکیاں کھارہی ہے۔ ستر فیصد قدرتی وسائل کے مالک عوام قرضوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ یورپ اور امریکہ کی صنعت کا پہیہ چلانے کے لئے تارکین وطن کی محنت بنیادی عامل کا کردار ادا کررہی ہے۔ اتنی غیر متوازن معیشت کب تک زندہ رہ سکتی ہے؟ مغرب پچھلے پچاس سال میں کوئی مدبر پیدا نہیں کرسکا جو ان حقائق کو سمجھ کر وسائل کی تقسیم کا کوئی فارمولا پیش کرسکے، چھینا جھپٹی سے یہ معیشت کب تک چلتی رہے گی؟۔

تازہ ترین اہم پیش رفت یہ ہوئی ہے کہ ''مقبوضہ'' تیسری دنیا اب دوسری دنیا بن گئی ہے۔ اب ان میں مناقشہ کی جگہ مفاہمت کو اہمیت حاصل ہورہی ہے۔ پاکستان ہندوستان، چین تائیوان مخالفت کے باوجود مل کر معاشی تعاون پر مبنی پروگرام بنارہے ہیں۔ اسی طرح جنوبی کوریا کی ہمدردیاں شمالی کوریا کے بھوک سے بلکتے ہوئے بچوں کے ساتھ ہیں۔ نفرت کی دیواریں گررہی ہیں۔ وینزویلا کا شاویز، جنوبی افریقہ کا نیلسن منڈیلا اور ایران کا احمدی نژاد لبنان کا حسن نصر اللہ اور معاؤ دیشو کی قیادتیں ایک صف میں کھڑی نظر آتی ہیں۔ تیسری دنیا کی معیشت اتنی تیزی سے ترقی کررہی ہے کہ اگر اعتماد کی فضا پیدا ہوجائے تو مغرب کی ایجادات پر انحصار کرنے کی ضرورت بھی باقی نہیں رہے گی۔ مغرب کی پیداواری لاگت اسے آزاد مارکیٹ ''اکانومی'' میں سستی اشیاء کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں چھوڑے گی۔ مغربی اقوام کو پہلے ہی بیروزگاری کا سامنا ہے۔ اگر معاشی مقاطعوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تو ایسی کساد بازاری پیدا ہوسکتی ہے جس کا مغربی اقوام نے کبھی تصور بھی نہ کیا ہوگا۔ مغرب کی معیشت کا آخری سہارا ہتھیاروں کی فروخت ہے۔ جب تیسری دنیا کی اقوام بالغ نظری سے اپنے اختلافات ختم کردیں گی تو مغرب کا یہ سہارا بھی چھن جائے گا۔

پانچ سو سال کے بعد تاریخ کروٹ لے رہی ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا اس عمل میں تیزی آتی جائے گی۔ اگر ایسا ہوا تو یہ پہلی مرتبہ نہیں ہورہا ہوگا۔ مگر جو بات پہلی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مرتب ہو رہی ہے وہ زیادہ خوفناک ہے۔ وہ بات یہ ہے کہ گزشتہ پانچ صدیوں میں جن لوگوں کے پاس کرہ ارضی کو چلانے کا اختیار تھا، انھوں نے ایک ایک جنگ میں لاکھوں انسان مارے ایسے مہلک ہتھیار تیار کیے جن کے استعمال سے بڑے بڑے شہر صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ اب یہ خدشات حقیقت کا روپ دھار رہے ہیں کہ سمندر زمین پر چڑھ دوڑیں گے، پہاڑوں سے پانی کی آمد ختم ہو جائے گی، اوزون میں سوراخ ہونے سے ہوائیں زہر آلود ہو جائیں گی، آکسیجن کی مقدار میں کمی ہو جائے گی اور اگر، خدانخواستہ، ایٹمی جنگ چھڑ گئی تو میزائلوں، ایٹموں کے ٹکراؤ سے کوئی ذی روح سطح زمین پر باقی نہیں رہے گا۔

خطۂ ارضی کو اتنے خطرات سے دوچار کر دینے والی تہذیب نہ صرف خود مٹ جائے گی بلکہ پورے انسانی تمدن کو مٹا کر رکھ دے گی۔ تہذیبوں کے ٹکراؤ کا نظریہ پیش کرنے والے پہلے اِسی تہذیبی ورثہ سے چھٹکارا حاصل کر لیں جو بنی نوع انسان کو ہمیشہ کے لئے صفحۂ ہستی سے مٹانے پر تلا ہوا ہے۔ اس خطرے سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ دنیا کی قیادت اب ان خطرناک لوگوں سے لے کر ذمہ دار لوگوں اور قوموں کو دے دی جائے، جو انسانیت سے پیار کرنے والی ہوں۔ فطری طور پر وہی قومیں انسانیت کو بچا سکتی ہیں جو انسان کی عظمت اور برابری میں یقین رکھتی ہیں۔ تبدیلی کا یہ عمل تیزی سے جاری ہے۔ اس کے راستے میں جو رکاوٹیں یا دشواریاں آئیں گی وہ خود بخود دور ہوتی جائیں گی۔

والسلام!

تمہارا والد!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پیرانِ حرم موجود ہیں۔علامہ اقبال نے شاید اسی طرف اشارہ کیا تھا۔

نذرانہ نہیں سود ہے پیرانِ حرم کا
ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن

جس طرح آج پاکستان کا جغرافیہ پاکستان کا سب سے بڑا اثاثہ ہے۔اسی طرح ملتان بھی اپنے محل وقوع کی وجہ سے اس خطہ کا ہمیشہ زندہ رہنے والا شہر بن گیا۔صحرائے تھل اور صحرائے راجپوتانہ، ملتان کے مغربی اور مشرقی دروازوں کے قریب آکر مل جاتے ہیں اور ملتان شہر کے دفاع میں اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں۔حملہ آوروں کو ہزاروں میل ریگستان کو عبور کر کے اسے فتح کرنا آسان نہ تھا۔شہر کی مشرقی فصیل کے ساتھ دریائے اروتی جسے دریائے راوی کہتے ہیں، بہتا تھا اور مغربی سمت میں دریائے چناب، صحرائے تھل اور صحرائے راجپوتانہ کے درمیان، حد فاصل تھا۔دونوں اطراف کے دریا اور صحرا ملتان کے لئے بہت بڑی دفاعی حیثیت کے حامل تھے۔

انہی صحراوؤں میں گھا گھرا، بیاس اور سرسوتی جیسے دریا گم ہو گئے۔دریاؤں کے باپ (اباسین) سندھ کو جب اس صحراء کو عبور کرنا پڑا تو اس نے اکلاپے کے خوف سے، جہلم، چناب، راوی اور ستلج کے پانی کو اپنا ہمسفر بنایا۔پھر کہیں جا کر وہ سمندر سے ملاپ کر سکا۔

ملتان، صدیوں تک سندھ کا دار الحکومت رہا۔اس وقت ملک کی سرحدیں شمال میں جہلم اور کلر کہار کی پہاڑیوں پر جا کر ختم ہوتی تھیں۔اور وہاں سے کشمیر کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔کشمیر کے تاریخی رشتے ہندوستان سے نہیں تھے بلکہ وہ چین سنٹرل ایشیاء اور ایران سے زیادہ قریب تھا وہ ایشاء کو چک کہلاتا تھا۔عربوں سے اس کا رابطہ بذریعہ دریائے سندھ ہوتا تھا۔

یونانیوں نے پہلی مرتبہ ملتان اور کشمیر کے درمیانی علاقے کو پانشا پوتانیہ، یعنی پانچ دریاؤں کی سرزمین کہا۔اور بعد میں یہی نام فارسی کے لفظ پنج آب (پنجاب) کے نام سے مشہور ہوا۔پنجاب، یعنی پانچ پانی۔اسی طرح یونانیوں کے دریائے سندھ کو انڈس کہنے کی وجہ سے دریا کے پار کے علاقے کو انڈیا کہا گیا اور وہاں رہنے والوں کو انڈو کہا گیا جو بگڑ کر ہندو ہو گیا اور اہل فارس نے اسے ہندوستان کہنا شروع کر دیا۔ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جناب پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب تلاش ہند (Discovery of India) میں کہا ہے کہ ہندو کوئی مذہب نہیں ہے، مگر وقت کے ساتھ ساتھ ایک خاص فکر کو ہندو مذہب کے نام سے مخصوص کر دیا گیا۔

اس مختصر سی تحریر میں سارے پس منظر کو بیان کرنا ممکن نہیں۔ اس لئے میں چند بنیادی باتوں پر بات ختم کر دوں گا۔ ملتان کی ہمسائیگی میں ایران کی عظیم تہذیب موجود تھی۔ اس کے اثرات کا ملتان تک پہنچنا ایک فطری امر تھا۔ جنوب سے محمد بن قاسم کی قیادت میں عربوں اور شمال مغرب سے محمود غزنوی کی آمد نے اسے اسلامی تہذیب کا مرکز بنا دیا۔ یہ ایک ایسا دارالخلافہ تھا جس کی قلمروں میں موہنجوداڑو، ہڑپہ، مائی گھا گھرا اور دریائے سرسوتی اور بیاس کے اردگرد کی تہذیبیں موجود تھیں۔ سلطان محمود غزنوی کے بیٹے مسعود نے لاہور کو پہلی مرتبہ پایہ تخت بنایا۔ داتا ہجویری رحمۃ اللہ اسی دور میں لاہور میں تشریف لائے۔ انہوں نے اپنی کتاب کشف المحجوب میں اپنا پتہ لکھا کہ میں لاہور میں رہتا ہوں۔ جو ملتان شہر کے مضافات میں ہے۔

مسلمان حکمرانوں نے دلی کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ اس کے باوجود ملتان کو خصوصی توجہ دی گئی کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ اگر شمال سے ان کا کوئی بھائی بند حملہ آور ہوا تو ملتان ہی اہمیت کا حامل ہوگا اس لئے مشہور ہو گیا جس کا ملتان مضبوط ہے اس کی حکمرانی ہندوستان پر مستحکم رہے گی۔ کہا جاتا تھا جس کا ملتان مضبوط ہے اسی کا ہندوستان مضبوط ہے۔

ملتان پر یونانیوں، ایرانیوں، عربوں، منگولوں اور ساسانیوں نے کئی حملے کیے۔ یہاں قرامطیوں نے بھی حکمرانی کی حملہ آور یہاں کی تہذیب کے نمونے اپنے ہاں لے گئے اور اپنی ثقافت کے نمونے یہاں چھوڑ گئے یہاں کا فن تعمیرات سنٹرل ایشاء اور سندھ کے علاقوں پر اثر انداز ہوا۔ تاج محل کی تعمیر کی جو فہرست شائع ہوئی ہے اس میں ایران سے لے کر تاشقند اور بخارا کے کاریگر موجود ہیں مگر سب سے زیادہ کاریگر ملتان سے تعلق رکھنے والے تھے۔

مغلوں کے دور میں ملتان کو خصوصی توجہ دی جاتی رہی۔ بادشاہ اپنے ولی عہد کو رموز

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سلطنت سیکھنے کے لیے ملتان بھیجتے تھے۔ جب مغل کمزور ہوئے تو ملتان میں پٹھانوں نے مسلمانوں کی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ جب سکھوں نے مغلوں سے بغاوت کر کے اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کیا تو انہیں سب سے زیادہ مزاحمت ملتان کی طرف سے ہوئی۔ یہ تاریخ کا دلچسپ پہلو ہے کہ سکھوں نے شمال مغرب میں نہ صرف پشاور پر حکومت قائم کی بلکہ کابل کو بھی فتح کر لیا۔ ہزارہ میں شہروں کے نام ہری پور اور مانسہرہ ان کے جرنیلوں ہری سنگھ اور مان سنگھ کے نام پر رکھ دیے گئے، مگر ملتان کے لئے انہیں ساٹھ سال تک جنگ لڑنا پڑی۔ 1760ء کے قریب پہلی جنگ ہیرا سنگھ کی قیادت میں لڑی گی ملتان کی فوجوں نے 1818ء تک سکھوں کا مقابلہ بڑی بے جگری سے کیا 1818ء میں راجہ رنجیت سنگھ نے ملتان پر قبضہ کر کے کامیابی حاصل کی۔ سکھوں کو اس لئے بھی ملتان کی فتح میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کہ لاہور کے جنوب میں ملتان تک سکھ آبادی نہ ہونے کے برابر تھی ان علاقوں میں صرف مسلمان رہتے تھے یا ہندو۔

ملتان کی اسلامی ریاست لاہور کے مضافات رائے ونڈ سے شروع ہو جاتی تھی دیپالپور کا علاقہ بھی اس میں شامل تھا شمال میں یہ ڈیرہ اسماعیل خان اور بنوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ آخری جنگ میں مظفر خان سدوزئی میدان جنگ میں شہید ہوئے۔ ان کے تیرہ بیٹے اور حافظ قرآن بیٹیاں بھی لڑتے ہوئے شہید ہوئیں۔ سکھوں نے وہاں کی ہندو آبادی کو اپنے ساتھ ملایا اور ملتان پر براہ راست حکومت کرنے کی بجائے ایک ہندو دیوان ساون مل کو وہاں کا حاکم (گورنر) بنایا۔ ساون مل کا دور امن کا دور تھا اس کی وفات پر سکھوں نے اس کے بیٹے مولراج کو حاکم ملتان مقرر کیا جس نے ظلم اور ناانصافی کی انتہا کر دی۔ اسے بعد میں قتل کر دیا گیا، اس طرح ستر 70 سالہ سکھوں کے دور کا مزہ بیس 20 سال تک ملتانیوں نے بھی چکھا۔ سکھ بہاولپور کی طرف پیش قدمی نہ کر سکے اور وہاں کی مسلمان ریاست سکھوں کے باغی مسلمانوں کے لئے جائے پناہ بن گئی۔

سکھوں نے انگریزوں سے پے در پے شکستیں کھائیں اور گجرات میں چیلیانوالے کے مقام پر انگریز کی بالادستی مکمل ہو گئی۔ ملتان بھی انگریزوں کی عملداری میں آ گیا۔ مگر ذہنی طور پر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہاں کے عوام انگریز کی غلامی قبول کرنے کو تیار نہیں تھے۔ لہٰذا 1857ء کی جنگ آزادی میں ملتان کے مسلمانوں اور ہندوؤں نے تخت دہلی سے وفاداری کے لئے بہادر شاہ ظفر کی حمایت میں بغاوت کر دی۔ ان کی منصوبہ بندی شاندار تھی مگر اپنوں کی جاسوسی اور غداری نے جنگ کا پانسا انگریزوں کے حق میں پلٹ دیا۔ ہزاروں لوگ شہید ہو گئے۔ کچھ انگریز بھی مارے گئے۔

سکھوں کے قبضے سے پہلے طوائف الملوکی کے دور میں ملتان اندرونی طور پر خود مختار ریاست تھی۔ سکھوں نے اسے اپنی قلمرو کا صوبہ بنا لیا۔ انگریز نے ملتان اور پشاور کو لاہور سے ملا کر اسے صوبہ پنجاب کے کنٹرول میں دے دیا۔ 1901ء میں پشاور کو دارالحکومت بنا کر صوبہ سرحد کو پنجاب سے الگ کر دیا گیا۔ لاہور اور ملتان کو ایک اکائی رہنے دیا گیا۔ جب نہری نظام آیا تو ملتان کو کالونی ایریا بنا کر لاہور اور امرتسر کے لوگوں کو وہاں آباد کیا گیا۔ ان آباد کاروں میں سکھ بھی کافی تعداد میں موجود تھے جو قیام پاکستان کے بعد وہاں سے مشرقی پنجاب چلے گئے۔ پاکستان بنا تو روہتک حصار، جالندھر، فیروز پور اور امرتسر کے لوگوں نے ملتان کی ثقافت کے رنگوں میں اضافہ کیا۔ یہ اس قدیم اور عظیم شہر کی خوش قسمتی ہے کہ وہاں پر ہر زمانہ میں زبان اور ثقافت کے رنگوں کی قوسِ قزح موجود رہی ہے۔ اس عمل کی وجہ سے وہاں کے صحراؤں اور موسموں کی تلخیاں بھی مٹھاس میں بدل جاتی ہیں۔ باہمی احترام کا منظر دیکھنا ہو تو قلعہ قاسم باغ اس کا مظہر ہے۔ قدیم مندر پر ہلاد اور حضرت بہاؤ الدین ذکریا کے مزار اور مسجد کی دیوار ایک ہے۔ مسلمانوں کے دور حکومت میں مسجد بنانے کے لئے ہندوؤں کے مذہبی مقام کے تقدس کو پامال نہیں کیا گیا۔ اب قلعہ پر روہتک و حصار کے رہنے والے لوگوں کے مرشد خانہ کے مرد جری حضرت مولانا حامد علی خان صاحب کے مزار کا اضافہ ملتان کی عظمت کا مظہر ہے۔ اسی جگہ ملتان پر حملہ کے دوران مارے جانے والے انگریزوں کی یادگار بھی ایستادہ ہے۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ ملتانیوں میں قوت برداشت کی کمی ہے؟

ملتان کو مدینۃ الاولیا کہتے ہیں۔ امیر خسرو نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ملتان جنت اعلیٰ کے برابر ہے۔ یہاں پر پاؤں سنبھال کر چلو کیوں کہ فرشتے قدم قدم پر سجدہ کر رہے ہیں۔

ملتان ما بجنت اعلیٰ برابر است

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آہستہ پا بنہ کہ ملک سجدہ می کنند

چین کے سیاح ہیون سانگ نے اسے تہذیبوں کا مرکز کہا۔ ابوریحان البیرونی یہاں علم کی پیاس بجھانے آیا۔ سعدی شیرازی کو اس شہر کی شیرینیاں کھینچ لائیں۔ سکندر اعظم کے جسم میں پیوست تیر نے فاتح عالم کی جان لے لی۔ ملتانی محنت کرنے والے ہیں۔ رکھ رکھاؤ ان کی زندگی میں رچا بسا ہوا ہے۔ یہ چرب زبان بھی ہیں اور تر دماغ بھی۔ یہاں پر پیدا ہونے والے احمد شاہ ابدالی نے دنیا کے خطے پر ایک نیا ملک بنایا، جس کا نام افغانستان ہے۔ ملتان کے ایک شاعر ارشد ملتانی نے ملتان کی ثقافت کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔

ڈھونڈے سے بھی نہ پاؤ گے ارشد جہان میں
خوئے وفا و مہر جو ملتانیوں میں ہے

جب سے انسانی تاریخ لکھنے کا رواج ہوا ہے، ملتان کا تذکرہ اس میں موجود ہے۔ صدیوں سے لوگ یہاں آ کر آباد ہو رہے ہیں۔ یہاں پر جنوبی ہندوستان کی ثقافت کے آثار بھی موجود ہیں۔ مشرقی پنجاب کے بھی اور افغانستان کے بھی۔ لکھنو اور دلی کی صاف اردو بولنے والے بھی اجنبیت محسوس نہیں کرتے، یہاں پر راجپوتوں کی روہتکی زبان کا رنگ بھی موجود ہے۔ تمام لہجوں میں گفتگو کر کے محظوظ ہوتا ہوں۔ جالندھری، ماجھے کی پنجابی، گجرات کی پنجابی، اس دھرتی کو اپنے اپنے رنگوں سے گل رنگ کرتی ہے۔

تمہارے خاندان سمیت 90 فیصد لوگ باہر سے آئے ہوئے ہیں۔ ہزاروں سال پرانے لوگ آٹے میں نمک کے برابر رہ گئے ہیں۔ باہر سے آنے والے آہستہ آہستہ مقامی ثقافت کا حصہ بن گئے ہیں ملتان کا دامن فراخ ہے۔ اس نے تمام جواہر پارے اپنے دامن میں بھر لیے ہیں۔ اسی لیے تو ہر مؤرخ نے ملتان کو تہذیبوں کا سنگم کہا ہے۔

والسلام!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آخری ملاقات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

23 جولائی 2006ء

السلام علیکم! مزاج بخیر

میں آج کل روزنامچہ لکھ رہا ہوں کنول کو ہم سے جدا ہوئے آج تیرہواں دن ہے وہ خیالات پر چھائی ہوئی ہے۔ آج کا دن یوں شروع ہوا۔

تالہ کھلا تو باہر باہر نکل کر صحن میں چلنا شروع کر دیا، ایک گھنٹہ واک کرتا رہا پھر آم کے درخت کے نیچے بیٹھ گیا جس کی وجہ سے شدید گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ نہ جانے آج نسیم سحر کہاں بھٹک گئی تھی۔ کافی دیر درخت کے نیچے گوتم بدھ کی طرح گم صم بیٹھا رہا۔ مشقتی نے چائے کی پیالی میز پر رکھی تو ''گیان دھیان'' کی محفل بغیر ''نروان'' کے برخاست کرنا پڑی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے براہِ راست خُلدِ بریں سے آنے لگے۔ ماحول خوشگوار ہو گیا۔

مَیں نے بلی کے بچے سے کھیلنا شروع کر دیا، کبھی پرندوں کے پیچھے بھاگتا، پلاٹ میں تھوڑا پانی جمع ہو گیا تو وہاں لاتعداد چڑیاں جمع ہو گئیں مَیں انہیں دیکھ کر بچوں کی طرح خوش ہو رہا تھا۔ کہتے ہیں جب کوئی بڑا ہو جائے تو بچوں کی سی حرکتیں کرتا ہے۔ کچھ لوگ بڑے ہوتے ہی اس لئے ہیں کہ بچے بن جائیں۔ اس طرح کی ایک صبح کو مَیں ایک خوبصورت تتلی کو دیکھ کر خوش ہو رہا تھا کہ ڈیوڑھی سے ملاقات کا سندیسہ آ گیا۔ اپریل کے آخری ہفتے کی بات ہے بتایا گیا کہ میری چھوٹی بہن زبیدہ اس کے میاں اقبال حسین شاہ ان کی نو بیاہتا بیٹی کنول اور دوسرے بہنوئی نذیر احمد شاہ جو اقبال حسین شاہ کے بڑے بھائی ہیں، ملاقات کے لئے آئیں ہیں۔ یہ دونوں بھائی میرے فسٹ کزن بھی ہیں۔ ان کی اچانک آمد سے مَیں پریشان ہو گیا۔ مَیں سوچنے لگا کنول کے میاں سلیم شاہ کا ساتھ نہ ہونا خطرے کی علامت ہے چونکہ کنول کو لاڈ پیار سے پالا گیا تھا۔ میرا خیال شادی کے بعد کی عمومی مشکلات کی طرف

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چلا گیا۔ سلیم شاہ اگرچہ میرا قریبی عزیز تھا اور شادی خاندان کے اندر ہوئی تھی پھر بھی مَیں پریشان ہو گیا۔ مَیں تیار ہو کر ڈیوڑھی پہنچا۔ کنول اپنے گھر والے کے ساتھ اسی جگہ بیٹھی تھی جہاں وہ شادی کے تیسرے دِن اپنے میاں کے ساتھ مجھے ملنے آئے تھی۔ اس روز وہ خاموش بیٹھی رہی مگر بہت بااعتماد لگ رہی تھی۔ مَیں نے اسے اور سلیم شاہ کو چھوٹے چھوٹے تحفے اور ڈھیر ساری دعائیں دیں۔ اس نے جاتے ہوئے صرف اتنا کہا! ماموں آپ کی کتاب کب مکمل ہو رہی ہے۔

آج کی ملاقات میں انتظار کر رہا تھا کہ اب یہ کسی ناخوشگوار واقعے کا ذکر کریں گے لیکن انہوں نے معمول کی باتیں شروع کر دیں۔ مَیں کن انکھیوں سے کنول کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ وہاں کوئی اضطراب نہ تھا، وہ وقار اور تمکنت سے خاموش بیٹھی تھی، مجھے ہمیشہ اس میں اپنی والدہ کی جھلک نظر آتی تھی۔ اس کی منگنی اور شادی کی تاریخ کے مراحل یہیں بیٹھ کر طے ہوئے تھے۔ اُس وقت وہ فرمانبردار بیوی کے روپ میں یہاں موجود تھی۔ مجھ سے رہا نہ گیا، میں نے اس سے پوچھ لیا کہ سلیم کیوں نہیں آیا؟ وہ کہنے لگی! انہیں ڈیوٹی پر جانا پڑ گیا، ہم دوبارہ اکٹھے آئیں گے، میری جان میں جان آگئی پھر اس نے اپنے سسرال والوں کے نام لے کر ان کی نیک خواہشات مجھ تک پہنچائیں۔ یہ میری اس سے آخری ملاقات تھی۔

میں واپس لوٹ آیا تو ڈیلیئے کے پھولوں کے پاس کھڑا ہو گیا میری نگاہیں تتلی کی تلاش میں تھیں وہ مجھے پھول پر نظر نہ آئی۔ میں نے زمین کی طرف دیکھا تو اس کے پروں میں حرکت نہ تھی، چیونٹیاں اس کی لاش کی طرف رواں دواں تھیں۔ اس دن کا منظر میرے سامنے ہے، ڈیلیا کا پودا گرم ہوا کا ایک جھونکا برداشت نہ کر سکا۔ اپریل کے ختم ہوتے ہی اس نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا مگر اس تتلی کی زندگی اور موت کا سفر میری یادوں میں اب بھی محفوظ ہے۔

دس بجے سے ایک بجے تک مطالعہ کیا، ایک بجے کھانا کھایا اور سو گیا، تین بجے جاگا تو باہر امرت رس کی بوندوں نے سماں باندھا ہوا تھا۔ خشک ٹہنیوں میں زندگی کی ایک لہر نظر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آنے لگی۔ شام تک خوب بارش ہوئی۔ صیاد نے صحن میں آ کر چابیوں کے گچھے کو ہلایا تو میں تربیت یافتہ پرندے کی طرح اپنے قفس کی طرف چل پڑا۔ میری محدود سی آزادی شورِ سلاسل میں دب گئی۔

کمرے کے اندر کے معمولات شروع ہو گئے، کھانا گرم کرنا، خبریں سننا، کتابیں پڑھنا، گردشِ حالات کا نوحہ اور پھر خوابِ استراحت۔ مگر آج میرے جاگتے خوابوں پر کنول کا چہرہ چھایا ہوا تھا، اس کے بچپن کا چہرہ، ایک ننھی پری کا چہرہ، ہر وقت متحرک رہنے والی تتلی کا چہرہ۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پہلا قدم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

24 جولائی 2006ء

میمونہ بی بی! مزاج بخیر!

آج صبح سے ساون رت کی رم جھم نے سماں باندھا ہوا ہے۔ بادشمالی جسم سے مس کرتی ہے تو روح کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔ مگر میری زندگی کے صحرا میں بگولوں کا رقص جاری ہے۔

میں کھڑکی سے آم کے درخت کے پتوں سے پانی کی بوندوں کو گرتے دیکھ رہا تھا کہ اچانک یوں لگا یہ پانی کی بوندیں نہیں بلکہ لبنان اور اسرائیل کے بچوں کے جسم سے رستا ہوا لہو ہے۔ کوئی اگر اسے زلف یار سے ٹپکنے والے پانی سے تشبیہ دے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ میری آنکھیں تو گدھا گاڑی میں بیٹھے بچے کے گدھے پر برسنے والے چابک سے سیل رواں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ بنی اسرائیل کے خون سے دیدہ یعقوب کیوں نہ بنتیں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ میں بھی عجیب آدمی ہوں، جیل خانے کی ایک کال کوٹھڑی میں پڑے سارے زمانے کے غموں کو خوشیوں میں بدلتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ چڑیا سے بھی چھوٹے پرندے کو مولہ کہتے ہیں، یہ رات کو سوتے ہوئے ٹانگیں آسمان کی طرف کر لیتا ہے۔ بڑے کہتے تھے وہ سمجھتا ہے اگر آسمان گر گیا تو وہ اسے اپنی ٹانگوں پر روک لے گا۔ ہم کیا ہماری اوقات کیا؟ مگر علامہ اقبال بھی بڑے مزے کی چیز ہیں۔ وہ اسی مولے کو شہباز سے لڑانا چاہتے ہیں۔ انہیں اس بات کی فکر نہیں کہ باز کا مقابلہ پدی کرے گی تو نتیجہ کیا ہو گا۔ وہ تو بس یہ چاہتے ہیں کہ شہباز کو چیلنج کرنے والا کوئی تو ہو۔ ان کی زندگی میں اسے سب سے زیادہ پسند آنے والا پرندہ باز تھا مگر وہ نہیں چاہتے کہ فضاؤں پر اس کی حکمرانی بھی بلا شرکت غیرے ہو۔

لبنان کی جنگ نے دنیا کو حیران کر دیا ہے۔ ایک طرف دنیا کی جدید ترین ٹیکنالوجی سے لیس سریع الحرکت فوج ہے تو دوسری طرف حزب اللہ کے چند سر پھرے۔ لبنان دنیا کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایسا ملک ہے جس کی کوئی باقاعدہ فوج نہیں۔ اسرائیل کی پشت پر دنیا بھر کا یہودی میڈیا ہے، جب کہ حزب اللہ کی ترجمانی لبنان کی حکومت بھی کھل کر نہیں کرتی۔ ہاتھی کا مقابلہ چیونٹی سے ہے۔ زمانہ پھر ابابیل سے ہاتھی والے کا غرور خاک میں ملتے دیکھ رہا ہے۔ پانسہ پلٹ چکا ہے۔ جنگ کی آگ بھڑکانے والوں کا اپنا دامن زد میں ہے۔ کون کہتا ہے کہ یہ معجزوں کا زمانہ نہیں۔ یقین کامل ہو تو آگ کو گلزار میں بدلتے دیر نہیں لگتی۔

آنگن کے گلابوں اور دل میں پھوٹنے والے شگوفوں کا حال یکساں ہے۔ بارش کے ہوتے ہی گلاب کی پتیوں کا رنگ میرے خونِ شہیداں کی طرح دمکنے لگا ہے۔ معلوم ہوتا ہے لعل بدخشاں کی فصل اگ آئی ہے۔ چند روز پہلے کی کیفیت عجب تھی۔ جونہی کلی مسکرانے کی کوشش کرتی، سورج کی کرنیں اس کی مسکراہٹ اُچک لیتیں۔ دھوپ کی تمازت اس کا رنگ چاٹ لیتی۔ ایسے لگتا ہے کلی سورج کے خوف سے سہم کر سکڑ گئی ہے۔ یہ خوف کا سفر اسے موت کی وادی میں لے جاتا اور وہ رزق خاک ہو جاتی۔ پھول پیدا ہوتے ہی مرجھا جاتے، میں پودوں کو زیادہ سے زیادہ پانی دیتا۔ مگر نتیجہ پھولوں کی مرگ کے سوا کچھ نہ تھا۔ اچھے موسموں کی امید پر بڑی مشکل سے پتوں اور شاخوں کو بچا سکا۔ بارش کی بوندوں نے پودوں کو آب حیات پلا دیا۔ اب گلاب تازگی کا پیغام بن گیا ہے۔ دیواروں سے سبزے نے جھانکنا شروع کر دیا ہے۔ نئے شگوفے پھوٹ رہے ہیں۔ سورج کا غصہ بھی کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ چمن میں ایسی پتیاں بھی ہیں جن سے ہیرے کے جگر کو کاٹنے کا وقت آ گیا ہے۔ طبلِ جنگ زور سے بج رہا ہے۔ ساز کی دھنیں تیز ہو گئی ہیں۔

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے — لڑا دے ممولے کو شہباز سے

میمونہ بی بی! تم نے ہمت نہیں ہاری!! موسم گل تو دہلیز پر منتظر کھڑا ہے!!!۔

میں نے صحن چمن پر نظر دوڑائی تو نئے پرندوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کوئل کی کوک تو اکثر سنتا ہوں۔ چکور چکویاں، اگن پپیہے بھی بے تکلفی سے گھوم رہے ہیں۔ مگر کبھی جب موسم اچھا ہو تو ایسے خوبصورت پرندے بھی آ جاتے ہیں جو دوبارہ دیکھنے کو نہیں ملتے۔ ”دل کا موسم اچھا ہو تو ان ہونی بھی ہونی ہو جاتی ہے“۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں نے زندگی میں ایک چیز کا بار بار تجربہ کیا ہے اور اس میں مجھے کبھی ناکامی نہیں ہوتی۔ میرا یقین کامل ہے کہ اگر انسان کسی چیز کا ارادہ کر لے اور اس ارادے پر عمل کرنے کے لئے ایک قدم چل پڑے تو فضا میں ایک ایسی قوت موجود ہے جو اس کی ساتھی بن جاتی ہے اور دوسرا قدم اٹھانے کے لئے انسان کی مدد کرتی ہے۔ یہ قوت اللہ کی ذات ہے۔ تم اس بات کو اچھی طرح جانتی ہو کہ گھر کی معاشی حالت کیسی رہی ہے۔ تم بارہا اندیشوں اور پریشانیوں میں گھر جاتی ہو۔ میں نے تمہیں ہمیشہ یہی بتایا کہ اللہ تعالیٰ ضرور راستہ نکالے گا اور تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جس سال تم سمجھتی تھی کہ فاقوں کی نوبت آسکتی ہے، اس سال ہمیں اللہ نے سب سے زیادہ نوازا۔ تمہیں یاد ہے جب آمنہ اور سعدیہ کی شادی کے دن طے کیے تھے، شادی کے دعوتی کارڈ چھپوانے کے پیسے نہیں تھے، لیکن اس کی مہربانی سے وہ شادیاں انتہائی پروقار طریقے سے ہو گئیں۔ تین سال قبل میری گرفتاری کے بعد تم نے گھر میں کفایت شعاری کرتے ہوئے گوشت پکانے پر پابندی لگا دی۔ آج تین سال بعد غور کرو اللہ نے کتنی نعمتوں کی بارش کر دی ہے۔ تم نے اسی سال کتنی بیوہ اور بے سہارا عورتوں کی اپنے ہاتھ سے مدد کی ہے۔ کتنے لوگوں کو اپنے اداروں میں روزگار فراہم کیا ہے، کتنی بے سہارا بچیوں کی تعلیم کا بندوبست کیا ہے۔ تمہیں اللہ تعالیٰ کی بے پایاں عنایات پر اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

میمونہ بی بی یاد رکھو! یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ پہلا قدم تم خود اٹھاؤ پھر دیکھو تمہارے بوجھ کو بانٹنے والی قوت کیا کرتی ہے۔ تم تو میری زندگی کے نشیب و فراز کے تمام مراحل میں میرے ساتھ رہی ہو تمہارا حوصلہ پہاڑوں سے بلند ہونا چاہیے۔

والسلام

تمہارا والد

جاوید ہاشمی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قیدی کا قیدی سے رابطہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

میمونہ بی بی! مزاج بخیر!

آج خواجہ سعد رفیق نے کیمپ جیل سے میرے نام ایک خط بھیجا، جہاں ڈاکٹر سرفراز نعیمی، سید زعیم قادری اور دیگر محبان رسالت مآب ﷺ کے ساتھ حرمت رسول ﷺ کے تحفظ کے جرم میں قید بے گناہی کاٹ رہے ہیں۔ ہمارے حکمران ذاتی انتقام میں اتنے اندھے ہو چکے ہیں کہ وہ گستاخان رسول کے خلاف تحریک کو اپنے خلاف سمجھ کر ایوانوں میں بیٹھے لرزنے لگتے ہیں، حضور ﷺ کی ذات کی اہانت کوئی مسلمان کیسے برداشت کر سکتا ہے۔ اقبال کہتا ہے۔

بمصطفیٰ برسان خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

مغرب کے غیر تہذیب یافتہ دانشوروں کا اس طرح حضور ﷺ کی ذات کو دہشت گردی کے کارٹونوں کے ذریعے بطور نمونہ پیش کرنا، صرف مسلمانوں کی دل آزاری ہی نہیں، ان دانشوروں کی کم علمی اور ذہنی پراگندگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ سعد رفیق نے اس خط میں جہاں ملکی حالات کا تذکرہ کیا۔ وہاں سیاسی طرز عمل سے پیدا ہونے والے خدشات کا بھی ذکر کیا۔ ذہن میں آیا تمہیں بھی اس سوچ سے آگاہ کروں تاکہ تمہیں زمینی حقائق کا سامنا کرنے میں آسانی ہو۔ تم نے اچھا کیا جو زعیم اور سعد کے اہل خانہ سے مل کر اُن کی ہمت بندھائی۔ تم اس درد کو جان سکتی ہو جو کسی گھر کے سربراہ کے جیل جانے پر گھر والوں کو محسوس ہوتا ہے۔ تم گاہے بگاہے ٹیلی فون پر بھی ان کے بچوں کی خیریت معلوم کرتی رہا کرو، زعیم کا بیٹا بہت چھوٹا ہے اسی طرح خواجہ سعد رفیق کا بیٹا اور بیٹی بھی شیر خوار ہیں۔

بہر حال خط پڑھو اور پھر اس خط کے بارے میں اپنی رائے سے بھی آگاہ کرنا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

برادر محترم ہاشمی صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

جب سے کنج قفس رسول ہاشمی ﷺ سے محبت اور مملکت خداداد کی محافظت کے صلے میں پھر سے ہمارا مسکن قرار پایا ہے، دل مضطرب طویل عرصہ کے بعد پر سکون ہوا ہے۔ سید زعیم قادری اور ڈاکٹر سرفراز نعیمی سے روزانہ ملاقات کی صورت بنی ہوئی ہے۔ آپس کے مباحث نے ماحول کو اچھا خاصا گرمایا ہوا ہے۔ تجزیہ نگاری کا فن عروج پر ہے۔ البتہ جب بھی باہم بیٹھتے ہیں، آپ کی قید تنہائی دل فگار ضرور کرتی ہے۔ پھر سوچتے ہیں کہ ہاشمی زادہ الگ تھلگ کیسے کیا جا سکتا ہے؟ کون سی طاقت ہے جو اسے اپنے اجداد کی ارواح کے جلو میں آزادی کے گیت سننے سے روک سکے؟ کون سا ضابطہ ہے جو اسے اذان حق کا موذن بننے سے باز رکھ سکے اور کون سی دیوار ہے جو اسے لوگوں کے دلوں کی دھڑکنیں سن لینے سے دور رکھ سکے؟؟؟ کہ

ہونٹ سی دینے سے دبتی نہیں آواز دروں

یہاں کیمپ جیل کے بام و در میں اب تک آپ کی خوشبو رچی ہے۔ خوشبو کا یہ سفر رات گئے کوٹ لکھپت جیل میں آباد آپ کے آشرم تک دراز ہو جاتا ہے۔ ایک دوسرے کو بن دیکھے، بن سنے ہی ہمیں ایک دوسرے کو محسوس کرنے پر قادر کر دیا گیا ہے۔ الحمد للہ

سرکار نے سلمان کو پیغام بھجوایا تھا کہ سعد کا حشر جاوید ہاشمی سا کریں گے۔ 7 سال قید کی سزا کے لئے تیار رہو۔ جواباً سلمان نے کہلا بھیجا ہے کہ ہم خدائے عزوجل سے دعا گو ہیں کہ ہمارے بھائی کو جاوید ہاشمی سا عصائے کلیمی عطا ہو اور پاکستان کے حاکموں سی خراج کی گدا کبھی اس کا مقدر نہ ٹھہرے۔ آمین

فتنۂ پرویزی کے دور استبداد میں اگر دوبارہ اسیری کا اعزاز نہ ملتا تو شاید بعد از مرگ بھی اس کا قلق رہتا۔ ہماری خوش نصیبی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ اسلام پاکستان اور جمہور کے دفاع کی جنگ میں پھر سے آپ کی ہمرکابی میسر آ گئی ہے۔ مجھے یقین کامل ہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کہ پاکستان سے آمریت کے آسیب کا خاتمہ افغانستان، بھارت، کشمیر اور ایران تک مسلم مفادات کے خلاف روبہ عمل شیطان کی مجلس شوریٰ کی عبرتناک شکست کی بنیاد بنے گا۔ سو آپ اور آپ کے رفیقان سفر، درحقیقت، خطے کے 50 کروڑ سے زائد مسلمانوں کی آزادی وسربلندی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ گو، فی الوقت، یہ جنگ مختلف گروہوں علاقوں اور پرچموں تلے مقامی قیادتوں کے تحت اپنے اپنے انداز میں لڑی جارہی ہے، لیکن میرا وجدان گواہی دیتا ہے کہ مسلم بقا کی مربوط جدوجہد نہ صرف ہم اپنی آنکھوں سے ہوتے دیکھ سکیں گے بلکہ شریک عمل بھی ہو پائیں گے۔

الحمدللہ، پاکستان ابھی تک افغانستان، عراق، چیچنیا یا کشمیر سی جنگی ہولناکی کا سامنا کرنے سے بچا ہوا ہے۔ بالخصوص افغانیوں، کشمیریوں اور عراقیوں کی تاریخ ساز مزاحمت نے ہمیں وقتی طور پر، براہ راست، جنگ سے ذرا دور تو کر دیا ہے، لیکن کب تک؟؟؟

آج شیطان بش کے چیلے چانٹے ''ذین پرویزی'' کی فتنہ آرائیوں سے لیس ہو کر مملکت خداداد میں طاقت کے منبعوں پر قابض ہیں۔ ملک کو بحرانوں سے بچا کر سلامتی کی راہ پر گامزن کرنا قائد اور اقبال کی وراثت کی علمبردار مسلم لیگ (ن) کی اولین ذمہ داری ہے۔ آپ نے اور آپ کے بعض رفقاء نے بلاشبہ مجاہدانہ کردار ادا کیا ہے۔ مگر بطور جماعت کیا کچھ کیا جانا چاہیے تھا اور کیا کچھ نہیں ہو سکا؟ ایک توجہ طلب موضوع ہے۔ پس دیوار زنداں بھی آپ کے ترانۂ آزادی کی گونج اقتدار کے ایوانوں سے میدانوں اور کھلیانوں تک ہر جگہ سنائی دے رہی ہے۔

میاں نواز شریف کے بے لچک اصولی موقف نے اسے دوآتشہ کر دیا ہے۔ مگر میں یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوں کہ ہمارے اکثر راہنما شاید معجزے کے انتظار میں ہیں۔

''اگلی صفوں میں لڑنے کے عادی کچھ لوگ جنگ لڑتے لڑتے دشمن کے مورچوں تک جا پہنچے ہیں، جہاں چومکھی لڑائی لڑی جارہی ہے۔ جب کہ ہمارے بیشتر ساتھی اپنی جگہ کھڑے دور ہی سے جنگ کا نظارہ اور نتیجے کا انتظار کر رہے ہیں''۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس حوالہ سے جماعتی قیادت نے میرے متعدد تحفظات اور سوالات کا جواب نہیں دیا۔

بہر حال مجھے یقین ہے کہ وطن عزیز میں اسلامی اقدار، آئین، انصاف، جمہوریت اور شہری آزادیوں کی بحالی کے لئے جاری تحریک مزاحمت کی کامیابی اب بہت دور کی بات نہیں رہی۔

خدائے بزرگ و برتر قافلہ حسین رضی اللہ عنہ کو پیش قدمی کرتے رہنے کی تقویت و توفیق عطا فرمائے۔ انشاء اللہ

یہ ہاتھ سلامت ہیں جب تک اس خوں میں حرارت ہے جب تک
اس دل میں صداقت ہے جب تک اس نطق میں طاقت ہے جب تک
ان طوق و سلاسل کو ہم تم سکھلائیں گے شورش بربط و نے
وہ شورش جس کے آگے زبوں ہنگامۂ طبل قیصر و کے

خدا حافظ

آپ کا تحریکی ساتھی

سعد رفیق

کیمپ جیل لاہور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انجیل مقدس سے مشکوٰۃ شریف تک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

بشریٰ بی بی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

جیل میں موسم کی سختیاں عام زندگی سے کچھ زیادہ محسوس ہوتی ہیں۔ خاص طور پر ہم جیسے لوگ جو آرام دہ زندگی کے عادی ہو جاتے ہیں ان پر موسم کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔ مگر جیل سوچ بچار کا بہترین موقع فراہم کرتی ہے۔ میں آج کل مذاہب عالم کا تقابلی جائزہ لے رہا ہوں۔ میں نے اپنے کمرے میں پانچ سو سے زائد کتابیں جمع کر لی ہیں۔ لائبریری کے قیام سے اپنی جہالت میں کچھ کمی لانے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ احباب میں سے جو کوئی بھی کتاب لاتا ہے میں اسے بہترین تحفہ سمجھتا ہوں۔ جب تک کتاب کا مطالعہ مکمل نہ کر لوں چین نہیں آتا۔ جونہی کتاب پڑھ لیتا ہوں، دوسری کتاب کے حاصل کرنے کے لئے تگ و دو کرتا ہوں۔

تمام مذاہب خدا کی تلاش کے لئے انسان کی راہنمائی کرتے ہیں۔

عادلانہ نظام کو تسلیم کرنا اور شہریوں تک اِس کے ثمرات پہنچانا حکمران کی بنیادی ذمہ داری ہوتی ہے اور اگر وہ کسی سبب سے ایسا نہ کر سکے تو اپنے ساتھ شہریوں کی جہالت کا بھی ذمہ دار ہوتا ہے۔ حضور ﷺ نے قیصر روم کو لکھا:- "میں تم کو اِسلام قبول کرنے کی دعوت دیتا ہوں، اگر اسے مان لو گے تو دُنیا میں بھی بچے رہو گے اور اللہ تعالیٰ تمھیں اِس کا دُگنا اجر دے گا۔ اگر تُم نے اِس دعوت کو قبول نہ کیا تو تمہارے کسانوں پر جو مظالم ہو رہے ہیں اور وہ اپنی جہالت کے باعث جو غلطیاں کر رہے ہیں، ان کے تم ذمہ دار ہو گے۔ ہم نے کوئی راہ عمل متعین نہ کی تو موجودہ ابتلا و مصیبت برداشت کرنا عوام کے نزدیک بے مقصد ہو جا ئیگا، اور عوامی گمراہی کا سبب صرف قیادت ٹھہرے گی۔ یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ نظام عدل

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قائم کرنا سیاسی قیادت کی حقیقی ذمہ داری ہے۔ دنیا میں صرف ظالم اور مظلوم طبقات ہی پا ئے جاتے ہیں۔ بقول شاعر!

غریبوں کے جہاں میں وقت بھی رُک رُک کے چلتا ہے!
کہیں صبحیں نہیں ہوتیں کہیں شامیں نہیں ہوتیں

انسانیت تمام طبقات کی فلاح کے اصول کو اپنانے سے ہی سرخرو ہوگی۔

انجیل مقدس سے مشکوۃ شریف تک غریبوں اور بے سہارا لوگوں کی خدمت کو خدا کی تلاش کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ نفس مضمون دونوں جگہ ایک ہی ہے، اگرچہ پیرایہ مختلف ہے۔ کہیں کہا گیا، میں بیمار ہوا تھا تم نے میری خبر گیری نہ کی، مجھے قرض چاہیے تھا تو نے مجھے قرض نہیں دیا تھا، کہیں کہا گیا کہ "قیامت کے روز اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اے ابنِ آدم! میں بیمار ہو گیا لیکن تو نے میری خبر تک نہ لی؟ انسان کہے گا، اے میرے پروردگار! تُو تو ساری اقوام کا رب ہے، تیری خبر گیری میں کس طرح کرتا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، تجھے خبر نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا لیکن تو نے اس کی عیادت نہ کی، اگر تو اُس کی عیادت کرتا تو تُو مجھے اُسکے پاس پاتا۔ اے ابنِ آدم، میں نے بھوک میں تجھ سے کھانا مانگا لیکن تو نے مجھے کھانے کو کچھ نہ دیا۔ انسان کہے گا، یا اللہ تو ساری دنیا کا پروردگار ہے، تجھے کھانا کس طرح دیتا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، تجھے خبر نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا مگر تو نے نہ دیا، اگر تو اسے کھانا دیتا تو اسے میرے پاس پاتا۔ اے ابنِ آدم! میں نے پیاسا ہو کر تجھ سے پانی مانگا لیکن تو نے مجھے پانی نہ دیا۔ انسان کہے گا یا اللہ! تو تمام اقوام عالم کا پروردگار ہے، تجھے پانی کس طرح دیتا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا تو نے اسے دیا نہیں۔ تجھے خبر نہیں کہ اگر تو اسے پانی دے دیتا تو اسے میرے پاس پاتا۔

جو انسان خدا کو تلاش کر لیتے ہیں جب وہ دوسرے انسانوں سے اس گفتگو کا خلاصہ بیان کرتے ہیں جو خدا اور ان کے درمیان ہوتی ہے تو حیران کن حد تک ایک بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ خدا انہیں کہتا ہے میں لوگوں میں رہتا ہوں اگر مجھے تلاش کرنا چاہتے ہو تو لوگوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے پاس جاؤ میں تمہیں ان کے پاس ملوں گا۔

حکمرانوں کے بارے میں کہا گیا ہر راعی کو اپنی رعیت کے بارے میں قیامت کے روز حساب دینا ہو گا۔

اس کے جواب کیلئے ابھی سے تیاری کرنی ہے تمہیں بھی اور مجھے بھی۔

والسلام!

تمہارا والد!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انسٹھ سالہ آزادی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

14 اگست 2006ء

میمونہ بی بی! السلام علیکم!

آج پاکستان کو بنے۔ انسٹھ سال ہو گئے۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اس دن کو خاص اہتمام کے ساتھ منایا۔ آج بھی میں اٹھ کر غسل کیا، کپڑے بدلے، خوشبو لگائی اور بارگاہ رب العزت میں سجدہ ریز ہو کر شکرانے کے نفل ادا کیے۔ آزادی کے حصول میں جانوں کا نذرانہ پیش کرنے والوں کے لئے فاتحہ پڑھی۔ قائد اعظم، علامہ اقبال اور دیگر راہنماؤں کے لئے بھی دعائے مغفرت کی۔ لبنان فلسطین، کشمیر، افغانستان، عراق اور چیچنیا کے مجاہدین کی کامیابی کے لئے خدائے بزرگ و برتر سے نصرت کی التجا کی۔

میمونہ بی بی! گذشتہ سات سال میں، میں چھٹا یوم آزادی جیل کی چار دیواری کے اندر منا رہا ہوں۔

آج بھی کمرے کی جالیوں سے آزادی کی صبح کا منظر دیکھنے کی کوشش کی مگر میری نظر پھانسی گھاٹ کی دیواروں سے آگے نہ جا سکی۔ میرے سامنے ہر وقت پھانسی کا پھندا لٹکتا رہتا ہے۔ میں نے ایڑیاں اٹھا کر اس کے اوپر سے ڈیوڑھی پر لہراتے پرچم کو دیکھنے کی کوشش کی مگر یہ سب بے سود تھا پانچ بجے کے قریب صحن میں آیا تو ڈیوڑھی کے کھمبے پر لگے پرچم کو ابھی تک نہیں کھولا گیا تھا۔ جیل میں یوم آزادی سرکاری طور پر منایا جاتا ہے، لیکن مجھے کسی ایسی اجتماعی دعا میں شمولیت کی اجازت نہیں۔ میرے پاس جو قیدی کام کرنے آتے ہیں انہیں آزادی کی مبارکباد دیتا ہوں اور وہ مجھے۔ ہم قیدی ہو کر آزادی کی مبارک باد وصول کرتے ہیں اگر پاکستان نہ بنا ہوتا تو شاید کشمیریوں کی طرح جیل سے باہر ہونے کے باوجود ایک دوسرے کو آزاد ہونے کی مبارک باد پیش نہ کر سکتے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لبنان اسرائیل جنگ کی وجہ سے آج کا دن اہمیت کا حامل ہوگیا ہے۔ لبنان نے فوج نہ ہونے کے باوجود دنیا کی مضبوط ترین عسکری قوت کا سر جھکا دیا۔ ہمارے پاس دنیا کی منظم ترین فوج ہونے کے باوجود ہمارا سر امریکہ کے سامنے جھکا ہوا ہے۔ حزب اللہ نے اسرائیل کو شکست دے کر عسکری تاریخ کو نیا موڑ دے دیا ہے۔ اب یہ سوچ پیدا ہوگئی کہ بڑی فوجیں آزادی کی حفاظت کرنے کی بجائے اپنی حفاظت کرتی ہیں اور اپنے وجود کو بچانے کے لئے ملک کا وجود گروی رکھ دیتی ہیں۔ خاص کر مسلمان ملکوں میں ایک نئی لہر کا پیدا ہونا یقینی ہے۔ گزشتہ ساٹھ سال میں افریقہ، لاطینی امریکہ اور دیگر ایشائی ممالک نے اپنی فوجوں کی بالادستی سے چھٹکارا حاصل کرلیا ہے۔ حتیٰ کہ نیپال جیسے ملک میں بھی فوج نے عوام کے سامنے ہتھیار پھینک دیئے۔ صرف مسلمان ممالک اب تک اپنی افواج کے یرغمال بنے ہوئے تھے۔ حزب اللہ کی کامیابی نے انہیں نئی جہتوں سے روشناس کر کے ایک نئے انقلاب کی بنیاد رکھ دی ہے۔ میں نے آج صبح دعا بھی مانگی تھی کہ یا اللہ ہماری فوج کو امریکہ کی غلامی سے آزاد کر اور پندرہ کروڑ عوام کو فوج کی غلامی سے۔

ہندوستان نے اسرائیل سے شہ پا کر ہمیں دھمکی دی تھی کہ وہ اسرائیل کی طرح پاکستان کے دہشت گردوں کا پاکستان کی سرزمین کے اندر تک پیچھا کرنے کا حق استعمال کرے گا۔ امریکہ کے وائٹ ہاؤس کے ترجمان رچرڈ باؤچر نے ہندوستان کے اس اقدام کی حمایت میں بیان جاری کر دیا تھا۔ ہمارے حکومتی ادارے اپنی بے بسی کا ماتم کرنے کے علاوہ کچھ بھی نہ کرسکے۔

میں سمجھتا ہوں کہ آج سے آزادی کا ایک نیا دور شروع ہوگا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ آج 14 اگست کو 7 بجے صبح سے جنگ بندی کی قرارداد پر عمل درآمد شروع ہو جائے گا اور عالمی تاریخ ایک نیا موڑ مڑ جائے گی۔ آج کے بعد نہ وہ اسرائیل رہے گا اور نہ وہ مشرق وسطیٰ بلکہ عسکریت کی بالادستی کے قلعہ میں جو شگاف پڑا ہے وہ آگے جا کر عوام کی فتح کی نوید بن جائے گا، جو کام مصر، سعودی عرب، لیبیا، اردن، شام کی افواج مل کر نہ کرسکیں، وہ ایک محدود

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سی عوامی قوت نے کر کے دکھا دیا ہے۔ نام نہاد عظیم افواج کی اپنے عوام کے سامنے مٹی پلید ہو گئی۔ یہ اب معیشت پر بوجھ نظر آنے لگی ہیں۔ ان افواج کی وجہ سے عالم اسلام آمروں کی گرفت میں ہے اور ہر آمر اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے عالمی قوتوں کی گرفت میں۔ عالمی قوتوں کے لئے کسی فوج کے اندر اپنا اثر ورسوخ بڑھانا نہایت آسان ہوتا ہے۔ اس طرح انہوں نے ایک ارب سے زیادہ مسلمان قوم کی آزادی سلب کی ہوئی ہے۔ عراق کی روایتی فوج کا بہت بڑا حصہ اپنے عوام سے جنگ لڑ رہا ہے۔ عالمی قوتوں کی قدرتی وسائل والے ملکوں پر گرفت کو موثر بنانے میں روایتی فوجیں کارآمد ذریعہ ہیں۔

امریکہ نے جو بظاہر، جمہوریت کا چیمپئن (Champion) بنتا ہے، ایک صدی تک جنوبی امریکہ میں جمہوریت کے خلاف سازشیں کیں اور وہاں کے ڈکٹیٹرز کی حمایت کی لیکن وہاں اس کی سازشیں دم توڑ چکی ہیں، آخری ضرب وینزویلہ کے عوام نے لگائی ہے جنہوں نے فوجی انقلاب ناکام بنا کر اپنے منتخب صدر شاویز کو دوبارہ اقتدار کی کرسی پر بٹھا دیا ہے۔ افریقہ میں یورپی ممالک اپنے اپنے مفادات کا تحفظ کر رہے ہیں۔ قرائن بتاتے ہیں افریقہ، کافی حد تک بیرونی اثر ورسوخ سے بہت جلد چھٹکارا حاصل کرے گا۔

مشرق وسطیٰ میں امریکہ نے، عراق میں اور آگے بڑھ کر افغانستان میں برائے نام جمہوریت کا شوشہ چھوڑا ہے، جب کہ حقائق اس کے اس دعوے کے خلاف ہیں۔ نائیجیریا، فلسطین، صومالیہ، سوڈان، لبنان، ایران اور پاکستان میں جہاں جمہوری نظام کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے اور پارلیمنٹ کا ادارہ بھی کام کر رہا ہے، امریکہ ان ملکوں کے عوام کے فیصلے تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ کیونکہ اسے اس بات کا احساس ہو چکا ہے کہ دنیا بھر کے عوام، بالعموم اور مسلمان ممالک کے عوام بالخصوص، امریکہ کی پالیسیوں کے سخت مخالف ہیں۔ اس لئے وہ ان ممالک پر گرفت مضبوط کرنے کے لئے، وہاں کی افواج کو بغاوت پر اکساتا ہے۔ اسے حسنی مبارک، قذافی، سعودی عرب اور اردن کی شہنشاہیت سے خطرہ نہیں ہے۔ اسے وہاں کے عوام سے خطرہ ہے۔ اس لئے وہ غیر مقبول حکومتوں کی سرپرستی کر کے انہیں مسلمانوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے مفادات کے خلاف استعمال کرتا رہتا ہے۔حزب اللہ کی کامیابی نے اس کے خواب چکنا چور کردیئے۔آج کا دن دنیا بھر کے مظلوم انسانوں کی فتح کا دن ہے۔حزب اللہ اور اس کے راہنما حسن نصر اللہ یقیناً ہمارے خراج تحسین کے مستحق ہیں۔

ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

میمونہ بی بی، میں نے گزشتہ ڈیڑھ سال میں قرآن حکیم کو عربی گرامر سے ترجمہ کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی ہے۔تمہارا سینہ قرآن سے منور ہے، میں تمہیں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ دنیا کو سمجھنے کے لیے بھی قرآن مجید سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے، دین کی تو اساس یہی منبع فیض ہے، یقیناً اندھیرے سے اجالے کی طرف لے آتا ہے۔میں آج کے یوم آزادی کے موقع پر تمہیں اس سے بڑی کوئی نصیحت نہیں کرسکتا کہ تمہیں قرآن میں غوطہ زن ہونے کی تلقین کروں۔قرآن کا چراغ جس دل میں فروزاں ہو جائے تو دنیا بھر کے اندھیرے اس سے بھاگتے ہیں۔جب بچپن میں تم قرآن حفظ کررہی تھیں تو مجھے اس بات کا احساس نہیں تھا کہ قرآن فہمی کتنی ضروری ہے۔مگر اب میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ قرآن کا حفظ کرنا بہت بڑی سعادت ہے۔مگر اس کا سمجھنا شاید اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ ہمارے دینی مدارس نے گزشتہ کئی صدیوں سے صرف قرآن کے حفظ کرنے پر زور دیا۔شاید یہ اس دور کی ضرورت بھی تھی۔مگر قرآن کے اندر چھپے ہوئے علم کے خزانوں تک پہنچنے کے لئے اب یہ بہت ضروری ہے کہ قرآن کو وضاحت کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی جائے۔اگرچہ مسلمانوں نے اسوہ رسول ﷺ کو سامنے رکھ کر زندگیوں کو نمونہ بنانے میں کافی محنت کی اور سیرت رسول ﷺ کو قرآن کا عملی نمونہ سمجھتے ہوئے اپنے کردار کو ایک خاص رخ پر چلایا۔مگر حضور ﷺ نے قرآن فہمی پر بار بار زور دے کر یہ نکتہ ذہن نشین کرانے کی کوشش کی کہ قرآن پر عمل کرنے میں ہی امت کی فلاح ہے۔عمل اسی وقت ہوسکتا ہے جب انسان کو کسی کام کی سمجھ آچکی ہو۔

میں واپس اپنے گاؤں کے سکول میں پہنچ گیا ہوں، جہاں گرمی کی چھٹیوں میں 14

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اگست کوسکول بند ہونے کی وجہ سے تقریب آزادی منانے کا رواج نہ تھا۔ میں نے رات دن محنت کر کے کچھ اساتذہ کو اس دن کے لئے اپنے اپنے گاؤں سے سکول آنے پر آمادہ کر لیا۔ پہلے سال چھوٹی سی تقریب ہوئی، اس روز سبز ہلالی پرچم لہرانے کا نشہ آج تک نہیں اتر سکا۔ دوسری تقریب اس سے کہیں بڑھ کر تھی میں نے سکول سے کالج کا سفر کیا۔ آخری سال کی تقریب بہت حسین تھی۔ اس وقت بھی میرے سامنے وہ پرچم ہوا میں لہرا رہا ہے۔ میں کنول کے جنازے میں شرکت کے لئے گیا تو وقت بہت مختصر تھا۔ میں اپنی ماں کی قبر پر فاتحہ بھی نہ پڑھ سکا۔ سکول کے گراؤنڈ میں کنول کا جنازہ پڑھتے ہوئے میں نے دیکھا وہ سٹیج اُسی طرح موجود تھا جس پر میں نے پہلی مرتبہ پاکستان کا پرچم لہرایا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ آج اس وقت جب میں جیل کی ڈیوڑھی پر پاکستان کا پرچم لہراتے دیکھ رہا ہوں، سکول کے گراؤنڈ میں معصوم بچے اس پرچم کو تھام کر قومی ترانے گا رہے ہوں گے۔

اس پرچم کے سائے تلے ہم ایک ہیں

جس وطن کے پاسبان عوام بن جائیں، اُس ملک کی آزادی کو اسرائیل اور امریکہ مل کر بھی نہیں چھین سکتے۔

والسلام!

تمہارا والد

www.iqbalkalmati.blogspot.com

زندہ دلوں کا شہر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

27 جولائی 2006ء (جمعرات)

میمونہ بی بی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

آج ہسپتال گیا تھا لاہور کے کوچہ و بازار سے گزرا تو ماضی سامنے آ گیا لاہور کی تاریخ پر پھر کبھی لکھوں گا فی الحال آج کی ڈائری کا کچھ حصہ پیش نظر ہے۔

صبح نماز کے بعد دروازہ کھلنے کا انتظار کرتا رہا پھانسی کی وجہ سے جیل کی بیرکوں کے تالے دیر سے کھولے جاتے ہیں مجھے بھی کافی دیر بعد کمرے سے نکلنے کی اجازت ملی۔ ساری رات کا جاگا ہوا تھا اس کے باوجود ایک گھنٹہ واک کی سوا سات بجے سو گیا دو گھنٹے بعد اٹھ کر دانتوں کے علاج کے لئے ہسپتال جانے کی تیاری کی دس بجے کے قریب پولیس کی گاڑی میں بیٹھ کر شہر کی طرف روانہ ہوا۔ چراگاہ میں بھینسیں اور گائیں گھاس چر رہی تھیں دو چرواہے آپس میں گتھم گتھا ہو کر زور آزمائی کر رہے تھے ہمارے دیکھتے دیکھتے دو بھینسے بھی ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے معلوم نہیں ان پر انسانوں کا اثر ہو گیا تھا یا چرواہوں کی زندگی پر ان کے اثرات تھے جس گھاس کو وہ چرنا چاہتے تھے وہ ان کے پیروں تلے روندی جا رہی تھی شاید ان کے پیٹ بھرے ہوئے تھے اور وہ اس گھاس کو دوسرے جانوروں کے کھانے کے قابل نہیں رہنے دینا چاہتے تھے یہ انسانوں والی عادتیں جانوروں میں کب سے آ گئیں؟

ریلوے کا پھاٹک پار کیا تو ایک بڑھیا جس کی آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگا ہوا تھا ہاتھ میں لاٹھی لئے بکریوں کے ریوڑ کی رکھوالی کر رہی تھی وہ بہت ضعیف تھی مگر بکریوں پر اس کا مکمل کنٹرول تھا وہ جدھر لاٹھی کا اشارہ کرتی بکریاں اسی سمت چلنا شروع کر دیتیں میں سوچنے لگا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہ بڑھیا کا کمال نہیں لاٹھی کا کمال ہے ہمیں ایسے حکمران بھی ملے ہیں جو فالج زدہ تھے ان کی زبان بھی ان کا ساتھ نہیں دیتی محض مگر لوگ ان کے مطیع وفرماں بردار تھے جب حکمرانوں کے کاندھے پر بندوق ہوتو ہمارے بڑے بڑے مشیر بھی ان کے سامنے بکری بن کر ممیانے لگتے ہیں۔

جیل شہر کے ایک سرے پر ہے اور دانتوں کا ہسپتال دوسرے سرے پر درمیان کا راستہ پندرہ بیس کلومیٹر کا ہے میں نے لاہور شہر کے ان علاقوں میں پارٹی انتخابی مہم چلائی ہے یہ حسن اتفاق ہے کہ لاہور شہر سے میں کبھی انتخاب نہیں ہارا میں ہسپتال جاتے ہوئے ایک ایک دکان اور ہر ایک عمارت کو غور سے دیکھتا رہا ایک ایک اینٹ سے کوئی نہ کوئی میری کہانی وابستہ ہے چونکہ پولیس وین کے شیشوں پر کالا رنگ کیا گیا ہے میں باہر کے لوگوں کو دیکھ سکتا ہوں مگر انہیں معلوم نہیں ہوتا اندر کون ہے میں رواں دواں زندگی کو دیکھ کر خوش ہوتا ہوں مگر آج یہ دیکھ کر پریشان ہوا کہ تمام شہر کیچڑ میں لت پت ہے اور سوائے قرطبہ چوک کے کوئی حکومتی ادارہ صفائی کے لئے متحرک نظر نہ آیا۔ ایم، اے، او، کالج کے سامنے ایک خاکروب تیلیوں سے بنے ہوئے کمزور جھاڑوں سے سڑک پر چلنے والے پانی کے سیلاب کا رخ موڑنے کی ناکام کوشش کرر ہا تھا۔

ہسپتال میں ایک گھنٹہ تک زیر علاج رہا واپسی کا سفر مال روڈ کے راستے طے کیا جب شاہی مسجد کی دیواروں کے قریب سے گزرے تو ماضی کی فلم چلنے لگی مینار پاکستان پر پارٹی جلسوں سے خطاب کے مناظر میرے سامنے تھے مسجد کے اندر جھانکا تو علامہ اقبال محوخواب تھے سامنے شاہی قلعہ کا دروازہ تھا جہاں مجھ پر تشدد کیا گیا بعد میں شاہی محلّہ اور شاہی قلعہ میرا انتخابی حلقہ بنا تو ہر طوائف کے دوازے پر ووٹ کی بھیگ مانگی اسی محلے میں جماعت اسلامی کے حافظ سلیمان بٹ، جمعیت علماء السلام کے حضرت مولانا عبیداللہ انور اور قاضی حسین احمد کو بھی ووٹ مانگتے دیکھا بلکہ ان کے ساتھ مل کر اس علاقے میں جلسہ عام سے خطاب کر کے ووٹ کے لئے جھولی بھی پھیلائی اسی جگہ (ترنم چوک) پر ذوالفقار علی بھٹو میاں نواز

www.iqbalkalmati.blogspot.com

شریف اور محترمہ بینظیر بھٹو کے خطاب بھی سنے۔

موڑ مڑتے ہوئے موہنی روڈ، ٹکسالی اور داتا گنج بخش سے گزرتا ہوا بھاٹی گیٹ کے قریب پہنچا تو اندرون بھاٹی گیٹ سے سید مٹھا بازار کی طرف نظر اٹھ گئی جہاں سے گزرتے ہوئے مجھ پر ہر گھر سے پھولوں کی بارش ہوئی تھی پھر اسی جگہ گولیوں کی بارش بھی ہوئی جس میں مشکل سے جان بچی۔ لوہاری گیٹ کی مسلم مسجد کے مینار نظر آئے تو ان پھلیروں کی یاد آئی جو اندرون شہر داخلے پر ہر مرتبہ پھولوں کے گجرے پیش کرنے کے لئے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے اندرون لوہاری کی ایک ایک دکاندار کے چہرے کی مسکراہٹیں یاد آئیں، سوتر منڈی سے پہلے خواجہ رفیق کا گھر ہے ان کی شہادت کے موقع پر ان کی بیگم صاحب کی پرعزم تصویر نظر آئی پھر لاہور شہر کا ہر کوچہ و بازار مصور کی تصویروں کی طرح بانہیں کھولے کھڑا تھا جدھر جاتا ہر شخص شناسا نظر آتا اور ہر عمارت اپنی لگتی مسجد وزیر خاں کی رنگا رنگ مچھلیاں آنکھوں کو طراوت بخشتیں، حضرت سید صاحب صوف کا مزار، اندرون شیرانوالا گیٹ میں تنگ گلیوں میں گاڑی کا پھنس جانا، مولانا عبیداللہ انور کے خدام الدین کا دفتر، گمٹی بازار، سوہا بازار، بازار حکیماں، چوک نواب صاحب، اعظم مارکیٹ، کوچہ چابک سواراں، موچی دروازہ اور ان کے سامنے برصغیر پاک و ہند کی عظیم جلسہ گاہ جس میں عظیم مقررین نے خطابت کے جوہر دکھائے سامنے تھا یہ بات مشہور تھی کہ کوئی شخص برصغیر کا لیڈر کہلا نہیں سکتا اگر اس نے موچی دروازہ کی جلسہ گاہ میں تقریر نہیں کی یہاں سے مسجد شب بھر کو تصور کی آنکھوں سے دیکھا اندرون شہر کی سنہری مسجد، پرانی کوتوالی، کشمیری بازار، چوک رنگ محل، پانی والا تالاب سامنے تھے۔ نظر دوسری طرف ڈالی تو گوالمنڈی، بانساں والا بازار، ریلوے روڈ، لکشمی چوک، نکلسن روڈ پر نوابزادہ نصراللہ کے ڈیرے سے ہو کر ریلوے سٹیشن سے آگے دو موریہ سے نکل کر مصری شاہ جا پہنچا۔ وہیں سے انجینئرنگ یونیورسٹی اور تاریخی شالامار باغ سے ہوتا ہوا محمود بوٹی بند تک جا پہنچا۔ شمالی پنجاب کے اپنے حلقہ انتخاب کے ایک ایک فرد سے ملاقات کی ان سے کہا جو امانت مجھے آپ نے سونپی تھی میں جان کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بازی لگا کر اس کی حفاظت کر رہا ہوں میں نے آپ سے کیا عہد نہیں توڑا۔ مجھے اردو بازار کی دکانیں نظر آئیں جہاں میں کتابوں کی تلاش میں مارا مارا پھرا کرتا تھا۔ اچھے پہلوان کی دودھ کی دکان سامنے تھی، بھاٹی کے اردگرد کا علاقہ لاہور کے روایتی کھانوں کا مرکز ہے یہاں کی باقر خانی کا کہیں جواب نہیں یہاں کے گردے کپوروں کی ڈش کہیں اور نہیں مل سکتی۔

بھاٹی گیٹ چوک سے لوئر مال کی طرف گاڑی مڑی تو دائیں ہاتھ کربلا گامے شاہ کا مزار تھا جہاں میں یوم عاشور کو آیا کرتا تھا دائیں ہاتھ پر سنٹرل ماڈل سکول کی عمارت تھی جس میں داخلے کے خواب میں گاؤں میں بیٹھ کر دیکھا کرتا اگلا مرحلہ عجیب تھا دائیں ہاتھ ضلع کچہری تھی جس کی عمارت میں بارہا گرفتاری کے بعد جسمانی ریمانڈ کے لئے پیش کیا گیا۔ رہائی کے بعد مقدمات کی سماعت کے لئے اتنی مرتبہ حاضری دی کہ اس کا شمار کرنا لاحاصل ہے بائیں ہاتھ پر برصغیر کا شہرت یافتہ گورنمنٹ کالج ہے جو طالب علمی کے زمانے میں میری سرگرمیوں کا مرکز رہا مجھے وہاں کی تقریبات میں کی گئی تقریروں کا ہر لفظ یاد آنے لگا، آگے ناصر باغ تھا جس کے درختوں تلے میں امتحان کی تیاری کے لئے کتابوں میں گم ہو جایا کرتا تھا پھر بطور سیاستدان یہاں پر کی گئی تقاریر ذہن میں آنے لگی لوئر مال سے مال روڈ کی طرف مڑے تو یادوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔

دائیں ہاتھ پر ٹاؤن ہال تھا مجھے یاد آیا 1972ء میں پیپلز پارٹی کی حکومت طالب علموں کو خوش کرنے کے لئے ان کے کرائے کم کرنا چاہتی تھی ٹاؤن ہال میں وزیر ٹرانسپورٹ افضل وٹو کی صدارت میں طلبہ اور ٹرانسپورٹروں کو بھی اپنے خیالات کے اظہار کا موقعہ دیا گیا۔ حکومت کی تجویز تھی کہ بیس کلومیٹر کے فاصلے سے شہر آنے والے سٹوڈنٹس کو 10 پیسے ادا کرتے پر سفر کا حق حاصل ہو میں نے تقریر میں اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ کوئی ٹرانسپورٹر اپنی پچاس سیٹوں والی بس کو صرف پانچ روپے وصول کر کے شہر تک نہیں لائے گا اس طرح کئی طلبہ مارے جائیں گے یا پتھر اور اینٹ ہاتھ میں لے کر بسوں کو روکیں گے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس طرح کے ٹکراؤ سے ایک ایسی نسل تیار ہوگی جو چھینا جھپٹی سے اپنے مسئلے کا حل تلاش کرے گی، وزیر موصوف کہنے لگے آپ تو طلبہ کے نمائندہ ہیں آپ کو اس رعایت کی حمایت کرنی چاہیے۔ میں نے کہا میں طلبہ کے قتل عام کے منصوبے کا حامی نہیں ہوسکتا آج بھی دوسرے تیسرے دن اخبارات میں کسی طالب علم کی ٹرانسپورٹر کے ہاتھ سے ہلاکت کی خبر پڑھتا ہوں تو اس میٹنگ کا سارا منظر سامنے آجاتا ہے اسی ٹاؤن ہال میں 1977ء کے انتخابات میں صوبائی اسمبلی کے امیدوار کی حیثیت سے درخواست دینے آیا تو ریٹرننگ آفسر نے میرے مخالف امیدوار کو جو ایک وزیر تھا اندر بیٹھا کر کنڈی چڑھائی ہوئی تھی کاغذات نامزدگی پیش کرنے کا وقت ختم ہو رہا تھا اور وہ اسے دھاندلی کر کے بلا مقابلہ منتخب کرانا چاہتا تھا میں دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو گیا میرے ساتھ ایک بہت بڑا جلوس تھا انہوں نے عدالت کو گھیر لیا تو ریٹرننگ آفیسر کو میرے کاغذات قبول کرنا پڑے جوں جوں گاڑی آگے بڑھتی گئی واقعات کی فلم تیزی سے چلنے لگی۔ نیشنل کالج آف آرٹس، عجائب گھر، پنجاب یونیورسٹی (اولڈ کیمپس) کی انتخابی معرکہ آرائیاں، ٹولنٹن مارکیٹ کا چائے خانہ کیپری اور کونے پر اخبارات کی دکان۔ پھر بائیں ہاتھ نئی انارکلی تھی جس کی ایک ایک دکان پر میں نے دفاعی فنڈ جمع کرنے کے لئے 1971ء میں جھولی پھیلائی۔ دائیں طرف دیکھا تو پرانی انارکلی سے رانا چیمبرز تک اور دائیں سے جین مندر کے ساتھ ہیلی کالج کی دیواروں تک ہزاروں واقعات کا تسلسل تھا۔ رانا چیمبرز میں مجیب الرحمٰن شامی اور رانا نذر الرحمان کے ساتھ مل کر پاکستان کی سیاسی زندگی کے نقوش بنانے اور مٹانے کی کوششوں کی تصویر واضح ہوتی چلی گئی۔ پرانی انارکلی پر تھڑوں پر بیٹھے بالا برف والا، شریف مرغ چھولے والا، رانا مٹھائی والا اور سید رشید شاہ یاد آئے جو سیاسی ورکر تھے اور ایئر مارشل اصغر خان کی جماعت میں شامل تھے۔

چوک سے بائیں طرف دیکھا تو مکی کے بھٹے بیچنے والا چاچا چراغ دین یاد آیا جو کہتا تھا کہ اس نے تیس سال میں نئی انارکلی سے پرانی انارکلی کی سڑک عبور نہیں کی نہ ہی اس کو روزی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

روٹی سے اتنی فراغت ملی۔

16 دسمبر کو اسی چوک پر کھڑے ہو کر یحییٰ خان کو پھانسی دینے کا مطالبہ اور عوام کی پر زور تائید یاد آئی تھوڑا سا آگے چلنے سے نیلہ گنبد آ گیا پاک ٹی ہاؤس اور چائنیز لنچ ہوم میں منعقد ہونے والی پریس کانفرنس آغا شورش کاشمیری اور مجید نظامی (چیف ایڈیٹر نوائے وقت) کی محفلیں پیچھے چھوڑ آیا۔ اسی چائنیز لنچ ہوم سے اسلامی کانفرنس برائے دن بنگلہ دیش نامنظور کا نعرہ لگاتے ہوئے آگے بڑھا تو لوگوں کا جم غفیر ساتھ ہو گیا تھا نیلہ گنبد سے تحریک نظام مصطفےٰ کے لیے نکلنے والے سارے جلوس یاد آ گئے چند قدم آگے دائیں ہاتھ پر ہائی کورٹ کی عمارت تھی یہ عمارت بھی میری زندگی میں اہمیت کی حامل رہی ہے اس عدالت کے کمروں میں انصاف کی بھیک مانگنے کے لیے سینکڑوں مرتبہ آیا کئی مرتبہ یہاں وکلا نے بار سے مجھے خطاب کرنے کا اعزاز بخشا عدالت کے برابر آغا شورش کاشمیری کے گھر کی طرف جھانکنے کی کوشش کی اگلہ چوک مسجد شہدا کا تھا بائیں ہاتھ پر بیڈن روڈ اور ہال روڈ تھے اس چوک کو ریگل چوک کہتے ہیں بیڈن روڈ سے ایک مرتبہ ہمارے جلوس پر فائرنگ کی گئی ایک ایسے ہی جلوس سے واپس جا رہے تھے کہ اطلاع ملی ہمارے جلوس کے راہنماؤں میں سے خواجہ رفیق کو گولی مار کر شہید کر دیا گیا ہے

اسی علاقے سے 1977ء انتخاب لڑ رہا تھا۔ یہاں کے مکینوں نے میری حمایت ووٹ اور نوٹ دونوں سے کی میں یہاں اکثر مولا بخش کے پان کھانے آتا تھا مسجد شہدا بننے سے پہلے بھی میری اس علاقہ سے شناسائی تھی اس سے اگلا چوک لاہور شہر کا اہم ترین علاقہ ہے جسے چیئرنگ کراس کہتے ہیں اسی چوک میں پنجاب اسمبلی کی عمارات ہے جہاں اکثر ہمارے جلوسوں کا اختتام ہوتا تھا اسی اسمبلی کی سیڑھیوں پر تارا سنگھ نے کرپان لہراتے ہوئے کہا تھا کہ جس نے پاکستان کا مطالبہ کیا اس کی زبان کو اس کرپان سے کاٹ دیں گے یہ بھی مشہور ہے کہ لاہور سے ایک بہت بڑے جلوس میں سر سکندر حیات کے خلاف اپنے مخصوص انداز سے نعرے لگائے جا رہے تھے سر سکندر کے قائداعظم سے جاری مذاکرات کامیاب ہو گئے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جلوس میں جب یہ خبر آئی تو جو لوگ دشنام طرازی کر رہے تھے کہنے لگے نویں خبر آئی اے تے سکندر ساڈا پائی اے۔ یعنی نئی خبر آ گئی ہے آج سے سکندر ہمارا بھائی ہے۔

چیئرنگ کراس پر پہنچنے تک ہر جلوس نکتہ عروج پر پہنچ جاتا ہے بہت کم جلوس گورنر ہاؤس تک جاتے ہیں۔ جیپ میں میرے ساتھ بیٹھا ہوا ڈی ایس پی اونگھ رہا تھا مگر میرے ذہن میں یادوں کی ریل تیز ہوتی جا رہی تھی گورنر ہاؤس کے سامنے پہنچ کر مجھے یاد آنے لگا کہ کس طرح ہم گورنر ہاؤس کے دروازے توڑ کر اندر گھس گئے میں نے گورنر ہاؤس کی دیواروں پر لگی ہوئی بجلی کی تاریں دیکھیں تو ندامت ہونے لگی میرے جلوسوں سے تنگ آ کر ملک مصطفٰی کھر نے یہ تاریں قومی خزانے سے خطیر رقم خرچ کر کے لگوائیں۔ حالانکہ اس سے پہلے انگریز گورنروں کو بھی کبھی اپنی حفاظت کے لئے ایسا قدم اٹھانے کی ضرورت نہ پڑی۔ میں نے آج صبح کے اخبارات میں پڑھا کہ اب گورنر ہاؤس کی دیوار مزید دس فٹ اونچی کی جا رہی ہے یہ عجیب بات نہیں کہ ہمارے محبوب حکمران اپنے عشاق سے چھپنے لگے ہیں مگر اس میں حیرانی کی کون سی بات ہے یہ تو شان محبوبی ہے اگر پردے حائل نہ ہوں تو دیدار عام کا منظر کہیں ڈھول ڈھپے میں نہ بدل جائے۔

چیئرنگ کراس سے گورنر ہاؤس کے درمیان آواری ہوٹل (AVARI HOTEL) وزیر اعلیٰ کا دفتر، باغ جناح اور پرل کانٹینٹل (PERL CONTINENTEL) بھی موجود ہے۔

وہاں سے وابستہ یادیں میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ چڑیا گھر کو دیکھنے کے لئے بچپن سے ملتان کا دور دراز سفر کر کے آتا تھا۔ باغ جناح کی روش روش میرے پاؤں کی چاپ سے آشنا ہے اگلے چوراہے پر دائیں ہاتھ وزیر اعلیٰ کے دفتر کا راستہ ہے اسی علاقہ میں پاکستان کے مستقل حکمرانوں کے ٹھکانے ہیں اس علاقے کو G.O.R کہتے ہیں لاہور کا حسین ترین ٹکڑا ہے مگر عام آدمی اس کوچے کے سربستہ رازوں سے نا آشنا ہے بائیں طرف ایک سڑک مسلم لیگ ہاؤس تک جاتی ہے ''زاغوں کے تصرف میں ہے شاہیں کا نشیمن'' اسی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چوک سے بائیں جانب ایچی سن کالج شروع ہوتا ہے جس کا پرانا نام چیفس کالج تھا یعنی سرداروں کا کالج اس ادارے نے نہ ہی کوئی بہت بڑا سائنس دان پیدا کیا ہے اور نہ ہی عالمی سطح کا انجینئر، نہ ہی کوئی بہت بڑا ادیب اور نہ ہی کوئی بہت بڑا مفکر اس کے باوجود وسائل اور طاقت کے لحاظ سے ہر بڑا آدمی اپنے بچوں کو اسی کالج میں تعلیم دلانے کے خواب دیکھتا ہے۔ اب ہم لاہور کی مشہور نہر کے پل پر پہنچ گئے ہیں یہاں سے جیپ فراٹے بھرتی ہوئی فیروز پور روڈ کی طرف روانہ ہوگئی ہے ننگ دھڑنگ بچے نیم برہنہ جوان اور بوڑھے گرمی سے ستائے لوگ نہر میں غوطے لگا رہے ہیں پانی پر پھسل رہے ہیں میں نہر کے دونوں اطراف بنی ہوئی عمارتوں کو دیکھ رہا ہوں کوئی بھی اجنبی یہاں آکر دیکھے تو وہ کہہ اٹھے گا کہ پاکستان دنیا کا امیر ترین ملک ہے دونوں طرف سڑک پر فراٹے بھرتی ہوی بڑی بڑی کاروں سے اس کی آنکھیں چندھیا جائیں گی جن علاقوں کا میں ذکر کر چکا ہوں یہ میرے انتخابی حلقوں کا حصہ رہے ہیں اگر وہ اجنبی مال روڈ کی دکانوں کے ذرا پیچھے چلا جائے تو وہ ایک کوٹھڑی میں پانچ پانچ مکینوں کے رہنے کے طریقے دیکھ کر دنگ رہ جائے گا ایک کمرے کو کپڑا تان کر کئی حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے گلی کے درمیان گندے اور بدبودار پانی کی بہتی نہر ہوتی ہے جس کی سڑاند برداشت کرنا ناممکن ہوتا ہے یہاں پر رہنے والے کم غذا اور ناقابل برداشت ماحول کی وجہ سے بیمار ہو کر جلد مر جاتے ہیں۔

میں اب فیروز پور روڈ پر پہنچ گیا یہاں سے جیب موڑ کاٹ کر بائیں طرف چلنے لگی ہے مگر میرا ذہن ابھی تک نیو کیمپس کو بھولنے کے لئے تیار نہیں میں اپنی مادر علمی کے واقعات میں کھو گیا ہوں جیل کے راستے میں کلمہ چوک سے ہوتے ہوئے ماڈل ٹاؤن آجاتا ہے میری نظر میاں نواز شریف کے گھر کی طرف اٹھ جاتی ہے جس گھر کی طرف سارا پاکستان دیکھتا تھا آج اس کے مکیں وہاں پر قدم رکھنے کا حق بھی نہیں رکھتے دو بجے کے قریب واپس جیل پہنچ گیا ابھی کمرے میں داخل ہوا تھا کہ بتایا گیا باہر ملاقاتی آئے ہوئے ہیں واپس جا کر ان سے ملاقات کی جب ان کی تسلی تشفی ہوگئی تو واپس آگیا سات بجے تک سوتا رہا اٹھ کر ایک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گھنٹہ واک کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی کہ تالہ بندی کا اشارہ ہوا رات کو جلد سو گیا میں نے خواب میں دیکھا کہ بڑھیا کی ساری بکریاں شیر بن گئی ہیں لاٹھی سے بھی نہیں ڈرتیں بڑھیا بے بسی کی تصویر بنی ہوئی ہے خوف سے اس کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں آگے جا کر دیکھتا ہوں کہ چراوہے ابھی تک ایک دوسرے سے اسی طرح لڑ رہے مگر بھینسوں نے صلح کر لی ہے انہوں نے کمزور جانوروں کو چراگاہ سے بھگا دیا ہے وہ آرام اور سکون سے گھاس پر منہ مار رہے ہیں میری آنکھ کھل گئی سوچ رہا ہوں صبح ہوتے ہی کسی تعبیر بتانے والے سے اس کی تعبیر پوچھوں گا۔

والسلام

www.iqbalkalmati.blogspot.com

الوداع.............اکبر بگٹی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

27 اگست 2006ء (جمعرات)

میمونہ بی بی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

آج اخبارات پر نظر پڑی تو کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ شہ سرخیاں اکبر بگٹی کی ہلاکت کا اعلان کر رہی تھیں۔ میں کل تم سے مل کر کتنا خوش تھا، مجھے خوشیاں کیوں راس نہیں آتیں۔ نواب اکبر بگٹی کی موت مشرقی پاکستان کے سانحہ کے بعد بہت بڑا واقعہ ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کا گھاؤ گہرا ہوتا جائے گا۔ یہ زخم پاکستان کے لئے جان لیوا بھی ہو سکتا ہے۔ ان کی ہلاکت پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ (Establishment) کی ذہنیت کی عکاس ہے۔ جو کسی قیمت پر اپنے اوپر ہونے والی نکتہ چینی برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ جنرل پرویز مشرف نے اخبار نویسوں سے بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں اکبر بگٹی اور جاوید ہاشمی کو عبرت کی مثال بنا دوں گا۔ کاش! آج اکبر بگٹی کی جگہ مجھے تابوت میں بند کر کے اس پر تالے لگا کر دفن کیا جا رہا ہوتا تو پاکستان کو اتنا نقصان نہ پہنچتا۔ میں سمجھتا ہوں پاکستان کے دشمن بھی پاکستان کو اتنا نقصان نہیں پہنچا سکتے، جتنا نادان دوستوں نے پہنچایا۔ اکبر بگٹی کو جس طرح مارا گیا ہے کسی تہذیب یافتہ معاشرے میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا امریکہ نے بھی صدام حسین کے ساتھ وہ کچھ نہیں کیا جو ہمارے حکمرانوں نے اپنے ملک کے ایک بارسوخ سیاستدان کے ساتھ کیا۔

اس کا جسم سنگ مرمر سے تراشا ہوا کسی مجسمہ ساز کا شاہکار لگتا تھا وہ جب ٹینس کے لئے میدان میں اترتا تو ایسے لگتا کوئی یونانی دیو مالائی کردار اولمپک کی شمع روشن کر کے پہاڑوں کی چوٹی سے اتر رہا ہے۔ اسی کوٹ لکھپت جیل میں ہم نے کئی مہینے ایک ہی بارک میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اکٹھے گزارے یہ ذوالفقار علی بھٹو کا آخری دور تھا۔ جب میں جیل میں پہنچا تو معلوم ہوا نواب اکبر بگٹی کو سزائے موت کی کوٹھڑی میں الگ بند کیا گیا ہے۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر اور میں نے اس کوٹھڑی کا تالہ توڑا اور نواب صاحب کو اپنی بیرک میں لے آئے۔ یہاں پر محمود علی قصوری، خورشید محمود قصوری، ایس ایم ظفر، جسٹس عامر رضا اے خان اور دیگر قائدین تحریک بند تھے۔

اکبر بگٹی کی نیند کئی سالوں سے غائب تھی، جیل میں وہ رات دن جاگتے رہتے اور رات کو سونے والوں کی دلچسپ حرکات سے دوسرے دن آگاہ کرتے اور ہم مزے لے لے کر داستانیں سنتے۔ محفل میں نواب اکبر بگٹی سے ان کے ماضی کے بارے میں سخت سوالات کرتا تو وہ خندہ پیشانی سے جواب دیتے۔ ایک مرتبہ میں نے انہیں کہا کہ آپ کو بوچر آف بلوچستان (بلوچستان کا قصائی) کیوں کہتے ہیں؟ انہوں نے برا نہیں مانا اور اس کا تفصیلی جواب دیا کہ مریوں اور مینگلوں نے ان کے بھائی احمد نواز کو ان کی مرضی کے بغیر کابینہ میں شامل کیا مجھے اس وقت اس بات میں کوئی منطق نظر نہ آئی۔ مگر جب احمد نواز بگٹی ہمارے ساتھ MNA تھے۔ انہیں وزارت عظمٰی کی پیشکش ہوئی تو انہوں نے ٹھکرادی ہم نے اصرار کیا تو کہا! آپ نواب صاحب سے بات کرلیں۔ ہم نے کہا! آپ وزیر اعظم ہو گئے تو نواب اکبر بگٹی صاحب کو اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے، کہنے لگے! وزارت عظمٰی کے بعد میں نے سردار کے علاقے میں رہنا ہے، آپ کیوں میری جان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ میں نواب اکبر بگٹی کے صاحبزادے سلیم بگٹی کے ساتھ MNA تھا، پھر نواب صاحب MNA بن کر آئے تو ان کے ساتھ مل کر کام کیا۔ ان کا داماد ہمایوں مری میرے بہترین دوستوں میں سے ہے۔ ان کا بھانجا طارق کھیتران طالب علمی کے دور سے میری قیادت میں کئی تحریکوں میں حصہ لے چکا ہے، اب ان کے داماد شاہد بگٹی سے بھی پارلیمنٹ میں مل کر کام کیا ہے۔

میں نے پہلی مرتبہ نواب اکبر خان بگٹی کو لاہور کے میو ہسپتال کی ڈیوڑھی میں سٹریچر پر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لیٹے ہوئے دیکھا تھا یہ 1968ء کی بات ہے ایوب خان کے چل چلاؤ کا زمانہ تھا۔ اکبر بگٹی کو سانس کی نالی کے ذریعے خوراک پہنچانے کے لئے ٹونٹیاں لگی ہوئی تھیں جو ناک کے ذریعے اندر کو جارہی تھیں معلوم ہوا انہوں نے جیل میں بطور احتجاج بھوک ہڑتال کی ہے اور اڑسٹھ روز سے منہ سے خوراک لینے سے انکار کیا ہوا ہے اس وقت یہ شخص مجھے بہت پراسرار لگا تھا بعد میں وہ رہا ہو گیا میں اس کے بیانات پڑھتا رہتا تھا وہ صوبائی خودمختاری سے بڑھ کر مطالبات کرنے لگا اور پھر اس نے ڈھاکہ جا کر شیخ مجیب الرحمٰن کو اپنی ہر قسم کی مدد کا یقین دلایا جس پر اس کے اپنے صوبے کے ساتھیوں عطاء اللہ مینگل، خیر بخش مری اور غوث بخش بزنجو میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ جب غوث بخش صوبے کے گورنر اور عطاء اللہ مینگل وزیر اعلیٰ بنے تو انہوں نے اکبر بگٹی کے چھوٹے بھائی احمد نواز بگٹی کو اپنی کابینہ میں وزیر بنا لیا یہ بات قبیلے کے سردار کے ناقابل برداشت تھی انہوں نے صوبائی حکومت کی بھرپور مخالفت شروع کر دی اور بطور احتجاج لندن میں جلاوطنی اختیار کر لی۔ جب قبیلے کے عمائدین انہیں منانے گئے تو انہوں نے کہا پہلے احمد نواز کا سر لاؤ تو میں واپس پاکستان آنے کو تیار ہو جاؤں گا۔ اسی دوران ذوالفقار علی بھٹو نے بلوچستان کی حکومت کو برطرف کر دیا سردار پہاڑوں پر چلے گئے فوج نے ان کی بغاوت کچلنے کے لئے آپریشن شروع کیا اسی دوران ذوالفقار علی بھٹو نے نواب اکبر بگٹی کو صوبے کا گورنر بنا کر گورنر راج قائم کر دیا۔ یہ اشتراک زیادہ دیر نہ چل سکا بھٹو اور بگٹی میں اختلاف شدید ہو گئے۔ اکبر بگٹی نے گورنر شپ سے استعفیٰ دے دیا اور بھٹو کے سیاسی حریف ایئر مارشل اصغر خان کی جماعت تحریک استقلال میں شمولیت اختیار کر لی میں بھی تحریک استقلال کی مرکزی مجلس عاملہ کا رکن تھا اس طرح نواب اکبر بگتی کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقعہ ملا۔

نواب اکبر خاں بگٹی شروع دن سے ہمارے ملک کا متنازعہ سیاسی کردار رہا ہے۔ ان پر بارہ سال کی عمر میں قتل کا الزام لگا جس کی انہوں نے کبھی تردید نہیں کی لگ بھگ اسی عمر میں انہوں نے قائداعظم سے ملاقات کی اور قیام پاکستان کے وقت اپنا ووٹ دے کر بانیان

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پاکستان میں شمار کیے گئے ۔ 1952ء میں ان کے علاقے میں گیس کی تلاش کے لئے کنویں کھودے گئے تو انہوں نے دیگر سرداروں کے برعکس رکاوٹ بننے کی بجائے بھرپور تعاون کیا۔ آج اس گیس پر پاکستان کی معیشت کا دارومدار ہے وہ اپنے قبیلے کے لئے سخت گیر ہوتے گئے۔ مگر آخری دو سالوں کے علاوہ کوئی فرد گیس کی پائپ لائن کو نقصان پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا نہ ہی وفاقی حکومت کو اس پائپ لائن کی حفاظت کا سوچنا پڑا یہ ذمہ داری اکبر بگٹی کے کندھوں پر تھی اور انہوں نے بھرپور ذمہ داری کا مظاہرہ کیا۔ بلوچستان کے سرداروں کی سیاست میں پاکستان کے بارے میں کئی اتار چڑھاؤ آئے، جب ڈھاکہ میں فوجوں نے ہتھیار ڈالے اکبر بگٹی نے سخت بیان جاری کیا جب کہ عطاء اللہ مینگل نے کہا اگر خدانخواستہ پاکستان ٹوٹ گیا تو ہم بلوچستان کا نام پاکستان رکھ دیں گے چند روز بعد اکبر بگٹی وفاق کی حمایت کر رہا تھا اور عطاء اللہ مینگل غداری کے مقدمے میں جیل میں تھا۔ پھر منظر بدلا سردار بخش مری، عطاء اللہ مینگل روسی انقلاب کو خوش آمدید کہنے افغانستان میں روسی فوجوں کی جنگ میں عملی طور پر حصہ لے رہے تھے اور اکبر بگٹی پاکستان میں وفاق کی حمایت کر رہے تھے اکبر بگٹی کا بڑے سے بڑا دشمن بھی ان کو اپنے قبیلے اور صوبے کی سیاست میں زور آور کہہ سکتا ہے لیکن اسے پاکستان دشمن کا نام نہیں دے سکتا وہ عطاء اللہ مینگل کے ساتھ سکندر مرزا کی پارٹی میں رہے اکبر بگٹی وزیر دفاع اور وزیر داخلہ کے طور پر کام کیا گوادر کو پاکستان میں شامل کرانے کے لئے ان کا کردار مرکزی حیثیت رکھتا تھا ورنہ قطر کے حکمرانوں نے ہندوستان سے گوادر کا سودا کر کے کچھ رقوم بھی وصول کر لی تھیں اکبر بگٹی نے عرب حکمرانوں سے ذاتی اثر ورسوخ استعمال کر کے یہ سودا ختم کرایا۔ اکبر بگٹی کی بلوچستان کے سرداروں سے نہ بن سکی وہ اپنے سمدھی نبی بخش زہری کی جماعت جیوے پاکستان کو نیولے پاکستان کہتے تھے جمالی سرداروں کے بارے میں بھی ان کی رائے اچھی نہ تھی ان پر خان عبدالصمد اچکزئی کے قتل میں معاونت کا الزام بھی برسر عام دہرایا جاتا تھا۔ میری قلات کے حکمران نواب احمد یار خان صاحب سے کئی ملاقاتیں ہوئیں وہ بھی نواب اکبر بگٹی کو پسند

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نہیں کرتے تھے ان کا خیال تھا ان کی ریاست کے خاتمے کے وقت بگٹیوں کا کردار درست نہیں تھا نواب احمد یار صاحب کے بیٹے شہزادہ محی الدین بھی میرے ساتھ رہے ہیں وہ بہت محتاط گفتگو کرتے ہیں میں نے ان کے ہاں بھی اکبر بگٹی کے لئے کوئی نرم گوشہ محسوس نہیں کیا۔ اپنے قبیلے کے ساتھ ان کے بڑھتے ہوئے تنازعات ان کی سب سے بڑی غلطی تھی مگر عوام کے ووٹ پر ان کی گرفت آخری عمر تک قائم رہی۔ حکومت پاکستان نے ان کی آسائشات کا ہر طرح سے خیال رکھا، عوام سے ملاقاتوں کے لئے انہیں عمارتیں بنا کر دیں اور ان کی ہر خواہش پوری کرنے کے لئے ایڑھی چوٹی کا زور لگا دیا۔ آخری مرحلے میں حکمران جماعت کے صدر اور سیکرٹری جنرل نے ان سے تحریری مطالبات کی دستاویز حاصل کی مگر اس کے بعد بات چیت کے دروازے بند کر دیئے۔ اکبر بگٹی کا مطالبہ یہ تھا کہ ترتالیس چوکیدار گیس کے چھیاسی کنوؤں پر بھرتی کیے جائیں اور 142 بیروں (Waiters) کو جو بیس سال سے کام کر رہے ہیں مستقل کیا جائے۔

اکبر بگٹی کے بقول ذوالفقار علی بھٹو کوہلو کے مقام پر چوہدری ظہور الٰہی کو قتل کرانا چاہتے تھے مگر انہوں نے کہا کہ چوہدری صاحب ہمارے مہمان ہیں۔ چوہدری ظہور الٰہی نے بھی بارہا اس واقعہ کی تصدیق کی۔ عجیب اتفاق ہے کہ آج چوہدری شجاعت حسین کی حکمرانی کے دور میں نواب اکبر بگٹی سے ایسا سلوک روا رکھا گیا جس کا جواز تلاش کرنا بہت مشکل ہوگا۔

اکبر بگٹی کی سیاست سے اختلاف ممکن ہے مگر ان کی سیاسی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کیا جا سکتا، خاص طور پر ایسے حالات میں جب بلوچستان کو آگ و خون میں نہلا دیا گیا ہے۔ شاہراہیں محفوظ نہیں، ریل کی پٹڑیاں اور فوج کی چھاؤنیاں راکٹوں کی زد میں ہیں۔ ہمارے حکمرانوں کے ناعاقبت اندیشانہ فیصلوں نے ملک کی چولیں ہلا کر رکھ دیں ہیں۔ میں 26 اور 27 اگست کی درمیانی رات کو جلد سو گیا تھا اگر میں بیدار بھی ہوتا تو کیا کر لیتا۔ جیل میں خبر ایک دن کی تاخیر سے ملتی ہے۔ اگر خبر رات کو مل جاتی تو اکبر بگٹی کے غم کا جگراتا میرا ساتھ دیتا۔ وہ شخص چالیس سال نہیں سو سکا، اب ایسا سویا ہے کہ صرف شور محشر ہی اسے جگا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سکے گا۔ ایک اسی سالہ بوڑھے کو گرفتار کرنا اتنا مشکل کام نہ تھا، مگر حکمران تو اسے ڈاکٹر شازیہ کی عصمت دری کرنے والے فوجی میجر پر تنقید کا مزہ چکھانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ ملک بے شک ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے، قوم کی بیٹیوں کی عصمتیں لوٹی جائیں مگر وردی اور اس کی عصمت کا تحفظ تو ہو گیا۔

میمونہ بی بی شاید یہ نومبر 1971ء ہے میں ڈھاکہ شہر کے علاقے دھان منڈی میں ایک کوٹھی کے اندر کھڑا ہوں شیر جوان ہمیں سیڑھیوں پر لگے خون کے دھبے دکھا رہے ہیں وہ بتا رہے ہیں کہ کس طرح انہوں نے شیخ مجیب کے باڈی گارڈز کو زخمی کر کے شیخ صاحب کو فرار ہونے سے پہلے دبوچ لیا ویران گھر کے تمام رہائشی یا تو فرار ہو چکے ہیں یا گرفتار کر لیے گئے ہیں میں اپنے بہادر سپاہیوں کی داستان جرات سن رہا ہوں ان کے چہرے فتح مندی سے تمتما رہے ہیں صرف ایک ماہ بعد ان کی فتح شکست میں تبدیل ہو گئی۔

90 ہزار فوجی ہندوستان کی قید میں جان کی امان مانگ رہے تھے مجھے اکبر بگٹی کا مورچہ فتح کرنے پر ڈھاکہ کی دھان منڈی کیوں یاد آ رہی ہے بظاہر ان واقعات میں کوئی تسلسل نظر تو نہیں آتا۔

میمونہ بی بی تم نے اچھا کیا جو کوئٹہ جا کر ان کی خواتین کو پرسہ دیا تمہاری اس بات نے تو مجھے بھی رلا دیا کہ اکبر بگٹی کی بوڑھی بہنوں اور بیٹیوں کی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ تھیں ان کے آنسو خشک ہو چکے تھے آنسو ہوتے بھی تو اس آگ کو کیسے بجھا سکتے۔

والسلام

تمہارا والد

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیرو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

14 اکتوبر 2006ء

میمونہ بی بی!

السلام علیکم!

ڈاکٹر قدیر کی بیماری کا سن کر پہلے ہی بہت دکھی تھا اب پرویز مشرف صاحب نے جس طرح اپنی کتاب میں ان کی تضحیک کی ہے میرے زخموں پر نمک لگ گیا ہے معلوم نہیں اس احسان فراموشی کا عذاب کس کس کو لے ڈوبے گا۔

میری ڈاکٹر عبدالقدیر سے پہلی ملاقات ایک دوست کے توسط سے ان کے گھر پر 1977ء میں ہوئی وہ اتنے معصوم اور بھولے لگے کہ میں شک میں پڑ گیا کہ یہ شخص ایٹم بم بنا کر نہیں دے سکتا۔ ہم کسی کے خلاف فیصلے کرنے میں دیر نہیں لگاتے۔ جب دوسری تیسری ملاقات ہوئی تو اس پرعزم شخصیت کے اسرار مجھ پر کھلنے لگے۔ میں آہستہ آہستہ ان کا گرویدہ ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی مجھ پر اعتماد کرنا شروع کر دیا اور وہ اندرونی مشکلات اور رکاوٹوں کے بارے میں کھل کر مجھ سے بات کر لیتے۔ ملاقاتوں کا یہ سلسلہ طویل ہوتا گیا ذوالفقار علی بھٹو کا دور ختم ہو گیا اب ملک پر ضیاء الحق کی حکمرانی تھی شروع شروع میں ڈاکٹر صاحب کو ان سے معاملات میں پریشانیاں آئیں پھر حالات صحیح ڈگر پر چلنے لگے۔

ضیاء الحق جن دنوں ایٹمی دھماکے سے گریز کر رہے تھے ڈاکٹر صاحب کو سخت تشویش لاحق تھی یہ ایسے ہی تھا کہ کسی ماں کو بچہ کی پیدائش سے روک دیا جائے اور اسے اپنا بچہ پیدا ہونے سے پہلے موت کی وادی میں جاتا نظر آئے ڈاکٹر صاحب حکومت کے ڈلیوری سسٹم کے بارے میں تساہل کے بھی شاکی رہے۔ محمد خان جونیجو کے دور میں امریکہ کو صدر اور وزیر اعظم کے اختلافات سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ ملا اور ایٹمی پروگرام پر سوالیہ نشان لگ گیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

1988ء میں جب سرد جنگ کے خاتمہ کے قریب ضیاء الحق ایک فالتو چیز تھے ان سے چھٹکارا حاصل کرلیا گیا اور محترمہ بینظیر بھٹو نے عنان حکومت سنبھالی ان دنوں امریکی دباؤ اپنی آخری حدوں کو چھو رہا تھا اور ڈاکٹر قدیر کی جھنجھلاہٹ دیدنی تھی یورنیم کی افزودگی کے بارے میں اٹھنے والے سوالات سے پراسسنگ سست روی کا شکار ہونے لگی تو غلام اسحاق خان نے اسے سنبھالا دیا۔

محترمہ کی حکومت ختم ہوگئی میاں نواز شریف وزیر اعظم منتخب ہو گئے۔ N.P.T پر دستخطوں کے لئے امریکہ کا اصرار بڑھ گیا اور ساتھ ہی پاکستان پر دہشت گردی کی تلوار لٹکا دی گئی اس وقت کے صدر غلام اسحاق کی امریکی سیکرٹری ٹالبوٹ سے تلخ کلامی ہوگئی میاں نواز شریف نے بھی امریکی دباؤ کا مقابلہ جرأت مندی سے کیا اس طرح امریکی عزائم کو شکست ہوگئی اور ڈاکٹر عبدالقدیر ملاقاتوں میں خوش خوش نظر آئے۔

محترمہ بےنظیر کا دوسرا دور شروع ہوا تو (ڈلیوری سسٹم) کے حصول میں مزید پیش رفت ہوئی جب اسٹبلشمنٹ کو محترمہ کی حکومت کھٹکنے لگی تو انہیں اقتدار سے علیحدہ کر دیا گیا اور ایک غیر سیاسی نظام متعارف کرانے کی کوشش کی گئی جس کی ناکامی پر عام انتخابات ہوئے جس کے نتیجے میں میاں نواز شریف دوبارہ برسر اقتدار آ گئے۔ ہندوستان نے اسی دوران ایٹمی دھماکہ کر کے پاکستان کے لئے راستہ کھول دیا۔ میاں نواز شریف نے بین الاقوامی دباؤ کا دلیری اور جرات سے سامنا کیا انہیں اپنے ساتھیوں کی مخالفت کا بھی سامنا تھا لیکن انہوں نے تمام دشواریوں کو عبور کرلیا اور پاکستان دنیا کے نقشے پر ساتویں ایٹمی قوت کے طور پر ابھر کر سامنے آ گیا۔ ڈاکٹر قدیر کی محنت پھل ہوگئی۔

اس تمام عرصے میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان دنیا بھر کے میڈیا کا ہدف بنے رہے ان پر طرح طرح کے الزامات لگائے گئے مگر وہ مشن کی کامیابی کی طرف رواں دواں رہے انہیں بین الاقوامی اداروں کی طرف سے جان سے مار دینے کی دھمکیاں ملتی رہیں اپنوں کی بے اعتنائی نے حسد کی صورت اختیار کرلی مگر انہوں نے کسی چیز کی پرواہ نہ کی اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے ان کا نام صرف پاکستان میں ہی نہیں دنیا بھر کے مسلمانوں کے محسن کے طور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پر ہمیشہ زندہ رہے گا۔

میری ان سے آخری ملاقات 2001ء کو اسلام آباد کے فائیو سٹار ہوٹل میریٹ میں ہوئی یہ سعودی عرب کے قومی دن کی تقریب تھی۔ سعودی عرب کے سفیر نے افطار ڈنر کا اہتمام کیا ہوا تھا جس میں ملک بھر کے سیاسی، سفارتی اور فوجی زعماء شامل تھے۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان، مشاہد حسین سید اور اس وقت کے بحریہ کے سربراہ عزیز خان اور میں اتفاقاً اکٹھے ہوگئے ڈاکٹر صاحب نے ہمارے سامنے اپنا دل چیر کر رکھ دیا میں نے پہلی مرتبہ ان کے چہرے پر مایوسی اور خوف کے سائے دیکھے وہ کہنے لگے مجھے دھمکیاں دی جارہی ہیں کہ اگر تم ٹھیک نہ ہوئے تو تمہاری زندگی کی خیر نہیں انہوں نے ایک حساس ادارے کے افسر کا باقاعدہ نام لے کر کہا کہ اس نے کہا ہے ڈاکٹر قدیر کو میرے حوالے کردیں میں ایک ہفتے میں اسے سیدھا کردوں گا۔ ہم ایڈمرل عزیز خان کی طرف دیکھنے لگے انہوں نے اپنے لب سی لیے یہ اس وقت کی بات ہے جب ابھی تک امریکہ نے ڈاکٹر صاحب کے بارے میں کسی قسم کے خدشات کا اظہار نہیں کیا تھا وہ اپنوں کے ستم سہہ رہے تھے امریکہ کا مطالبہ بعد میں آیا یہ ڈاکٹر صاحب سے میری آخری ملاقات تھی میں جیل میں آگیا۔ میری گرفتاری کے کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر صاحب کو بھی حراست میں لے لیا گیا ان پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ گئے ان کی بیٹیاں اور اہل خانہ کو حوادث کے حوالے کردیا گیا کوئی اتنا احسان فراموش بھی ہوسکتا ہے یہ بات ناقابل یقین ہے۔

اب تو شمالی کوریا نے ایٹمی دھماکہ کردیا ہے ان کی بنیاد پلوٹونیم کے ذریعے افزودگی پر ہے جو پاکستان کے پروگرام سے بالکل مختلف پروگرام ہے۔

کل امریکہ نے ایک بیان جاری کیا ہے کہ ڈاکٹر قدیر کی ان کو مزید ضرورت نہیں رہی اور نہ ہی وہ انہیں کسی تفتیش کے لئے مطلوب ہیں، امریکہ تو ان کی صفائی میں بیان دینے پر مجبور ہوگیا انہوں نے ان پر مزید پابندیاں لگا دی ہیں ان کی بیٹیاں ان سے ملاقات نہیں کر سکتیں۔ محسن کش قیادتیں کب تک مکافات عمل سے بچی رہیں گی۔

والسلام

www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قندِ مکرر

بشریٰ کے نام

www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نا قابلِ معافی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سیکورٹی وارڈ) سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

20 جنوری 2004ء ایک بجے رات

میمونہ بی بی السلام علیکم! اُمید ہے مزاج بخیر ہونگے!

آج میں نے خط کے ذریعے، زندگی میں پہلی مرتبہ، آپ سے گفتگو کرنے کی کوشش کی ہے۔ تمام عمر میری ایک شخص سے جنگ رہی ہے، اِس کا نام جاوید ہاشمی ہے۔ اِسکے علاوہ مَیں نے پوری انسانیت سے محبت کی ہے۔ انسان تو انسان میں ایک چیونٹی کے مرنے پر افسردہ ہو جاتا ہوں اور کٹے ہوئے درخت دیکھ کر تو میری آنکھوں سے جھڑی لگ جاتی ہے۔

مجھے تمام مذاہب خوبصورت لگتے ہیں۔ اسلام، عیسائیت، یہودیت، بدھ مت، ہندومت، میں سمجھتا ہوں کہ سبھی خدا کی وحدانیت کے قائل ہیں اور انسان کے ذہنی ارتقا میں مجموعی طور پر ان مذاہب نے اپنا کردار ادا کیا ہے۔ ان مذاہب کے پیروکاروں کے ایک طبقے نے انسانی ترقی کے راستے میں بڑی رکاوٹیں بھی کھڑی کی ہیں اور یہ حقیقت بھی مسلمہ ہے کہ مذہب کے نام پر جتنا خون بہایا گیا، شاید روئے زمین پر کسی اور تنازعہ پر نہ بہایا گیا ہو۔ مگر اسکے باوجود مذاہب نے معاشروں کو حیوانیت سے نکال کر اعلیٰ و ارفع مقاصد کیلئے Define اور Refine کیا اور اسے حدود و قیود کے اندر رہ کر آزادی، جرأت اور بے باکی کے اوصاف سے مزین کر کے منظم کیا۔

دُنیا کی تمام تہذیبیں میری وراثت ہیں۔ میں نے، بالواسطہ اور بلاواسطہ ان تہذیبوں سے اکتساب فیض کیا ہے۔ انسان کی معلوم تاریخ تو صرف چار ہزار سال تک محدود ہے۔ اس سے پہلے نامعلوم معاشروں کے آثار بھی میری رہنمائی کرتے ہیں۔ میں ان تہذیبوں کی اہمیت اور افادیت کا قائل ہوں، کسی ایک تہذیب کی بالادستی کا نہیں۔ رنگ و نسل اور علاقے پر تفاخر بڑی جہالت کی بات ہے۔ ہر تہذیب نے دوسری تہذیب اور ہر رنگ و نسل نے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دوسرے رنگ و نسل، حتیٰ کہ انسان نے جانوروں، پرندوں اور چرندوں کے طرز معاشرت سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ رنگوں کے امتزاج، نباتات کی بوقلمونی، سمندروں کی وسعت اور گہرائی، پہاڑوں اور دریاؤں نے انسانی مزاج کو ڈھالنے اور تراشنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس لئے میں کرہ ارض کے ہر ذرے سے محبت کرتا ہوں اور اس کا مقروض ہوں۔

میری زندگی کے تجربات اور مطالعہ نے مجھے اس نتیجے پر پہنچایا ہے کہ اسلام معراج انسانیت، انسانی مساوات، انصاف، امن اور معاشی و معاشرتی بہبود کا سب سے بڑا ضابطہ حیات ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی زندگی کمزور ترین لمحات میں بھی میرے لئے قوت اور طاقت کا منبع ہے۔ اس جنون نے مجھے ہمیشہ منزلوں سے ہمکنار کیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عرفان (VISION) اور امام حسین رضی اللہ عنہ کی استقامت میرا سرمایہ حیات ہیں۔

پاکستان نہ صرف میری محبت ہے بلکہ کمزوری بن گیا ہے۔ میں اس سرزمین کو نئے دور کے انسانوں کی آرزوؤں اور امنگوں کی تکمیل کا مرکز سمجھتا ہوں۔ غریب اور مظلوم طبقات کی سربلندی کیلئے جدوجہد ہی میرے ایمان کو مکمل کرتی ہے۔ میں جہدِ مسلسل کو زندگی سمجھتا ہوں۔ جب میں ان مقاصد کو حاصل کرنے کیلئے اپنے آپ میں کم کوشی، کم نظری اور کوتاہی پاتا ہوں تو اس شخص سے جنگ میں شدت آجاتی ہے اور احتساب کے اس عمل میں معافی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ میں ہر دوسرے انسان کی غلطی فوراً معاف کر دیتا ہوں لیکن صرف ایک شخص ناقابل معافی ہے، جو تمہارا باپ ہے۔

والسلام!

تمہارا باپ!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فیوڈل اِزم اور بلدیاتی نظام، ایک چہرہ دو رُخ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

25اپریل2004ء

گوانتانامو بے سیکورٹی سیل

سنٹرل جیل اڈیالہ راولپنڈی

بُشریٰ بی بی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

فیوڈل ڈھانچے میں بلدیاتی نظام کو اہم مقام حاصل ہے۔ غیر نمائندہ حکومتوں کیلئے یہ نظام نعمتِ غیر مترقبہ بن جاتا ہے۔ میں بلدیاتی نظام کا حامی ہوں لیکن تقسیم اختیارات کا (Decentralization) کا جو فارمولا موجودہ حکومت نے دیا ہے اس سے متفق نہیں ہوں۔ موجودہ نظام، اختیارات کو صوبے میں رہنے دیتا ہے نہ مرکز میں۔ یہ صرف ایک شخص کو مضبوط کرتا ہے۔ اس طریقہ کار سے بلدیاتی نظام کی افادیت ختم ہوگئی ہے اور اقتدار پر فیوڈل لارڈ اور فوجی حکمران کی گرفت مضبوط۔

میں اختیارات کو نچلی سطح پر لے جانے کا پرزور حامی ہوں۔ میں نے ستمبر 1986ء میں تقریباً 18 سال پہلے عدم مرکزیت کا جو فارمولا پیش کیا تھا وہ اسمبلی کے ریکارڈ پر موجود ہے۔ اُس کے الفاظ یہ ہیں۔ ''تیسرا فارمولا جو میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہر ضلع پر مقامی حکومت قائم ہونی چاہیے اور اِس کا براہِ راست منتخب (Directly Elected) نمائندہ ہونا چاہیے۔ جس میں ڈی سی اور ایس پی کو اس کا ماتحت کیا جائے تاکہ ذمہ داری براہِ راست عوامی نمائندہ پر آسکے۔ ہر ضلع کے اندر اگر ہم اس طریقے سے انتخاب کروائیں گے تو جو نمائندگی ملے گی، اِس کے حوالے سے مقامی سطح پر امن و امان کی صورتحال کو کنٹرول کیا جاسکے گا''۔

یہ اٹھارہ سال پہلے کا فارمولا ہے۔ چودہ سال پہلے 90ء کی اسمبلی میں وزیراعظم نے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مقامی حکومتوں کو اختیارات کی منتقلی کے لئے میری سربراہی میں ایک کمیٹی بنائی۔ہم نے اپنی سفارشات میں لکھا کہ ضلع حکومت میں ضلعی گورنر کا براہِ راست انتخاب کیا جائے اور ضلع اسمبلی قائم کی جائے۔

موجودہ حکومتی نظام برٹش راج کا تسلسل ہے۔عوام کو اختیار منتقل نہیں کیا گیا۔ہمارے فوجی حکمران ہمیں 2ہزار سال پہلے والی یونان اور روم کی جمہوریت دینا چاہتے ہیں،اگر ضلع گورنر کو اختیار مل جائیں تو فیوڈل مضبوط ہونے کی بجائے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر کے اپنی زرعی ترقی پر توجہ دے گا اور متوسط طبقے کی قیادت جنم لے گی۔فیوڈل ازم کے خاتمے سے زرعی پیداوار میں اضافہ ہوگا۔جیسے امریکہ اور دوسرے ملکوں کے بڑے فارم موجود ہیں مگر اب انہیں لوگوں کو غلام بنانے کیلئے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

بد قسمتی سے شہری آبادی اور دانش وروں کا طبقہ فیوڈل اور ان کی طرز زندگی سے نفرت کی وجہ سے پورے زرعی نظام کو مسترد کر دیتا ہے۔ہمارے دانشوروں،کالم نگاروں، شاعروں،ادیبوں اور اخبار نویسوں کی بھاری تعداد کا تعلق دیہی معاشرے سے ہے۔ شہروں کی چکا چوند انہیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔وہ اپنی محرومیوں اور ناراضگیوں کی وجہ سے اپنے دیہی ماضی کو بھول جانا چاہتے ہیں اور پورے دیہی معاشرے سے لاتعلق ہو جاتے ہیں اور یہ لاتعلقی دیہات کے رہنے والوں کو بے یار و مددگار چھوڑ دیتی ہے۔ان کے علاقے کا کوئی فیوڈل ان کیساتھ عزت سے پیش آئے تو وہ انہیں فرشتہ لگتا ہے۔متوسط طبقے کی قیادت دانشوروں کی تنقید کی زد میں ہوتی ہے،اس کی کسی غلطی کی معافی نہیں ہوتی۔

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بیچارہ نہ مُلا ہے نہ زاہد نہ حکیم

چھوٹا زمیندار اور کسان زراعت میں ریڑھ کی ہڈی ہے۔اس کی محنت پر پورا ملک پل رہا ہے اور وہ خود قرضوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔اپنے بچوں کو سکول نہیں بھیج سکتا۔اس کا تمام خاندان عورتوں اور بچوں سمیت صبح و شام کھیتوں میں کام کرتا ہے مگر وہ پھر بھی خطِ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

غربت سے نیچے زندگی گذار رہا ہے۔

یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ انگریزوں اور اس کے بعد آنے والے آمروں نے بلدیاتی نظام اور جاگیرداری کے ذریعے غلامی کی زنجیریں مضبوط کیں، حالانکہ یہی نظام کاؤنٹی سسٹم کے نام پر برطانیہ میں جمہوریت کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ نئی قیادت پیدا کرتا ہے، جمہوری عمل کی بالیدگی کا باعث بنتا ہے۔ اس کے ذریعے تمام اختیارات نچلی سطح پر پہنچ جاتے ہیں اور "تقسیم اختیارات (Decenterali Zation)" کا عمل مکمل ہو جاتا ہے۔

امریکہ میں بھی اس نظام کی برکت سے خانہ جنگی کا خاتمہ ہوا اور امن وامان قائم ہوا۔ اس سے ذمہ دار شہری (Responsible Citizen) کا تصور اُجاگر ہوا۔ تمام پاکستانی آمروں نے بلدیاتی انتخابات کرائے اور جمہوری حکومت نے حتی الوسع اس سے احتراز کیا۔ انگریزوں اور آمروں نے اس نظام آمریت کو مضبوط کرنے کیلئے بلدیاتی اداروں کو سیڑھی کے طور پر استعمال کیا اور تابعدار قیادت پیدا کی۔ دیسی حکمرانوں نے انگریزوں کے اس نسخہ کو کامیابی سے استعمال کیا۔ ضلعی سطح کی قیادت کو ڈپٹی کمشنر کے ذریعے کنٹرول کرنا آسان تھا اور یہ ضلعی قیادتیں، اپنے مخالفین کو کنٹرول کرنے کیلئے ڈپٹی کمشنر، علاقائی کور کمانڈر اور کمشنر کی سرپرستی کو اپنی خوش قسمتی تصور کرتی تھیں۔ کمشنر ان اداروں کو توڑنے کا قانونی حق رکھتے تھے۔ اس جکڑ بندی میں کوئی قومی قیادت جنم کیسے لے سکتی تھی؟

120 سال سے ہر ضلع میں ایک یا دو خاندان سیاسی منظر پر چھائے ہوئے ہیں، جن کے پاس انگریز کی دی ہوئی جاگیر اور خطاب ہیں اور جنگ عظیم اول اور دوم میں جبری بھرتی کے ذریعے فوجی فراہم کرنے کا سرٹیفکیٹ اور اس بھرتی کی وجہ سے ان کے پاس کرنل یا میجر کا اعزازی عہدہ ہو تو یہ نجیب الطرفین ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

پاکستان کے قیام نے بھی اس غلامی کی جکڑ بندی کو نہ صرف برقرار رکھا ہے، بلکہ اسے اور مضبوط بنا دیا ہے۔ انگریز چونکہ یہاں کا رہنے والا نہیں تھا، ایک حد تک اپنے آپ کو برتر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

(Superior) اور حاکم رہنے کا بھرم قائم رکھتا تھا۔ آزادی کے بعد دیسی افسر شاہی، دیسی فوج اور دیسی فیوڈلز کے اتحاد نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی۔ عام آدمی کے جسم کے ساتھ ساتھ اس کے روح پر بھی قبضہ کرلیا گیا۔ انہوں نے دیہی اور شہری ترقی کا تڑکہ لگا کر انگریزوں کی دی ہوئی ترقی کی بھونڈی نقل اتارنے کی کوشش بھی جاری رکھی۔ بلدیاتی انتخابات کا اصل مقصد ضلعی سطح کی قیادت کے ذریعے قومی قیادت کے ابھرنے کا راستہ روکنا تھا۔

فوجی حکمران، سیاسی پارٹیوں سے خوفزدہ ہوکران پر پابندی لگاتے ہیں اور سیاسی عمل کو روک دیتے ہیں۔ لیکن بلدیاتی انتخاب اور بلدیاتی قیادت کو حقیقی جمہوریت کا نام دے کر قومی سوچ پیدا ہونے کا دروازہ بند کردیتے ہیں۔ فوجی حکمرانوں کے پاس ذہنی غلام پیدا کرنے کا یہ مجرب نسخہ انگریزوں کا دیا ہوا ہے۔ اسے استعمال کرکے وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔

ترقی یافتہ دنیا میں قومی اور بلدیاتی انتخاب ایک دوسرے کے متبادل نہیں سمجھے جاتے بلکہ ایک دوسرے کے معاون سمجھے جاتے ہیں۔ بلدیاتی انتخاب کو نئی قیادت پیدا کرنے کی نرسری کہا جاتا ہے۔

اسی طرح نا تجربہ کار جمہوری قیادتیں بلدیاتی انتخابات سے خوفزدہ ہوکر انہیں اختیارات نہیں سونپنا چاہتیں اور تجربہ کار ڈکٹیٹران اداروں کو اپنی آمریت کی مضبوطی کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ انہیں ہر غیر آئینی اقدام کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ریفرنڈم کرانا ہو، اپنی حکومت کا جواز فراہم کرنا ہو، ان اداروں کی قیادت اور مالی وسائل بے دریغ استعمال کئے جاتے ہیں اور انہی وفاداروں کو اسمبلیوں کی سیٹیں اور وزارتیں دے دی جاتی ہیں اور ان کی کامیابی کیلئے تمام حکومتی مشینری سرگرم عمل ہوجاتی ہے۔ چونکہ ان تینوں نظاموں یعنی فوجی حکمرانی، افسر شاہی اور فیوڈل ازم کا بانی انگریز ہے، یہ تینوں اس کے ممنونِ احسان ہیں اور ذہنی طور پر نوآبادیاتی نظام کے جانشین۔ نوآبادیاتی نظام کا کل پرزہ ہونے کی وجہ سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انہیں صرف کنٹرول کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ معاشرتی اصلاحات اور معیشت کے جدید تقاضے ان کے ذہن کے کمپیوٹر میں فیڈ نہیں کیے جاتے، نہ ہی یہ اسے اپنی ذمہ داری کا حصہ سمجھتے ہیں۔ تم نے اپنے تھیسز (Thesis) کے بارے میں کچھ بھی نہیں لکھا۔ مجھے، تفصیلاً، تمام امور سے آگاہ کرو۔

والسّلام!

تمہارا والد!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

افسر شاہی .... نوکر شاہی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

2 مئی 2004ء

گوانتاناموبے سیکورٹی سیل

سنٹرل جیل اڈیالہ راولپنڈی

بُشریٰ بی بی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

لارڈ میکالے نے ہندوستان پر مکمل کنٹرول حاصل کرنے کیلئے تعلیمی نظام کا نصاب تیار کیا تھا۔ جس کے مقاصد میں لارڈ میکالے نے کہا کہ "برٹش راج کی مضبوطی کیلئے مقامی لوگوں کو ایک حد تک شامل کرنا ہماری مجبوری ہے، اس لئے انہیں ایک محدود سوچ کی تعلیم دے کر اپنے مقاصد کیلئے استعمال کیا جائے۔ "اس مقصد کیلئے ایک غلام ذہن کی بیورو کریسی تیار کی گئی، جو اپنے لوگوں سے اپنے آپ کو الگ کر کے خود کو بالادست سمجھتی تھی۔ انگریزوں نے تحریک آزادی کو کچلنے کیلئے اس سول اور ملٹری بیوروکریسی کو خوب استعمال کیا۔ یہ صرف اپنے آپ کو انگریزوں کے سامنے جوابدہ سمجھتی تھی۔ آزادی کے بعد بیوروکریسی اپنے آپ کو کسی کالے وزیر اعظم، وزیر اعلیٰ یا ضلعی قیادت کے سامنے جوابدہ نہیں سمجھتی، بلکہ اپنے آپ کو ان سے برتر (Superior) سمجھتی ہے۔

لارڈ میکالے نے 2 فروری 1835ء میں برطانوی پارلیمنٹ میں جو تقریر کی، وہ مختصر، مگر جامع تھی۔ اُنہوں نے کہا! "معزز اراکینِ پارلیمان میں نے ہندوستان کے طول و عرض میں بار بار سفر کیا ہے۔ دِنوں اور راتوں میں گھوما اور پھرا ہوں میری آنکھیں آج تک ایسے شخص کو دیکھنے کیلئے ترستی ہیں جو یہاں بھکاری ہو یا جو لٹیرا ہو۔ اِس مُلک میں ایسی دولت دیکھی ہے، ایسی بُلند اخلاقی قدریں دیکھی ہیں اور اِتنی بڑی ہستیوں سے ملا ہوں کہ مجھے پختہ یقین ہو گیا ہے کہ ہم کبھی اِس ملک کو فتح نہ کر سکیں گے، جب تک کہ ہم اِس قوم کی ریڑھ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی ہڈی نہ توڑ دیں، اِس قوم کی ریڑھ کی ہڈی کیا ہے؟ اِنکا روحانی اور تہذیبی ورثہ! یہی وجہ ہے کہ میں با آواز بلند تجویز پیش کرتا ہوں کہ ہم انکا نظام تعلیم اور انکی ثقافت بدل کر رکھ دیں۔ دیکھنے میں خواہ کہ یہ لوگ گندمی یا سانولی رنگت رکھتے ہوں لیکن انکے سینوں کے اندر سفید فام انگریز کا دِل دھڑکتا ہو، اگر ہم انہیں یہ یقین دلا سکیں کہ ہر وہ چیز جو غیر ملکی اور ہر وہ چیز جو انگریزی ہے وہ انکی چیزوں سے بہتر ہے تو ہندوستانی بہت جلد اپنی نظروں میں گر جائیں گے اور اپنے قدیم کلچر کو چھوڑ دیں گے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اِس طرح جلد ایسا وقت آ جائیگا اور وہ ایسے بن جائینگے، جیسے ہم چاہتے ہیں وہ "براؤن صاحب" کہلانے میں فخر محسوس کر سکیں گے اور اِس طرح وہ صحیح معنوں میں ہماری مفتوحہ اور باج گذار قوم بن کر زندگی کے دِن پورے کرنے لگیں گے۔

چند مستثنیات کو چھوڑ کر فوج اور افسر شاہی عموماً لوئر مڈل کلاس سے آتی ہے۔ اس لئے اقتدار پر اس کی نگاہیں حریصانہ ہوتی ہیں۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنے آپ کو انگریزی ثقافت میں رنگ کر حکمران نظر آئیں۔ اعلیٰ طبقے میں شمولیت کیلئے زمین اور جاگیر کو ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ چونکہ بلدیاتی سطح کے فیوڈلز سے بالادست ہوتے ہیں۔ فیوڈلز روایتی چاپلوسی سے انہیں اپنی کلاس کا حصہ تسلیم کر لیتے ہیں۔ یہ گلی ڈنڈا کھیلتے کھیلتے ایک دم لان ٹینس اور گالف کے گراؤنڈ میں پہنچ جاتے ہیں۔ قوم کے خزانے کو لوٹنے کے قواعد بناتے ہیں، آرام دہ بنگلوں میں مغل شہزادوں کی طرح رہتے ہیں، پلاٹ اور زمینیں الاٹ کراتے ہیں، حتیٰ کہ آغا شاہی جیسا دانشور بھی فیوڈل لارڈ بن جاتا ہے۔

تمام بیوروکریٹس، چند مستثنیات کو چھوڑ کر، اپنے بچوں کو باہر کی یونیورسٹیوں میں تعلیم دلواتے ہیں۔ ان پر اٹھنے والے اخراجات کہاں سے آتے ہیں۔ اس کے لئے وہ اپنے آپ کو کسی کے سامنے جواب دہ نہیں سمجھتے۔ ان میں سے اکثر بچے وہیں رہ جاتے ہیں۔ نو آبادیات ان کے ذہن سے نہیں نکل سکی۔ لندن ابھی تک ان سب کا محور و مرکز ہے۔ سال میں گرمیوں کی چھٹیاں سرکاری خرچ پر مغرب میں منانے کا کوئی نہ کوئی راستہ تلاش کر لیتے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں۔اس طرح فیملی کو اکٹھے مل بیٹھنے کا (Reunification) موقع بھی مل جاتا ہے۔

اسلام آباد کے سیکرٹریٹ میں بیٹھ کر کام کرنے کی بجائے، بیوروکریٹ اپنے اور اپنے بچوں کے مستقبل بنانے پر زیادہ وقت صَرف کرتے ہیں۔باقی وقت اپنی پروموشن اور بہتر سیٹ پر تبادلے کیلئے پبلک ریلیشنگ پر خرچ کرتے ہیں۔پھر بھی وقت بچ جائے تو اسے ملکی سیاست میں کیڑے نکالنے پر لگاتے ہیں۔ریٹائرمنٹ کے بعد سادھو اور اللہ لوگ بن جاتے ہیں۔ایک دوسرے کو مافوق الفطرت ثابت کرنے کیلئے مضامین اور کتابیں لکھواتے ہیں۔قوم کی بدقسمتی ہے کہ اتنے "ماہرین" کی موجودگی میں خزانے کا ماہر باہر سے درآمد کیا جاتا ہے۔ہرفن مولا کا محاورہ انہی کیلئے گھڑا گیا ہے۔ایک دن سائنس اور ٹیکنالوجی کے مسائل حل کررہے ہوتے ہیں، دوسرے دن امورِ حج اور زراعت کے انچارج ہوتے ہیں، تیسرے دن ملکی تجارت چلا رہے ہوتے ہیں، چوتھے دن قوم کی صحت کے نباض ہوتے ہیں، پانچویں دن امورِ داخلہ میں سربراہِ حکومت ہوتے ہیں اور چھٹے دن کھیلوں اور ثقافت کا قبلہ درست کررہے ہوتے ہیں۔اگر اتوار کی چھٹی نہ ہو تو ایٹم بم بنانے کا نیا فارمولا تیار کر کے دے سکتے ہیں۔ایٹم بم بنانے والے بھی ان کے زیردست ہوتے ہیں۔آئین میں ترمیم ہوسکتی ہے یا اسے توڑا جاسکتا ہے مگر انگریز کے دیئے ہوئے سول سرونٹس کے ڈھانچے میں تبدیلی ناممکن ہے۔ڈاکٹر، انجینئر، سائنسدان اور اساتذہ کی ان کے سامنے کوئی حیثیت نہیں۔

جمہوری نظام میں اسمبلیوں کے بعد یونیورسٹیوں کا پالیسی ساز اداروں میں کنٹرول ہوتا ہے۔پاکستان میں عملاً بیوروکریسی ہی پالیسی ساز بن گئی ہے۔سول سرونٹس کا اُردو ترجمہ عوام کا نوکر یا عوام کا خادم ہے۔انگریز قوم اور ان کے افسروں کو یہ لفظ منہ سے نکالتے ہی اپنی حیثیت کا احساس ہوجاتا ہے۔مگر غلاموں کی دنیا میں عوام غلام ہیں اور دفتر میں بیٹھا ہوا "صاحب بہادر" ہے۔یہ ٹیڑھے منہ سے انگریزی بول کر منہ میں سگار دبا کر اور مہنگے ترین لباس اور جوتے پہن کر اپنے آپ کو اصل حکمران، یعنی انگریز، سمجھتے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بیوروکریٹس سیکرٹریٹ میں بیٹھ کر 100 سال پرانی بنائی گئی سمری پر انگریزی میں مکھی پر مکھی مارتے رہتے ہیں اور اسی کو صلاحیت اور قابلیت کی معراج سمجھتے ہیں۔ جدید خیالات، جدید معاشی اصلاحات اور جدید معاشروں کی تشکیل سے ان کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

فیوڈل، جنرل اور بیوروکریٹ تینوں اپنی بقائے باہمی کے اصول پر کاربند رہتے ہیں، ملک اور عوام ان کی آماجگاہ ہوتے ہیں، ملک آزاد رہے یا غلام، انہیں اس سے کوئی غرض نہیں، انہیں معلوم ہے کہ ہر فاتح کو ان کی ضرورت ہوگی، عراق میں صدام چلا گیا، اس کی فوج پولیس اور بعث پارٹی امریکہ کی ضروریات پوری کر رہی ہیں۔ بیوروکریسی کا رویہ بدلنے کیلئے بھی جمہوریت کا مضبوط ہونا نہایت ضروری ہے۔ تمہاری والدہ کیسی ہیں، مجھ سے اُن کا کوئی رابطہ نہیں۔

والسلام!

تمہارا والد!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فیوڈل مسٹر کلین (Mr Clean) ہوتا ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

25 مئی 2004ء

گوانتانامو بے سیکورٹی سیل

سنٹرل جیل اڈیالہ راولپنڈی

بخشی جی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

تم کہتی ہو متوسط طبقے کے سیاستدانوں پر الزامات کیوں لگتے ہیں؟ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ متوسط طبقے کے لیڈر عوام میں سے آتے ہیں۔ اسلئے ان کی کوئی چیز بھی عام آدمی سے چھپی ہوئی نہیں ہوتی، وہ اگر سائیکل سے بیجارو پر اور چھوٹے سے بڑے مکان میں آجائے تو تنقید کی زد میں ہوتا ہے۔ یہ ایک اچھی بات ہے، اسے اپنے طرزِ زندگی کی جوابدہی کرنا پڑتی ہے اور وہی قیادت اُبھرتی ہے جو عوام کو اپنے اعمال کے بارے میں مطمئن کرتی ہے۔ متوسط طبقے کی قیادت ہی ملک کو دلدل سے نکال سکتی ہے، اسے معاشرے کے سخت احتسابی شکنجے کا سامنا کرنے کیلئے خود کو تیار کرنا چاہیے۔

سول اور ملٹری بیوروکریسی اور فیوڈل کی زندگی سینکڑوں پردوں کے اندر ہوتی ہے۔ ملک کے تمام قوانین ان کی معاشی بداعمالیوں کی پردہ پوشی کرنے کیلئے بنائے جاتے ہیں، اسلئے ملک کو صحیح قیادت نصیب نہیں ہو سکی۔ فیوڈل تو پیدائشی طور پر ہی مسٹر کلین (Mr. Clean) ہوتا ہے۔ اس کے آباؤ اجداد نے قوم کو بیچ کر جو جاگیریں حاصل کی ہوتی ہیں، وہ اس کے گناہوں میں شمار نہیں کی جاتیں۔ متوسط طبقہ کے لوگ یا وہ نسلیں جنہوں نے غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف بغاوت کی تھی، ہر سال اپنی محدود زمینوں سے بھوک کی فصل اٹھاتے ہیں۔ انگریزوں کی غلامی کا صلہ پانے والے ہر سال پہلے سے زیادہ سونے اور جواہرات سے اپنی تجوریوں کو بھرتے ہیں، انہیں بھلا کون موردِ الزام ٹھہرا سکتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فیوڈل کے تمام جرائم ضلعی انتظامیہ کی سرپرستی میں پروان چڑھتے ہیں۔ ضلعی انتظامیہ اسے مضبوط اور محفوظ کرنے کیلئے رات دن کام کرتی ہے۔ اس کا ٹکراؤ مقامی انتظامیہ سے نہیں ہوسکتا۔ اپنے لوگوں پر جبر کرنے کیلئے وہ ضلعی انتظامیہ کی تابعداری کرتا ہے۔ فیوڈل زرعی اصلاحات کی زد میں آئی ہوئی غریب کسانوں کی زمینیں اپنے اگلے بیس سال میں پیدا ہونے والے بچوں کے نام کراتا ہے۔ اس میں وہ کوئی شرمندگی بھی محسوس نہیں کرتا۔ قانون اس طرح بنایا جاتا ہے جو فیوڈل ازم کا مددگار ہو۔ اپنی زمینوں کو سرکاری مشینری سے آباد کرتا ہے۔ یہ مشینری، بظاہر، غریب کسانوں کیلئے قومی خزانے سے خریدی جاتی ہے۔ خزانے میں رقم بیرونی قرضوں کے ذریعے آتی ہے، قرضوں کا بوجھ غریب پر آجاتا ہے۔ اپنی فصلوں کی دُگنی قیمت سرکار سے وصول کرتا ہے؟ منڈی کا ریٹ مصنوعی طور پر بے تحاشا بڑھا دیا جاتا ہے۔ عام کسان بیچارہ یہ ریٹ خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتا۔ سیاسی اثر و رسوخ سے نہری پانی، ناجائز ذرائع سے، حاصل کر کے بے آباد زمینوں کو کوڑیوں کے مول خرید کر کروڑں کی ملکیت میں بدل دیتا ہے۔ سرکاری ناجائز پانی سے باغات پیدا کرتا ہے اور ناجائز ذرائع سے اسے سونے کی کان میں بدل لیتا ہے۔ سرکاری سرپرستی میں ٹیل والے کسانوں تک پانی نہیں پہنچتا۔ سڑکیں اپنی زمینوں پر بنواتا ہے، ہسپتال اپنی زمین پر بنوا کر جانوروں کے باندھنے کیلئے استعمال کرتا ہے۔ اپنے حلقے پر گرفت رکھنے کیلئے تھانہ، کچہری اور عدالت میں چوروں، ڈاکوؤں اور جرائم پیشہ افراد کی سرپرستی کرنا اس کی مجبوری ہوتی ہے۔ اختلاف رائے رکھنے والے مظلوموں کو اتنا خوفزدہ کر دیتا ہے کہ ان کی نسلیں بھی اس کے مخالف کو ووٹ دینے کی جرأت نہیں کرسکتیں۔

جب حکومت میں ہوتا ہے تو سرکار کے تمام وسائل اپنے ذاتی مقاصد کیلئے استعمال کرتا ہے۔ سرکاری نوکریاں بغیر میرٹ کے تقسیم کرتا ہے اور اس طرح کی بھرتی سے مقامی انتظامیہ کا محسن بن جاتا ہے، ان کی ترقی اور تبادلہ اسی کی سفارش پر ہوتا ہے۔ ان تمام مفادات کے تحفظ اور اپنے جرائم پر پردہ ڈالنے کیلئے اقتدار میں رہنا اس کی مجبوری ہوتی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔ اپنی معاشی حیثیت کو مستحکم کرنے کیلئے فیوڈل اب سیڈ مافیا (Seed Mafia) کا حصہ بن گیا ہے۔ سرکاری محکمے اپنی تحقیق کی تکمیل کے آخری مراحل میں کسانوں کی یہ امانت بڑے زمینداروں کو دے دیتے ہیں۔ بازار میں نایاب ہو جانے کیوجہ سے فیوڈل اسکا خوب فائدہ اٹھاتا ہے اور وہ سو روپے کی لاگت سے چار ہزار روپیہ منافع کماتا ہے اور کروڑ پتی بن جاتا ہے۔ جب تک لوگوں کو حقائق کا علم نہ ہو وہ اپنی شیریں گفتاری اور درباری آداب کی تربیت کیوجہ سے فرشتہ نظر آتا ہے اور اس کی مخالفت کرنے والا شر پسند کہلاتا ہے۔ اسی لئے فیوڈل روشنی کا دشمن ہوتا ہے۔ اپنے علاقے میں تعلیم کو نہیں آنے دیتا، ترقی نہیں ہونے دیتا، اس کے حریف فیوڈل بھی اسی طرح کے فیوڈل ہوتے ہیں، وہ اس کی ان خامیوں پر انگلی نہیں اٹھاتے۔ کیونکہ یہی ''کارِ خیر'' وہ بھی اپنے علاقوں میں سرانجام دے رہے ہوتے ہیں۔ باہر کی دنیا میں وہ مسٹر کلین ہوتا ہے اور اسکا حریف بھی مسٹر کلین! فیوڈل اول و آخر فیوڈل ہوتا ہے۔ سیاستدان بننا اسکی مجبوری ہے۔ سیاست میں اسکا کوئی نظریہ ہوتا ہے نہ مقصد۔ وہ صرف اور صرف اپنی بالادستی چاہتا ہے، اوپر والے بالادست کے سامنے سر جھکا دیتا ہے۔ وہ اقتدار کے بغیر اسی طرح زندہ نہیں رہ سکتا، جس طرح پانی کے بغیر مچھلی۔ لوٹے کا لفظ اس کی توہین نہیں بلکہ توقیر کا باعث بنتا ہے۔

ایک فیوڈل نے ہی کہا تھا کہ ہم نے کبھی پارٹی نہیں بدلی، ہماری پارٹی حکومتی پارٹی ہے۔ اگر کوئی ہماری پارٹی سے نکل جائے تو لوٹا وہ ہے یا ہم؟۔

چونکہ دانشور طبقہ اتنی باریکیوں میں نہیں جا سکتا۔ فیوڈل اس کی کمزوریوں کا خوب فائدہ اٹھاتا ہے۔ قوم کے سامنے اس کا چہرہ اور ہوتا ہے اور محکوموں کے درمیان اور...... فیوڈل ازم کا سب سے زیادہ نقصان یہ ہوتا ہے کہ فیوڈلز کی باہمی چپقلش سے ترقی کے راستے مسدود ہو جاتے ہیں، مگر اس دشمنی کا کمزور طبقات کو ایک فائدہ ہو جاتا ہے، وہ یہ کہ عام آدمی کو فیوڈلز کے اختلافات کی وجہ سے زندہ رہنے کا موقع مل جاتا ہے۔ فیوڈل کے جرائم پر گرفت نہ ہونے کی وجہ سے دیہاتی معاشرے میں جرائم سے نفرت ختم ہو جاتی ہے، عام

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آدمی سمجھتا ہے کہ زور آور کو قانون توڑنے سے روکنے والا کوئی نہیں اور قانون کی بے وقعتی جرائم کی دنیا کو آباد کر دیتی ہے۔ تھانے جرائم کا اڈہ بن جاتے ہیں۔ انتظامیہ کھلے عام رشوت لیتی ہے۔ لوگ قومی سوچ سے لاتعلق ہو کر ذاتی انتقام، لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت میں ملوث ہو کر قومی دھارے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ فیوڈل ان کے جھگڑوں کو بڑھاتا ہے، صحت مند معاشرہ قائم ہونے کی بجائے لوگ ایک دوسرے سے دشمنیاں پالتے ہیں۔

چونکہ اسی فیصد آبادی دیہاتوں میں ہے، یہ کلچر شہروں کی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ عدالتیں سفارش اور رشوت کی زد میں آجاتی ہیں "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کا اصول پورے ملک کا طرزِ زندگی (Way of life) بن جاتا ہے۔ تم خود فیوڈل ازم کی بالا دستی والے معاشرے میں پیدا ہوئی ہو، مجھے یقین ہے میری بات سمجھنے میں کوئی مشکل درپیش نہیں آئی ہوگی۔

والسّلام!

تمہارا والد!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کیا میں غدار ہوں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

2 جون 2004ء

گوانتاناموبے سیکورٹی سیل

سنٹرل جیل اڈیالہ راولپنڈی

بُشی جی!

السلام علیکم! کیسی ہو!

جیل حکام نے میری چارپائی کو زنجیر سے باندھ کر دروازوں کی سلاخوں سے تالا بند کردیا۔ جیل کے اعلیٰ حکام کا دورہ تھا اور مجھے بے بسی اور بے کسی کی تصویر بنا کر پیش کرنا مقصود تھا۔ طبیعت پر اس کا کافی اثر رہا، شاید یہی وہ چاہتے تھے۔

آج تین بجے اٹھا تو سلاخوں کے سامنے حسب معمول پہرے دار کھڑا تھا۔ شروع میں مَیں اس بات کو محسوس کرتا تھا کہ یہ ساری رات میری کروٹوں کا حساب کیوں رکھتے ہیں لیکن اب میں اس کا عادی ہوگیا ہوں۔ کئی دن سے سوچ رہا تھا کہ پچھلی ملاقات پر تمہارے اٹھائے ہوئے سوالات کے جواب لکھوں، لیکن شدید گرمی اور حبس نے بے چین کئے رکھا۔ اب آہستہ آہستہ طبیعت اس کی بھی عادی ہوگئی ہے۔ آج خود کو تازہ دم محسوس کررہا ہوں۔

انسان میں اللہ تعالیٰ نے حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی بے پناہ صلاحیتیں رکھی ہیں۔ مگر اس کے باوجود انسان ماحول کے مطابق ڈھلنے کی بجائے ماحول کو اپنے مطابق ڈھالتا رہتا ہے اور اپنی مرضی کے ماحول کے لئے بہشت کے قیام کو بھی اپنی آزادی پر قدغن سمجھتے ہوئے وہاں سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ مگر میں عجیب و غریب کیفیت کا شکار ہوں۔ قید کے اس دوزخ میں ضمیر کی آزادی کی نعمت کے مزے لوٹ رہا ہوں۔ مجھے اس بے پناہ مسرت کی منطق سمجھ نہیں آتی۔ مجھے یہاں آئے ہوئے آٹھ ماہ کا عرصہ ہوگیا، تنہائی کا زہر بھی میرے لئے کارِ تریاق بن جائے تو پھر اسے دماغ کے خلل کا نام ہی دیا جاسکتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں نے تمہیں بتایا تھا، میری ذہنی ساخت وپرداخت میں میرے گھریلو ماحول کا بہت اثر ہے۔ گھر کی چار دیواری میں مَیں نے سعدی رومی، حافظ شیرازی، نظامی گنجوی، اقبال لاہوری، ارسطو، افلاطون، سقراط، بقراط جیسے نام اپنی والدہ اور والد سے سنے۔ بڑے بھائی نے فارسی سے اردو کی طرف سفر کرایا۔ نسیم حجازی، مقدمہ ابنِ خلدون، ابنِ جریر طبری کی مل ملا کر پچاس کے قریب جلدیں پڑھنے کے بعد نہج البلاغہ، بخاری، موطا، قدوری، مشکوٰۃ، ماجہ، ترمذی سے گذر کر ابنِ تیمیہ، امام ابوحنیفہ، امام احمد بن حنبل، امام شافعی، امام مالک، امام ابو یوسف کی شُد بُد ہونے لگی۔

میٹرک کرنے سے پہلے تفاسیر اور فتاویٰ کو سمجھنے کیلئے کوشاں ہو گیا۔ تفسیر ابنِ کثیر سے، مجدد الف ثانی شاہ ولی اللہ، مولانا احمد رضا خان، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا رشید احمد گنگوہی کا فتاویٰ رشیدیہ اور فتاویٰ عالمگیری زیرِ مطالعہ تھے۔ انہی دنوں میں تاریخ بنو اُمیہ، بنو عباس، تاریخ انگلستان، تاریخ فرشتہ اور مغلوں کی توزکیں پڑھنے کا موقع ملا۔ عصر حاضر کے لکھنے والوں میں مولانا مودودیؒ کی خلافت وملوکیت سے مقدمہ تفہیم القرآن تک اور تفسیر تفہیم القرآن سے صاحب تفہیم القرآن تک پہنچا۔ اردو، فارسی اور انگریزی ادب کے صحن چمن کے چند گوشوں کی سیاحت کر سکا۔ ذہن میں ایک ملغوبہ تیار ہو گیا۔ اب نہ اردو آتی ہے، نہ فارسی اور نہ انگریزی۔ بس کام چل رہا ہے............

اردو میں اساتذہ کے کلام کے بعد اقبال اور فیض اچھے لگے۔ انگریزی میں بھی ورڈز ورتھ (Words Worth)، کیٹس (Keats) اور شیلے کالرج (Shelley Coleridge) بیرن (Byron) سے آگے نہ بڑھ سکا۔ البتہ فارسی میں رومی، حافظ شیرازی، عمر خیام، فردوسی سے پروین اعتصامی تک گرتا پڑتا پہنچ ہی گیا۔ سادہ عربی سمجھ لیتا ہوں لیکن عربی ادب سے بالکل کورا ہوں۔

ابھی میٹرک کے امتحان میں دو مہینے باقی تھے کہ 17 مارچ 1966ء میں میری شادی ہو گئی۔ تمہاری والدہ مجھ سے بھی ایک سال چھوٹی تھی۔ میں نے اشاروں کنایوں میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بزرگوں تک پیغام پہنچایا کہ دومئی کو میرا پہلا پرچہ ہے۔ مگر آزادی نسواں کے اس دور میں مردوں کی کون سنتا ہے۔ میری خالہ اور والدہ یعنی آپ کی دادی اور نانی کا فیصلہ تقدیر مبرم کی طرح صادر ہو چکا تھا۔

میں چھوٹی عمر کی شادی کے سخت خلاف ہوں۔ لیکن میری ذات کے حوالے سے نتائج مختلف ہیں مجھے چھوٹی عمر کی شادی راس آ گئی۔ مشترکہ خاندانی نظام کی وجہ سے تمہاری والدہ پوری زندگی میری ذمہ داری نہیں رہی اب تو مشترکہ خاندان کی ذمہ داریاں بھی اسکے کندھوں پر ہیں۔

گھر کی ذمہ داری نہ ہونے کی وجہ سے کالج اور یونیورسٹی کی تعلیمی اور غیر تعلیمی سرگرمیوں کے لئے میرے پاس کافی وقت تھا۔ جب میں یونیورسٹی پہنچا تو تمہاری بہن میمونہ پیدا ہوئیں۔ وہ سارے خاندان کی آنکھ کا تارا تھیں۔ خاص طور پر، دادا، دادی اور نانا، نانی کی محبتیں اس پر نچھاور تھیں۔ ہر مرحلے پر مجھے خاندان کی مدد مل رہی تھی اور میرے لئے حق اور سچائی کے راستے پر چلنا اتنا دشوار گزار نہیں لگتا تھا۔ ذہنی پختگی کیلئے پنجاب یونیورسٹی نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ میں کالج سے فلسفہ کا طالب علم تھا۔ یونیورسٹی میں فلسفہ کی وسیع دنیا آباد تھی۔ اس دنیا میں نہ خود کو تلاش کر سکا ہوں اور نہ حق اور سچائی کو بالادست کر سکا ہوں۔ لیکن سچائی کے پرچم کو سرنگوں بھی نہیں ہونے دیا۔ جو میرے خیالات کو پابندِ سلاسل نہ کر سکے، وہ میری چارپائی کو زنجیروں سے باندھ کر تسکین حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

اقبال نے "فلسفہ زدہ سید زادے" کو مطعون کیا تھا، جو زُناری برگساں ہو گیا تھا۔ اقبال کو ہیگل کا صدف بھی گوہر سے خالی نظر آتا ہے۔ وہ ہابز (Hobbes)، روسو (Rousseau)، لاک (Locke) اور کانٹ (Kant) کا پیچھا کرتا ہے۔ راستے میں اسے انقلابِ فرانس اور نیست پیغمبر و لے دارد کتاب والا کارل مارکس بھی ملتا ہے۔ وہ دانتے کی Devine Comedy تک حکیم نطشے کو ذہن میں رکھ کر پہنچتا ہے۔ آخر میں کہتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف"

میرا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ میں کارل مارکس کو کوئی برگزیدہ شخص تو نہیں مانتا، نہ ہی ماؤزے تنگ جیسے عظیم مصلح کو صرف ردکنفیوشس اور لوزے (Laotze) کا پیروکار کہہ کر آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ تمام پیغمبر غریبوں، مظلوموں اور روندے ہوئے طبقات کے محافظ تھے۔ تمام پیغمبروں نے ظالموں کا مقابلہ کیا ہے۔ فرعون، نمرود، شداد اور اہلِ مدین جبر کے نمائندے تھے۔ پیغمبران حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو درکھان کا بیٹا، حضرت ادریس علیہ السلام کو جولاہے کا بیٹا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو غلام ابنِ غلام کہا گیا۔

پیغمبر علیہ السلام کے بارے میں بھی کہا گیا کہ اگر نبوت نے آنا تھا تو وہ قریش کے سرداروں کے گھر آتی۔ ایک ایسے شخص کے پاس کیوں آئی جو ایک خاتون کے ہاں روزگار کیلئے کام کر رہے تھے۔ اسی طرح اپنے دور میں کارل مارکس اور ماؤزے تنگ نے غریب طبقات کی بات کی ہے۔ میں اُن کا پیروکار اس لئے نہیں بن سکا کہ ان کے فلسفہ میں جبر کو کچھ مقامات پر بالادستی حاصل ہو جاتی ہے۔

جہاں انسان کی آزادی پر قدغنیں زیادہ ہوں، وہ نظام خود اپنے بوجھ کے نیچے دب کر ختم ہو جاتا ہے اور یہی کمیونزم کے ساتھ ہوا ہے۔ ورنہ کارل مارکس اور ماؤزے تنگ کی ادائیں تو پیغمبرانہ تھیں۔

برطانیہ کا میگنا کارٹا، فرانس میں روسو کا معاہدہ عمرانی اور امریکہ کا (Bill of Rights) حقوق کا بل انسانی تہذیب کے ارتقاء میں اہمیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں۔ انقلاب فرانس نے انسانی آزادیوں کی جدوجہد کو نیا رخ دیا ہے۔ روسو نے کہا! انسان آزاد پیدا ہوا تھا۔ اب وہ ہر جگہ زنجیروں میں پابند ہے۔ گوئٹے اور نطشے نے انقلاب فرانس کو عالم انسانی پر ایک قوسِ قزح کی طرح دیکھا اور والٹئیر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ آدھا انقلاب فرانس ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہ سارے انکشافات یورپ پر اڑھائی تین سو سال پہلے ہوئے، سوائے میکنا کارٹا کے، جو تقریباً آٹھ سو سال پہلے ہوا تھا۔ وہ صرف بادشاہ اور برطانیہ کے زمینداروں کے حقوق کا تعین کرتا تھا۔

14 سو سال پہلے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا تھا" تم نے کب سے انہیں غلام بنا رکھا ہے، حالانکہ اِن کی ماؤں نے اِنہیں آزاد جنا تھا"۔

میں نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول تمہارے دادا کے ڈیرے کے دروازے پر لکھا ہوا دیکھا۔ مجھے روسو کی آواز میں انسانیت کی بالادستی کی وہی روح جلوہ گر نظر آتی ہے جس کا درس اسلام نے دیا ہے۔

میں سب سے زیادہ ژاں پال سارتر کے فلسفہ وجودیت سے متاثر ہوا ہوں۔ وہ کہتا ہے!

I am commited Therefore I am

ویت نام اور الجزائر کے مسئلہ پر سارتر کے علاوہ برٹرینڈ رسل نے بھی مجھے متاثر کیا ہے اور مشرق کے دوبارہ بیدار ہونے کی اس کی پیشگوئی سو فیصد صحیح ثابت ہو رہی ہے۔ لیکن ژاں پال سارتر کی اپنے عقائد کے ساتھ عملی وابستگی نے اسے میرا ہیرو بنا دیا ہے۔ وہ کہتا ہے "اچھائی اور برائی کے معرکے میں کوئی غیر جانبدار نہیں رہ سکتا۔ خیر و شر کی معرکہ آرائی میں محض تماشائی کا کردار ادا کرنے والے یا تو بزدل ہوتے ہیں یا غدار"۔

میں ایسے فلسفہ کا پیروکار ہوں، جس میں سب کا خلاق اور سب سے طاقت ور یہ کہتا ہے کہ میں اپنے حقوق معاف کر سکتا ہوں، لیکن بندوں کے حقوق معاف نہیں کر سکتا، یا نہیں کرونگا۔ یہ وہ مقام بندگی ہے۔ جسے دیگر انسان شان خداوندی نہیں لینا چاہتا۔

محسنِ انسانیت کا دیا ہوا یہ درس، تا قیامت، ہمارے لئے مشعل راہ ہے، شہیدوں میں سے بہتر حمزہ بن عبدالمطلب ہیں، پھر ان کے بعد وہ شخص ہے جو کسی حاکم کے سامنے کھڑا ہو اور حاکم کو امر و نہی کی تلقین کرے، جس کی پاداش میں وہ حاکم اسے ہلاک کر دے۔ ہمیں لیڈر سے زیادہ ریفارمر (مصلح) کی ضرورت ہے۔ ایسا مصلح جو آج کی ناقابلِ علاج

www.iqbalkalmati.blogspot.com

معاشرتی بیماریوں کا داروبن سکے اور اپنے کردار کے نشتر سے فاسد مادوں کو قومی وجود سے پاک کردے۔

میری سوچ، عمل اور قول وفعل میں تضاد ہے۔ سوچتا کچھ ہوں اور کرتا کچھ اور ہوں۔ یہی قول وفعل کا تضاد ہی ہماری سب سے بڑی بیماری ہے۔ دعا کرو کہ تمہارا والد اور پوری قوم اِس بیماری سے شفایاب ہوجائے۔

والسّلام!

تمہارا والد!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

متوسط طبقے کی قیادت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

15 جون 2004ء

گوانتاناموبے سیکورٹی سیل

سنٹرل جیل اڈیالہ راولپنڈی

بُشو بی بی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

میرا سیل تنذور کی طرح تپ رہا ہے، راتیں بھی کروٹیں بدلتے گذرتی ہیں۔ کیمپ جیل لاہور میں ہمیں ائرکولز کی سہولت حاصل تھی، یہاں وہ بھی نہیں ہے۔ گوانتاناموبے بھیجنے اور وہاں سے آزاد ہو کر آنے والے قیدیوں کو الگ رکھنے کیلئے جیل میں ایک ویران گوشہ تلاش کیا گیا، جسے جیل میں، گوانتاناموبے سیل یا کیوبا سیل کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسکے حفاظتی انتظامات کئے گے، دیواروں کو اور بلند کیا گیا، بجلی کی تاریں لگا کر اسے محفوظ کیا گیا۔ اسکے اردگرد کے علاقے بھی خالی کر دیئے گے، گویا میں ایک ویران جزیرے میں رہتا ہوں۔ جہاں خودرو پودوں اور پرندوں کی آوازیں، جنگلی چوہوں اور بلیوں کا بسیرا ہے۔ انسانی شکلیں دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں اور انسانی آوازیں سننے کو کان۔

جب مجھے اس سیل میں بھیجا گیا تو میں نے احتجاج کیا، مگر "باغی اور غدار" کی بات پر کون توجہ دیتا ہے۔ ایک لوہے کی پلیٹ اور ایک پلاسٹک کا گلاس، مجھے کھانے پینے کیلئے، دیا گیا۔ یہ اس سیل میں میری کل کائنات تھی۔ کوٹ لکھپت جیل میں تو ٹونٹی سے منہ لگا کر پانی پینا پڑتا تھا، ہاں! یہاں ایک عدد لوٹا بھی تھا، سچی بات ہے کہ مجھے یہاں آ کر لوٹے کی قدرو قیمت کا احساس ہوا۔ مجھے لگتا ہے یہی احساس دلانے کیلئے مجھے یہاں بھیجا گیا تھا۔ جس طرح میرے جیسے دیہاتی کا ایک میلے میں کھیس (گرم کمبل) چوری ہو گیا تو اُس نے کہا! میلہ تو میرے کھیس کو چرانے کیلئے لگایا گیا تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اب رہا تمہارا سوال کہ متوسط طبقے کی قیادت کیوں نہیں ابھری؟ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کے متوسط طبقے کی قیادت اور جمہوریت کی تین علامتیں تھیں۔ موچی گیٹ لاہور، لالوکھیت کراچی، اور پلٹن میدان ڈھاکہ۔ ہمارے حکمران پنجابی بیوروکریسی فوجی جرنیل اور فیوڈل لارڈ، ان تینوں علامتوں کو مٹانے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔

مشرقی پاکستان کی قیادت متوسط طبقے سے آتی تھی، وہاں کی 80 فیصد زمینوں پر ہندوؤں کا قبضہ تھا اور دولت پر مسلمانوں کا۔ ہندو وہاں اپنی بقا کی جنگ لڑنے کیلئے مسلمان قیادت کو استعمال کرتا تھا، لیکن براہ راست اسمبلیوں تک پہنچنا اس کیلئے ناممکن تھا۔ آہستہ آہستہ وہاں کی قیادت پر ہندو مارواڑیوں کی گرفت کمزور ہو رہی تھی کیونکہ وہ اپنی دولت کلکتہ منتقل کر رہے تھے اور مقامی آبادی کے غیظ وغضب کا نشانہ بن رہے تھے۔

مغربی پاکستان کے حکمرانوں نے اپنے مسلمان بھائیوں کو مستحکم کرنے کی بجائے بے توقیر کر دیا۔ ان کی 200 سال کی جدوجہد کو انگریزوں کے کاسہ لیس مذاق کا نشانہ بناتے تو ان کے زخم ہرے ہو جاتے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد ملک میں "جمہوریت کا ایک جزیرہ" رہ گیا تھا جس سے متوسط طبقے کی قیادت جنم لیتی تھی۔ پورے ملک کی امیدوں کا مرکز کراچی اور حیدرآباد کو سمجھا جاتا تھا، اسے ختم کرنے کیلئے پھر نئی منصوبہ بندی کی گئی۔ وہاں سے متوسط قیادت تو آتی ہے مگر اس کی سوچ کا دھارا ابلدیاتی حدود سے آگے نہیں نکل سکا۔

دنیا میں بے شمار ملک ہیں، جن کی ترقی کا دروازہ متوسط طبقے کی قیادت نے کھولا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر بار بار انتخابات ہوں اور اداروں کو مستحکم ہونے کا موقع ملے تو صرف پاکستان ہی نہیں پوری ترقی پذیر دنیا میں سیاسی استحکام کی وجہ سے معاشی انقلاب آجائے گا۔ متوسط اور غریب طبقات کی قیادت کا دروازہ اسمبلی میں کھلتا ہے، جب اسمبلی کا دروازہ سالہا سال تک بند کر دیا جائے یا اسمبلیوں کو کٹھ پتلیاں سمجھ لیا جائے تو عوام قومی دھارے سے کٹ جاتے ہیں۔ اسمبلیاں صرف مراعات یافتہ طبقے کے کلب بن جاتی ہیں اور عوام کی نفرت کا مرکز۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تمہیں بتانا تھا، سعدیہ اور عمران ملنے آئے تھے، محمد اور ماہ نور فاطمہ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ جیل والوں نے ایک سالہ محمّد اور دو سالہ ماہ نور فاطمہ کے ہاتھوں پر بھی مہریں لگائی ہوئی تھیں۔ اپنے نانا سے ملنے کیلئے ان بچوں کو جن پابندیوں کا سامنا ہے وہ تاریخ کا حصہ ہیں اور میرے لئے زادِ سفر!

والسّلام

تمہارا والد!

جاوید ہاشمی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قوتِ برداشت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

20 جون 2004ء

گوانتاناموبے سیکورٹی سیل

سنٹرل جیل اڈیالہ راولپنڈی

بُشو بی بی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

برداشت کی طاقت زندگی کا بہت بڑا سرمایہ ہے۔ سیاست میں تو خاص طور پر اس کی بہت اہمیت ہے۔ میمونہ میں حوصلہ اور برداشت مجھ سے کہیں زیادہ ہے، وہ حادثاتی طور پر سیاست میں نہیں آئی بلکہ حادثہ اس کی ذات کی تکمیل کیلئے انتظار کر رہا تھا۔

برداشت کی دوسری انتہا میں نے جیل میں دیکھی ہے۔ میں صبح و شام پرندوں اور بلیوں کے سامنے اُن کی خوراک ڈال دیتا ہوں۔ ہم سارے ایکدوسرے سے ایسے مانوس ہو گئے ہیں جیسے ایک ہی خاندان کے فرد۔ نہ میں پرندوں کو شکار کرنے کا سوچتا ہوں اور نہ بلیاں ان پر جھپٹتی ہیں۔ ہم ایک دوسرے کی سوچ سے آگاہ ہو چکے ہیں۔ رزق کی بہم رسانی اور قید نے جبلتوں پر کنٹرول کر لیا ہے۔ اسی طرح گلوبل ویلج کے چودھری ہمیں بھوکا مار کر اپنے کنٹرول میں لے آتے ہیں اور ہماری قوت برداشت کا امتحان لیتے ہیں۔ جب ہم بھوک سے بلبلاتے ہیں تو قرضوں کی صورت میں ہمیں قوت لایموت فراہم کر دیتے ہیں تا کہ ان کی معیشت کا پہیہ چلتا رہے۔

میں نے زندگی بھر کوشش کی ہے کہ ذاتی دشمنیاں نہ پالوں۔ اس میں کس حد تک کامیاب ہوا، یہ وقت فیصلہ کرے گا۔ سکول کی زندگی سے لے کر اب تک جب بھی کوئی انتخاب ہارا ہوں میں نے فریق مخالف کو مبارکباد ضرور دی۔ ذاتی طور پر جا کر بھی اور اخبار کے ذریعے بھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں قبائلی دیہاتی ماحول میں پلا ہوں۔ میری یہ حرکت میرے حامیوں نے کبھی پسند نہیں کی، مگر میں نے یہ سب والد محترم سے سیکھا۔ وہ کہا کرتے تھے ''دوسرے کو مٹانے کی خواہش کو اپنے دل سے مٹا دو اور اس خواہش کو معاشرے سے برائی مٹانے کی خواہش میں بدل دو''۔ وہ کہا کرتے تھے ہر انسان ایک شخصیت لے کر پیدا ہوتا ہے۔ قدرت کا منشاء بھی یہی ہے کہ ہر انسان اپنے آپ کو اہم سمجھے۔ وہ فرماتے تھے کہ انسان دو دعائیں کبھی نہیں مانگتا، ایک مزید عقل کیلئے اور دوسری شکل کو بہتر بنانے کیلئے۔ وہ اپنے آپ کو خوبصورت بھی سمجھتا ہے اور عقل مند بھی۔

میں سکول میں پہلی مرتبہ تقریری مقابلے میں صدارت کا عہدہ دو نمبر سے ہار گیا۔ منصفین نے کہا تقریر تو ٹھیک ہے، مگر اس نے وردی نہیں پہنی ہوئی۔ پتہ نہیں میں شروع سے ہی وردی سے کیوں الرجک تھا۔ آخرکار پہنانے والوں نے مجھے وردی پہنا کر ہی دم لیا، خواہ قیدی نمبر 6496 کی وردی ہی کیوں نہ ہو۔ خیر میں بات کر رہا تھا برداشت کی، میں نے پھول صدر بننے والے اور بنانے والوں کو پہنا دیئے، مگر سکول والے انہیں دو نمبر صدر کہہ کر پکارتے، حالانکہ وہ وردی والے صدر تھے، فرسٹ ائیر میں الیکشن ہارا تو سارے پھول جیتنے والے کو پہنا دیئے۔

عملی زندگی کے انتخاب میں جب ہارا تو حریفوں کو گھر جا کر مبارکباد دی۔ ایک مرتبہ عجیب واقع ہوا، میں اپنا ووٹ کاسٹ کرنے کیلئے جلدی سے کمرے میں داخل ہوا تو پیر وارث شاہ مخالف کی صندوق میں ووٹ ڈال رہا تھا، اس کے ہاتھ سے پرچی گر پڑی اور وہ یہ کہتے ہوئے باہر بھاگ گیا کہ میں نے آپ کو ووٹ دے دیا ہے۔ میں نے وہ پرچی اٹھا کر مخالف کی صندوق میں ڈال دی کیونکہ یہ اسی کا حق تھا۔ میرے اور اللہ کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا، میں نے جس کی امانت تھی اس تک پہنچا دی۔ شیطان کو پہنچنے میں کچھ دیر ہوگئی، جس نے مجھے احساس دلانے کی کوشش کی کہ تم ایک ووٹ سے بھی الیکشن ہار سکتے ہو، میرا ضمیر اپنا کام کر چکا تھا۔ یونیورسٹی میں خون جواں تھا، لیکن میری اپنے حریفوں سے دوستیاں تھیں۔ ہم

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک دوسرے کے خلاف زور وشور سے تقریریں کرتے، لیکن نظریات کی سیاست کبھی ذاتی دشمنیوں میں نہیں بدلی۔ جہانگیر بدر، راجہ انور، انور چودھری، راشد بٹ، حسام الدین قریشی سے اب تک بھائی چارہ قائم ہے۔ راجہ انور کے بال بہت لمبے ہوتے تھے۔ کمرے میں بیٹھ کر ہم اکٹھے چائے پیتے اور اس کے سر اور داڑھی میں انگلیوں سے کنگھی کرتے اور خوب ہنستے۔

1993ء کا واقعہ ہے کہ محترمہ بے نظیر نے لانگ مارچ کا اعلان کیا اور ہماری حکومت نے غلط حکمت عملی سے پورے شہر کو فورٹریس میں تبدیل کر دیا۔ سرحد، سندھ، بلوچستان اور پنجاب کا راستہ پورے ملک سے کاٹ دیا گیا۔ اٹک کے پل پر مورچے بنا دیئے اور اسلام آباد میں جگہ جگہ پر چوکیاں بنا دی گئیں۔ اس دوران پیپلز پارٹی کے سابق وزیر سید ناظم حسین شاہ ہماری حکومت کو گرانے کیلئے میرے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔ لانگ مارچ میں شریک ہونے کیلئے اس سے محفوظ راستہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ تمہیں معلوم ہے، سید ناظم حسین شاہ میرے قریبی دوست ہیں، ہر الیکشن میں اپنی پارٹی کی حمایت میں اور میری مخالفت میں انتخابی مہم چلاتے ہیں۔ 2002ء کے انتخابات میں بھی میری مخالفت میں پیش پیش تھے۔ میں نے انہیں دوستی کے آغاز میں کہہ دیا تھا کہ سب سے پہلے آپکو اپنی جماعت سے وفادار رہنا چاہیے اور بعد میں ذاتی دوستوں سے۔ وہ میرے اس مشورے پر بھرپور طریقے سے عمل کرتے ہیں، جب میں جیل میں ہوتا ہوں تو تیتر، بٹیر، سوہن حلوہ اور شربت بادام کی فراہمی وہ اپنے ذمہ لے لیتے ہیں۔ اس سب کچھ کے باوجود جب بھی اللہ کے گھر جانا ہوتا ہے، پہلی نظر پڑتے ہی، قوت برداشت کی دعا مانگتا ہوں۔ مجھے احساس ہے میری دعا ابھی تک قبول نہیں ہوئی۔ آؤ تم بھی میری اس دعا میں شامل ہو جاؤ کہ! اے سب کی سننے والے ربّ، ہمیں ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی طاقت عطا فرما، آمین۔

والسّلام!

تمہارا والد! جاوید ہاشمی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آٹھ ارب کا فائدہ

اقتدار اور اختلاف کی سیاست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

25 جون 2004ء

گوانتاناموبے سیکورٹی سیل

سنٹرل جیل اڈیالہ راولپنڈی

بُشی جی!

السلام علیکم! کیسی ہو!

اُمید ہے تم خیریت سے ہو گی۔ تم سے ملے ہوئے تین مہینے ہو گئے۔ امتحانات کی تیاری کیسی ہے؟ صاف ظاہر ہے تم ان دنوں بہت مصروف ہو گی۔ جونہی امتحانات ختم ہوں مجھے آ کے مل جانا۔ بہتر یہی ہو گا کہ پہلے ملتان جا کر ماں کی خیریت دریافت کرو اور پھر زیادہ وقت اسلام آباد میں رہ کر اپنا تھیسز (Thesis) مکمل کرو۔ یہاں تمہیں تربیت حاصل کرنا آسان ہو گا اور مجھ سے ملنے میں بھی سہولت ہو گی۔ تم نے پوچھا تھا: میرے وزیر بننے کا قوم کو کیا فائدہ ہوا؟ حزب اختلاف میں رہنے سے میں نے کونسی قومی خدمت سرانجام دی اور جیل جانے سے کونسی بہتری آ گئی ہے؟

میں مختصراً تمہاری دونوں باتوں کا جواب دیتا ہوں۔ کیونکہ یہ تفصیل کا موقع نہیں۔

میں میاں نواز شریف کی دونوں حکومتوں میں کابینہ میں شامل تھا۔ پہلی کابینہ میں میرے پاس سپیشل ایجوکیشن، سوشل ویلفیئر، ہاؤسنگ و تعمیرات اور کچھ وقت کیلئے ماحولیات کی وزارت تھی۔ ہاؤسنگ و تعمیرات کی وزارت کی دنیا بہت وسیع ہے۔ پوری قوم کے سر پر چھت فراہم کرنے کی پالیسی پر مبنی نئی تعمیرات سے لے کر ملازمین کو تمام حکومتی گھروں کی الاٹمنٹ اور ان کی درجہ بندی کا آخری فیصلہ متعلقہ وزیر کے پاس ہوتا ہے۔ میں نے بطور وزیر کوئی ایک فیصلہ بھی میرٹ سے ہٹ کر نہیں کیا۔ بلکہ اپنے اختیارات ایک کمیٹی کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حوالے کر دیئے۔ جس میں عوامی نمائندے موجود تھے۔ (آج تمہیں خط لکھ رہا تھا۔ اخبار میں خبر چھپی ہے کہ یہ اختیارات دوبارہ ہاؤسنگ کے وزیر کو واپس کر دیئے گئے۔) میں فقط ان کے فیصلوں پر عملدرآمد کراتا تھا۔ ایک بہت بڑی جائیداد جس کی قیمت اربوں روپے ہے، محتسب اعلیٰ نے ایک کاروباری گروپ کے حوالے کرنے کو کہا۔ مجھے اس گروپ کے کچھ نمائندے ملے اور کہنے لگے کہ اگر آپ محتسب اعلیٰ کے حکم پر عمل درآمد کرائیں گے تو اس سے آپکی نیک نامی میں اضافہ ہوگا اور آپکے دوست یا عزیز ہمارے پارٹنر بھی بن سکتے ہیں۔ میں نے کہا: آپ کا حق بنتا ہے تو اس حق کی حفاظت کا میں نے حلف اٹھایا ہے۔ اگر آپ کا حق نہیں بنتا تو میں آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکوں گا۔

میں نے فائل منگوائی، محتسب اعلیٰ کا فیصلہ یکطرفہ تھا۔ میری وزارت نے اس فیصلے کو چیلنج کر دیا اور حکومتی خزانے کو اربوں کے نقصان سے بچا لیا گیا۔

محترمہ بے نظیر کے دور میں پھر اس گروپ نے یہ زمین اپنے نام کرانے کی کوشش کی، میں اس وقت قومی اسمبلی کا ممبر تھا۔ مجھے خواجہ طارق رحیم وی آئی پی لاؤنج اسلام آباد میں ملے۔ میں ارکان قومی اسمبلی کے ساتھ بیٹھا گپ شپ کر رہا تھا۔ وہ حسب عادت اونچی آواز میں کہنے لگے کہ اس بیوقوف سے پوچھو، اس نے کروڑوں روپے کی آفر کو ٹھکرا دیا تھا۔ وہ جائیداد اب انہی لوگوں کو الاٹ ہو گئی ہے، جن کیخلاف یہ رکاوٹ بنا تھا (اس وقت خواجہ طارق رحیم محترمہ بے نظیر کی کابینہ میں وزیر تھے۔) میں نے اور دوسرے حزب اختلاف کے ارکان نے یہ معاملہ پہلے ہی اسمبلی میں اٹھایا ہوا تھا۔ میں نے خواجہ صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر حزبِ اختلاف باصلاحیت ہو تو حکومت سے زیادہ عوام کو فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہم اتنا احتجاج کریں گے کہ حکومت کو فیصلہ بدلنا پڑے گا اور بعد میں یہی ہوا۔ یہ جائیداد میری معلومات کے مطابق ابھی تک قوم کی ملکیت میں ہے۔

دوسری مرتبہ میں وزیر صحت تھا۔ جب حلف اٹھانے کے بعد اپنے دفتر میں گیا تو سیکرٹری ہیلتھ ظہیر سجاد نے جو ہمارے سابق چیئرمین سینٹ وسیم سجاد کے بھائی ہیں، کہا سر!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہم نے پولیو کی مہم چلانی ہے، کوئی ملک ہمیں مدد دینے کو تیار نہیں، بجٹ میں اس کیلئے پیسے نہیں ہیں، اب کیا ہوگا؟۔ میں نے اعانت کرنے والے ملکوں کی میٹنگ بلائی۔ ان سے سیاستدان کی زبان میں گفتگو کی۔ خطوط کے ذریعے ان کے ملکوں سے رابطہ کیا، ہمیں کروڑوں روپے کی مطلوبہ ویکسین بروقت مل چکی تھی اور قومی خزانے سے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہوا۔ اس سے پچھلی حکومت کا پولیو کا 35 لاکھ کا ویکسین کا سکینڈل بھی ہمارا راستہ نہ روک سکا۔

تمہیں سیاسی اقتدار کے ان پہلوؤں سے روشناس کرا رہا ہوں، جو قومی خزانے پر بوجھ بننے کے پروپیگنڈے کا حصہ ہیں۔

صحت کے محکمے کو ایک ٹیکنیکل وزارت سمجھا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں نہ میرا علم تھا اور نہ تجربہ، لیکن عوامی تعلق کسی بھی سیاستدان کو کامیاب کر سکتا ہے۔ اسی لئے برطانوی پارلیمانی نظام میں کہا جاتا ہے "کہ وزیر کو سپیشلسٹ نہیں ہونا چاہئے بلکہ جرنلسٹ ہونا چاہیے"۔ یہاں پر تو سیکرٹری بھی سپیشلسٹ نہیں ہوتا، نہ ہی ٹیکنوکریٹ اور نہ ہی جرنلسٹ۔

میں نے صرف ایک فیصلے سے قومی خزانے کو ہر سال ایک ارب بیس کروڑ کے زرمبادلہ کا فائدہ پہنچایا ہے، اب تک یہ بچت آٹھ ارب روپے ہو چکی ہے اور ہر سال ہوتی رہے گی۔ میری طرف سے قوم کے اعتماد پر پورا اُترنے کی یہ ایک ادنیٰ سی کوشش تھی۔

ہوا یوں کہ مجھے اپنے عوامی رابطوں سے پتہ چلا۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں خام مال چین، بنگلہ دیش، سنگاپور سے خرید کر باہر کہیں Dump کرتی ہیں اور پھر اسے سوئٹزر لینڈ، امریکہ یا فرانس یا کسی مغربی ملک کا مال قرار دے کر ہمیں مہنگا فروخت کرتی ہیں۔

اس کا فرق تمہیں یوں سمجھ آئے گا کہ ایک کلو خام مال جو سنگاپور یا تائیوان سے پانچ سو ڈالر فی کلوگرام خریدا جاتا، وہ ہمیں 35 ہزار ڈالر فی کلوگرام فروخت کیا جاتا۔ ہم یہ مال ٹنوں میں درآمد کر رہے تھے اور جہاز بھر بھر کر قیام پاکستان سے لے کر اب تک آ رہے تھے۔ کسی نے چیک کرنے کی زحمت ہی گوارا نہ کی۔ اس خام مال کو امریکہ اور یورپی ممالک خود

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہندوستان، چین، سنگاپور اور بنگلہ دیش سے خریدتے ہیں اور وہ اپنے لئے دوائیں بناتے ہیں۔ چونکہ خام مال کی خاصیت ایک ہوتی ہے، اس لئے ترقی یافتہ اقوام اب خام مال تیار کرنے کی بجائے درآمد کرتی ہیں اور ہم جیسے ناسمجھوں کو برآمد کرتی ہیں۔

میرا ٹارگٹ فی سال پانچ ارب روپے بچانے کا تھا، کیونکہ قومی خزانے کو صرف خام مال کی مد میں ہر سال پانچ ارب روپے کے زرمبادلہ کا نقصان پہنچایا جارہا ہے۔

تم پوچھو گی کہ میں نے یہ کارنامہ سرانجام کیسے دیا جو گزشتہ پچاس سال میں نہ کیا جاسکا؟ ہوا یوں کہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے لیڈروں کی مفادات کے ٹکراؤ پر جنگ ہوگئی۔ ان میں سے ایک کمپنی کے سربراہ نے مجھے کہا: اگر آپ مجھے یقین دلائیں کہ آپ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے دباؤ میں نہیں آئیں گے تو میں خام مال کی اصل قیمتوں کی تمام فہرستیں آپکے حوالے کرنے کو تیار ہوں۔ میں نے اسے کہا: میں اپنے عوام کا چوکیدار ہوں تم مجھ پر اعتماد کرو۔ جب میں نے تمام فہرستیں ملٹی نیشنل کمپنیز کے سربراہوں کے سامنے رکھیں تو ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

اسی دوران میں جنیوا گیا تو ان سربراہوں نے مجھے وہاں ملنے کی کوشش کی۔ میں نے جواب میں کہا کہ میں محدود ایجنڈا لے کر آیا ہوں۔ یہ معاملات پاکستان کی سرزمین پر میرے دفتر میں میٹنگ میں طے ہوسکتے ہیں۔ میں اکیلا فیصلہ نہیں کرسکتا، وہ مایوس ہوگئے۔ میں نے ڈاکٹر غیور احمد ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ کی سربراہی میں ایک کمیٹی بنادی۔ اس کمیٹی سے طویل مذاکرات ہوئے اور آخرکار یہ کمپنیاں رضاکارانہ طور پر خام مال کی قیمتوں میں کمی کرنے پر آمادہ ہوگئیں۔ ان سے طے پایا کہ پہلے مرحلے میں وہ ایک ارب تیس کروڑ روپے کا زرمبادلہ کم کریں گے۔

ہمارا ٹارگٹ 5 ارب روپے سالانہ کم کرنے کا تھا۔ اس دوران ہماری حکومت ختم ہو گئی۔ اب اس واقعہ کو 6 سال ہوگئے ہیں اور اس طرح قومی خزانے کو 8 ارب کے زرمبادلہ کا فائدہ ہوا ہے اور ہر سال یہ عمل جاری رہے گا۔ خط طویل ہوتا جارہا ہے۔ میں نے تین

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مرتبہ دواؤں کی قیمتیں کم کیں، یہ کیسے ہوا......... میرے جیل میں آنے کا قوم کو کیا فائدہ۔ یہ ساری باتیں پھر کسی وقت......... بس امتحانات سے فارغ ہو آ کر مجھے مل جاؤ، مگر پہلے ملتان میں اپنی والدہ سے ملنے کے بعد...... ملتان جا کر سعدیہ سے کہنا، وہ محمد اور ماہ نور فاطمہ کو مجھ سے ملا جائے، میں ان کے بغیر اُداس ہوں۔

والسّلام!

تمہارا والد!

جاوید ہاشمی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

عہدے کی سیاست اور نیلسن منڈیلا سے ملاقات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

2 جولائی 2004ء

گوانتاناموبے سیکورٹی سیل

سنٹرل جیل اڈیالہ راولپنڈی

بُشی جی!

السلام علیکم! کیسی ہو تم، پڑھائی کیسی جارہی ہے۔

میں آج بہت اُداس ہوں، تمہاری ماں اتنی کمزور ہوگئی ہے کہ گذشتہ ایک ماہ سے جیل تک بھی نہیں آسکی۔ بچوں کی خبرگیری کیسے کرے گی، مومنہ ماں کی تیمارداری بھی کرتی ہے اور میرا خیال بھی رکھتی ہے اور صبح وشام اکیڈمی میں تعلیم کیلئے بھی جاتی ہے۔

سب سے زیادہ بوجھ میمونہ کے کندھوں پر آپڑا ہے۔ میرے مقدمات کی پیروی، اسمبلی کی حاضری، مسلم لیگ کی سرگرمیوں میں شمولیت اور حلقہ انتخاب سے رابطہ۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا، مگر جس ہمت اور حوصلے سے اس نے حالات کا مقابلہ کیا ہے، میرے لئے باعثِ مسرت ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ کردار اس کا انتظار کر رہا تھا۔ احباب اسکی تقاریر کے بارے میں بتاتے رہتے ہیں، اسمبلی میں وہ ایک کہنہ مشق پارلیمنٹیرین کے طور پر اُبھری ہے مگر اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتی۔

اس ہجوم یاس میں سوچا میں تم سے کچھ باتیں کروں۔ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ سیاست میں عہدے کو کیا اہمیت دیتا ہوں۔

ایک مرتبہ بھٹو صاحب کے یاد کرنے پر ہمارا وفد، جو سات افراد پر مشتمل تھا، ان سے ملنے گیا۔ اس میں انجینئرنگ یونیورسٹی کے صدر احمد بلال محبوب بھی تھے جو آج کل پلڈاٹ کے ذریعے ارکان اسمبلی کی تربیت کر رہے ہیں۔

میں نے بھٹو صاحب سے مل کر چھوٹتے ہی سوال داغ دیا کہ آپ نے ہمیں کیسے یاد

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فرمایا؟ یہ میٹنگ گورنر ہاؤس لاہور میں ہورہی تھی، ہنس کر کہنے لگے: آپ کو آپ کا گھر دکھانے کیلئے بلایا ہے۔ جہاں آپ نے آنا ہے۔ میں نے شرارتاً کہا: میری نظریں تو اسلام آباد پر ہیں۔ سنجیدہ ہوکر کہنے لگے: میں تمہیں لندن میں دولتانہ کی جگہ سفیر بنا کر بھیج دیتا ہوں۔ میں نے عرض کی، مجھے اپنی صلاحیتوں کی کمی کا احساس ہے اور عمر کی کمی کا بھی۔ کہنے لگے: یہ دنیا بھر میں ایک ریکارڈ ہوگا کہ اتنی کم عمر کا سفیر اتنے اہم ملک میں تعینات کیا گیا ہے۔

بچپن سے اب تک ایک عجیب بات میرے ذہن پر چھائی ہوئی ہے کہ اگر حالات مجھے موچی بنادیں تو جوتے گانٹھتے ہوئے مجھے خون پسینہ ایک کردینا چاہیئے، اگر حالات مجھے بس کنڈیکٹر بنادیں تو میرا رویہ بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کیساتھ مودبانہ اور خادمانہ ہونا چاہیئے، میں نے کبھی عہدے کی تمنا نہیں کی۔ ہاں استاد بننے کی خواہش دل میں اب تک جواں ہے۔

ساتویں جماعت سے ہی یہ بات ذہن میں مہر ہوگئی کہ میں نے ایم این اے بننا ہے اور عوام کی ترجمانی کرنی ہے۔ وزارتیں تو راستے میں خود بخود آتی گئیں، البتہ میں بچپن سے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل اوتھانٹ (U-Thant) کا ذکر سنتا تو سوچتا کہ ساری دنیا کی تنظیم کو ایک فرد کیسے چلاتا ہے۔ پھر خود سے سوال کرتا کہ کیا میں یہ کرسکتا ہوں؟

صدر اور وزیراعظم کے عہدے میں مَیں نے کبھی کشش محسوس نہیں کی۔ میں نے عملی زندگی میں ہر وزیراعظم کا جو انجام دیکھا ہے، اس کے بعد وزیراعظم پر ویسے بھی ترس آنے لگا ہے۔ میں ہمیشہ نظام بدلنے کا خواہشمند رہا ہوں۔ لیاقت علی خان، خواجہ ناظم الدین، حسین شہید سہروردی، ذوالفقار علی بھٹو، دو تہائی اکثریت رکھنے والے میاں نواز شریف..... ایک لمبی قطار ہے، قوم نے انہیں اپنی نمائندگی کا اعزاز دیا، ان کی بے وقعتی اور دربدری خون کے آنسو رُلاتی ہے۔

صدر مملکت بھی عجیب ادوار سے گذرے۔ ایوب کا ماتم کرنے والا گوہر ایوب رہ گیا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے اور ضیاء الحق کا اعجاز الحق ۔ جاہ و جلال کے مظہر یحییٰ خان کے تابوت کو اکیس توپوں کی سلامی باوقار نہ کر سکی ۔ غلام اسحٰق خان کا نام میں بھول گیا تھا، شاید قوم نے یاد رکھا ہو ۔ ہاں! ایک سکندر مرزا بھی ہوا کرتا تھا، جب یہ دنیا سے گیا تو اس کے دونوں ہاتھ بھی خالی تھے ۔ مگر یہ وہ والا سکندر نہیں تھا ۔ مجھے ان کی بیگم سے ملک کے اندر اور باہر ملنے کا اتفاق ہوا ۔ ان کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ آخری دنوں میں کتنا دکھی شخص تھا........ باقی رہے نام اللہ کا ۔

میرے دوست مجھ پر گاندھی یا نوابزادہ نصر اللہ خان کی پھبتی کستے ہیں ۔ جہاں تک نوابزادہ نصر اللہ خان کا تعلق ہے، میں ان سے متاثر ہوں ۔ آگ اور پانی کو اکھٹا کرنے کے ان کے جادو کا بھی قائل ہوں ۔ میں جب اڈیالہ جیل میں آیا، ان کی وفات کا زخم تازہ تھا ۔ میں مہینوں افسردہ رہا، پہروں ان کی یاد میں آنسو بہاتا تھا ۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جو آخری سانس تک جمہوریت کی بحالی کے لئے جستجو کر رہا تھا، بستر مرگ پر ذرا حالت سنبھلی تو اس نے اپنے بیٹے سے کہا کہ وہ مجھ سے اور مخدوم امین فہیم سے رابطہ کرے اور اے آر ڈی کی میٹنگ کی تاریخ کا اعلان کیا جائے ۔ وہ اس بات پر سخت ناراض تھے کہ ہم نے ان کی بیماری کی وجہ سے اے آر ڈی کی میٹنگ ملتوی کرتے ہوئے نئی تاریخ کا اعلان کیوں نہیں کیا ۔ یہ ان کی اپنے بیٹے نوابزادہ منصور خان سے آخری گفتگو تھی، وہ ہسپتال سے سیدھا میٹنگ میں آنا چاہتے تھے ۔

مریضِ محبت اُنہی کا فسانہ
سناتا رہا دم نکلتے نکلتے

قیادت کے بارے میں مَیں نے ایک اصول طے کیا ہے ۔ جس کی وجہ سے مجھے مردم آزاری سے نجات مل گئی ہے ۔ میں نظریئے اور فکر کی سیاست کرنیوالوں کو ولی سمجھتا ہوں، خواہ وہ بائیں بازو کی سیاست کر رہے ہوں یا دائیں بازو کی ۔

تیسری دنیا کے سیاست دانوں کو قطب کا مقام دینے کو تیار ہوں، لیکن میں انہیں پیغمبر نہیں سمجھتا کہ ان سے کوئی گناہ سرزد نہ ہو سکتا ہو، البتہ ذات کو قوم اور ملک پر ترجیح دینے والی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سیاست کے خلاف جہاد کو اپنا ایمان سمجھتا ہوں۔

میرے بزرگوں نے اڑھائی سو سال تک دریائے راوی اور دریائے سندھ کے اندر بھکر سے دیپالپور تک حکومت کی، مگر ہمارے جدِ اعلیٰ نے حکومت کو خیر باد کہہ کر دین کے فریضے کو ترجیح دی۔ میں نے اپنے گھر کی لائبریری کی ایک کتاب میں جب یہ عنوان پڑھا "چھوڑ دی شاہی شاہِ دیندار نے" تو اقتدار سے بے رغبتی کا پورا فلسفہ سمجھ میں آ گیا۔ میرے بزرگ آج بھی میرے لیے مینارہ نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تاریخ میں تازہ ترین مثال نیلسن منڈیلا کی ہے، جو اقتدار سے علیحدہ ہو کر امر ہو گیا۔ عہدے کی ہوس سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے۔

نیلسن منڈیلا رہائی کے بعد پاکستان آئے تو میں نے دو دن ان کے ساتھ گذارے۔ یہ ایک یادگار موقع تھا۔ کراچی سٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں رات ہم نے اکٹھے گذاری اور پھر اسلام آباد کی سولو فلائیٹ (Solo flight) کے دوران بھی طویل گفتگو ہوئی، وہ اس وقت تک جنوبی افریقہ کے صدر نہیں بنے تھے، نہ انہیں عہدہ سنبھالنے کی جلدی تھی۔ وہ جنوبی افریقہ کی معیشت، اندرونی استحکام اور امن کے رول کے بارے میں منصوبہ بندی کر رہے تھے۔

میں نے ان سے دریافت کیا کہ انہوں نے 27 سال قید و بند کی صعوبتیں اور مشقتیں کیسے برداشت کیں۔

انہوں نے ہنس کر کہا کہ

جاوید! قید میں ایک ایک لمحہ گن گن کر گذرتا ہے۔ باہر آ کر یوں محسوس ہو رہا ہے کہ بس ایک لمحہ تھا جو گذر گیا۔

''بس اپنے مقصد کا تعین ہونا چاہیے''

نیلسن صدر بننے کے بعد دوبارہ پاکستان کی مدد پر شکریہ ادا کرنے آئے۔

اس مرتبہ انہیں صدارتی پروٹوکول حاصل تھا، مجھے ان کی خدمت کا موقع نہیں دیا گیا۔

اس مرتبہ کسی اور کو یہ اعزاز ملا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہم تو سفرِ محبت کے ساتھی تھے، حکمرانوں کے سفر کے ساتھی کوئی اور ہوتے ہیں۔ الوداعی تقریب میں وزیراعظم پاکستان میاں نواز شریف نے میرا تعارف کرایا۔ نیلسن نے کہا کہ اِن کے تعارف کی کوئی ضرورت نہیں، یہ خوشبو میرے اندر بسی ہوئی ہے۔

میں نے اس خوشگوار لمحے کو اپنے دماغ میں ہمیشہ کیلئے محفوظ کرلیا۔ جب نیلسن منڈیلا جیل میں تھا، برطانیہ کی وزیراعظم مارگریٹ تھیچر نے انہیں دہشت گرد قرار دیا۔ وہ اپنی ذات کی بجائے جنوبی افریقہ کے عوام کی آزادی کی بات کررہا تھا۔ آج وہ امن کا سمبل کہلاتا ہے۔ اس نے غربت، بیماری اور جہالت کے خلاف 85 سال کی عمر میں بھی جنگ جاری رکھی ہوئی ہے۔ مغرب کا حُسن کرشمہ ساز جب چاہے کسی کو دہشت گرد بنادے یا امن کا پیامبر!

تم سے باتیں کرکے ہلکا پھلکا محسوس کررہا ہوں، انشاء اللہ تعالیٰ جلد ملاقات ہوگی۔

والسلام!

تمہارا والد!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قیادت کا تصور اور چرچل کا گاؤں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

20 جولائی 2004ء

گوانتا ناموبے سیکورٹی سیل

سنٹرل جیل اڈیالہ جیل راولپنڈی

بشریٰ جی!

السلام علیکم! کیسی ہو!

میں آج بہت خوش ہوں۔ رات کے تین بجے ہیں، باہر زوردار بارش ہو رہی ہے۔ ہر طرف پانی ہی پانی ہے۔ میں اپنے روزنِ دیوار سے باہر جھانک کر محظوظ ہو رہا ہوں۔

میں نے پھولوں کی جو قلمیں اپنے سیل کی دیواروں کے ساتھ لگائی تھیں، ان پر موتیا، چنبیلی اور گلاب مہک رہے ہیں۔ تیز روشنی کے بلب جو مجھے اذیت دینے کیلئے رات کو جلائے جاتے ہیں، راحت کا باعث بن گئے ہیں۔ ساری رات پھولوں کو دیکھ سکتا ہوں، ان کی خوشبو سے اپنے دماغ کو معطر کر سکتا ہوں۔

حاکموں نے مجھے تنہا کرنے کی کوشش کی ہے مگر میں نے ان کی سازش کو ناکام بنا دیا ہے۔ میں ہر شام محفل جماتا ہوں، دنیا کی عظیم ہستیاں مجھے میزبانی کا شرف بخشتی ہیں اور میری رہنمائی کرتی ہیں۔ میں خدا اور اسکے رسول ﷺ کی مصاحبت میں رہ رہا ہوں۔ میں تنہا کیسے ہو سکتا ہوں!

ملک کے کروڑوں لوگوں کی دعائیں، ان کے دکھ درد، ان کی امیدیں میرے ساتھ رہتی ہیں۔ یہ ہیبت ناک سلاخیں جذبوں اور محبتوں کو اندر آنے سے نہیں روک سکتیں۔ جب چاہتا ہوں کتابوں میں گم ہو جاتا ہوں، جب چاہتا ہوں منزل کو اپنے پاس بلا لیتا ہوں۔ سالک تو بیٹھا ہوا بھی حالتِ سفر میں ہوتا ہے، میں بھی سلوک کی منزلیں طے کر رہا ہوں۔ رہائی کے بعد جنگل میں بسرام کرنے کا تقاضا کر دوں تو پریشان نہ ہونا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خیر اب مقصد کی طرف آتے ہیں۔ میں تمہیں بتانا چاہتا تھا کہ قیادت کا تصور میرے نزدیک کیا ہے؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ رسالت مآب ﷺ کی زندگی کو سامنے رکھا جائے تو کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اگر میں مسلمان گھر میں پیدا نہ ہوتا اور دیانتداری سے انسان کی بہتری کا راستہ تلاش کرتا تو ایک ہی راستہ مجھے منزلِ مقصود پر پہنچاتا اور وہ راستہ خواجہ یثرب ﷺ کی چوکھٹ سے ہو کر گذرتا ہے۔

اقبال تو کہتا ہے کہ تیرے وقت کا امام وہ ہے جو تجھے حاضر اور غائب سے بیزار کر کے نئی دنیا بسانے کیلئے تمہاری زندگی دشوار تر بنا دے، اس میں خوئے دلنوازی ہونی چاہئے ورنہ لوگ کارواں سے ٹوٹتے جائیں گے اور حرم سے بھی بدگماں ہو جائیں گے۔ عوام کو ساتھ لے کر چلنا اُس کی پہلی ذمہ داری ہے، جیسے ایک گڈریا اپنی بھیڑوں اور بکریوں کو بحفاظت اپنی منزلِ مقصود پر پہنچانے کیلئے ان کے پیچھے چلتا ہے اور ہر ہمسفر پر اُس کی نظر ہوتی ہے۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ ہر نبی علیہ السلام نے بکریاں چرائی ہیں مگر کئی حکمران انسانوں کو ہی بھیڑ بکریاں سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ رہنما وہی ہوتا ہے جو عوام کا احترام کرتا ہے اور اُن کے اعتماد کے حصول کیلئے اُن سے محبت اور تعاون کرتا ہے اور زمینی حقائق پر نظر رکھتا ہے۔

قومی شعور کی سطح بلند کرنے کیلئے اسے خود کو قربانی کیلئے پیش کرنا چاہیئے۔ ذات کی نفی سے اجتماعی شعور بلند ہوتا ہے۔ رہنما کو مشکل ترین حالات میں جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے خطرات کا سامنا کرنا چاہئے۔ جب رسالت مآب ﷺ اکیلے اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر دشمن کا پتہ لگانے نکلے تھے تو اہلِ مدینہ نے سکون سے سونا شروع کر دیا تھا۔

اعلیٰ نصب العین کے حصول کیلئے قیادت کو خود کو نمونہ کے طور پر پیش کرنا چاہئے۔ اچھے رہنما کو سیاسی عمل سے سیکھتے رہنا چاہئے۔ میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا، تمہاری دادی ہمیں سکندرِ اعظم کا قصہ سنا کر بتاتی رہتی تھیں۔ ناگزیر لوگوں سے قبرستان بھرے پڑے ہیں، ہمیں یقین ہونا چاہئے کہ آنے والے ہم سے بہتر ہونگے۔ اچھا رہنما تاریخ بناتا ہے اپنے ملک اور قوم کو بلندیوں تک پہنچاتا ہے، تاریخ اسے نہیں بھول سکتی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں افراد کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہوں، اگر ایسا نہ ہوتا تو رسالت مآب ﷺ، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے لئے کیوں دعا مانگتے۔ افراد اپنی قوم کی تقدیر بدل سکتے ہیں اور اگر جذبے اور صحیح حکمت عملی سے کام کیا جائے تو قوم کو منزل مقصود تک پہنچایا جا سکتا ہے۔

چرچل کی سیاست عملیت پسندی کی تصویر ہے۔ اس کو عالمی سیاست میں بہت بڑا مقام حاصل ہے۔ لیکن اس کی سیاست کی بنیاد انسانی فلاح یا ترقی کی بجائے برطانیہ کے مفادات کے تحفظ پر تھی۔ وہ میرا آئیڈیل نہیں ہے لیکن اسکے کردار کی ایک خوبی سے میں نے بہت زیادہ اثر لیا۔

1986ء میں چند دوستوں نے پروگرام بنایا کہ چرچل کے گاؤں جا کر اس کا گھر دیکھیں۔ وہاں ان کے پوتے، چرچل جونیئر، جو اس علاقے سے ایم پی (M.P) منتخب ہوئے تھے، ہمارے استقبال کیلئے موجود تھے۔ پھولوں کی روشوں سے گزر کر ہم چرچل کے گھر کے اندرونی حصے میں داخل ہوئے۔ ہر چیز سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ جیسے چرچل نے ابھی استعمال کی ہو۔ بیڈ روم میں داخل ہوا تو محسوس ہوا چرچل محو خواب ہے۔ غسل خانے میں جا کر دیکھا آدھ جلا سگار اسی طرح موجود تھا۔ کموڈ کے ساتھ لکھنے کی سہولت موجود تھی اور کتابوں کا ایک شیلف بھی۔ چرچل کی کئی شاہکار تحریریں زیادہ تر یہیں لکھی گئیں۔ میں نے اس کے پوتے سے پوچھا اس گھر کو قومی ورثہ قرار دینے کا آپ کو کیا معاوضہ دیا گیا۔ ہنس کر کہنے لگا کچھ نہیں ملا اور بہت کچھ ملا۔ یہ ایک دلچسپ کہانی ہے۔ میرا دادا بہت خرچیلا تھا اور اکثر مقروض رہتا تھا۔ ایک مرتبہ دیوالیہ ہو گیا تو اس گاؤں کے زمیندار نے یہ گھر میرے دادا کو اس شرط پر بنوا کر دیا کہ وہ اسے بیچ نہیں سکے گا اور اس کے مرنے کے بعد یہ قومی ملکیت ہو گا۔ ہمیں یہ معاوضہ ضرور ملا ہے کہ قوم ہماری عزت کرتی ہے اور اس حلقے سے ہمیں منتخب کرتی ہے۔

بشی بیٹا میں، اگرچہ، تمہارے لئے کوئی بہت بڑا اثاثہ تو نہیں بنا سکا لیکن اگر تم ملکی معاملات میں آگے بڑھ کر اصلاحی کام کرنا چاہو تو کچھ نہ کچھ لوگ ایسے ہونگے جو یہ کہہ کر اپنا تعاون پیش کریں کہ تمہارے والد نے اپنی مٹی سے محبت کا رشتہ بر سر دار بھی نبھایا تھا۔

والسلام! تمہارا والد!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گلوبل ویلیج اور بین الاقوامی سیاست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

2 اگست 2004ء

گوانتانامو بے سیکورٹی سیل

سنٹرل جیل اڈیالہ راولپنڈی

بُشی جی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

صبح صادق ہونے سے پہلے کوئل میرے سیل کے سامنے والے درخت پر بیٹھ کر اپنی سُریلی آواز میرے کانوں تک پہنچاتی ہے، پھر چڑیاں چہچہانا شروع کرتی ہیں، بلبل کی آہ و زاریاں مجھے نغموں پر اُکساتی ہیں، کوے بھی پیچھے نہیں رہتے، مجھے ان کی آواز بھی زندگی اور آزادی کا احساس دلاتی ہے۔ مالدیپ کے جزیروں میں پرندے نہیں ہوتے، وہاں کوے کی آواز سے بھی اُنس ہو جاتا ہے۔ ویسے بھی ہماری ثقافت میں کوا مہمان کے آنے کا سندیسہ لے کر آتا ہے۔ کہتے ہیں کوے نے انسان کو آدم کے بیٹے قابیل کو اپنے بھائی ہابیل کی لاش دفن کرنے کا طریقہ سکھایا۔ اب ابنِ آدم لاشوں کو دفنانا بھول گیا ہے۔ کوؤں کی ذمہ داری ہے کہ وہ پھر سے ہمیں بھولا ہوا سبق یاد دلائیں۔

فاختائیں قریب آ کر میرے قفس کے پنجرے کے باہر بیٹھ جاتی ہیں۔ انسان جسے "علمہ البیان" کے تاج سے نوازا گیا تھا، ایک دوسرے کی بات سمجھنے سے قاصر ہے اور حیوان ناطق ہونے کا حوالہ بھی مشکوک ہونے لگا۔ میں پرندوں کی زبان سیکھ گیا ہوں، جمالِ ہمنشین نے میرے اندر اثر کرلیا ہے۔ معلوم نہیں رہا ہو کہ میں فاختہ کی زبان میں بات کروں گا یا کوے کی زبان میں یا حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرح چڑے میاں کو دربار میں طلب کرتا ہوں کہ وضاحت کرے کہ اس نے اپنی چڑیا کے سامنے اپنے پر سے میرے تخت کو گرانے کا دعویٰ کیوں کیا تھا۔ اس نے بھی اگر وہی جواب دیا کہ آپ کا تخت کہاں اور میرے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پر کہاں، ہمیں اپنے گھر والوں پر رعب ڈالنے سے تو منع نہ کریں تو میرا ردِعمل کیا ہوگا۔

میرے خیال میں میرا ردِعمل امریکہ جیسا ہوگا، جو توپ سے چڑیا کا شکار کرتا ہے، ناگاساکی، ہیروشیما، ویتنام، افغانستان اور عراق اس کا تازہ شکار ہیں۔ میں نے بات کوئی اور کرنا تھی وہ بات تقریباً اس سے ملتی جلتی ہے اور میری پرندوں والی گفتگو کو اس بات کی تمہید سمجھ لیں جو میں کر رہا ہوں۔ دنیا پر آج بھی جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا فارمولا کام کر رہا ہے، یہی فارمولا ہماری دیہاتی زندگی میں رائج ہے۔

دنیا جہاں ایک گلوبل ولیج بن گئی ہے وہاں وہ تیزی سے پھیل بھی رہی ہے۔ اگست 1978ء میں مجھے اقوام متحدہ میں خطاب کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ تو اس وقت اقوام متحدہ 127 ملکوں پر مشتمل تھی۔ آج اقوام متحدہ میں 202 کے قریب ممالک شامل ہیں۔ یعنی 26 سال میں 75 مزید ممالک آزاد ہو چکے ہیں۔ دنیا کی ان تمام قوموں میں مشترکہ عنصر جمہوریت ہے، جمہوری رویوں کی بنیاد کو معیشت کی ترقی کا معیار بنا دیا گیا ہے۔ ہمارے پاس جمہوریت کے قیام کے علاوہ کوئی چارہ کار ہی نہیں۔ ہمیں خوشدلی سے اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ بین الاقوامی مذاکروں میں شرکت اور امریکی یونیورسٹیوں میں لیکچر دینے کے موقع پر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ انسانی ذہن ابھی پختگی کے ابتدائی مراحل طے کر رہا ہے اور فطرت کے سربستہ رازوں سے ناآشنا ہے۔ اس کیلئے اسے ابھی کافی مراحل سے گزرنا ہوگا۔

دنیا میں طاقت کے تین مراکز تسلیم کیے جاتے ہیں۔ واشنگٹن، ماسکو اور بیجنگ۔ اتفاق سے مجھے تینوں مراکز میں سربراہ سطح کے مذاکرات میں شرکت کا موقع ملا۔ روس کے وزیراعظم پریماکوف کمر کے درد کا سامنا کر رہے تھے۔ مذاکرات کے بعد ہلکی پھلکی گپ شپ چل رہی تھی۔ انہوں نے کہا کہ آپ وزیر صحت ہیں، پاکستان میں اوکاڑہ کے قریب کسی کے پاس کمر کے درد کی دوا ہے۔ میں حیران رہ گیا۔ روس کا وزیراعظم خلاء میں انسان بھیج سکتا ہے مگر اپنی کمر کیلئے دیپالپور کے حکیم سے مسیحائی کا طالب ہے۔ میاں نواز شریف نے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہنستے ہوئے کہا۔ لگتا ہے اس کی کمر یلسن نے توڑی ہوئی ہے اور واقعتاً ایک ہفتے کے اندر روس کے صدر یلسن نے جو خود ہسپتال میں مہینوں موت وحیات کی کشمکش میں رہے، اسے وزارت عظمیٰ سے چلتا کیا۔

امریکہ کے مرکز میں ایک مرتبہ ہمیں سمجھایا جا رہا تھا کہ محترمہ بے نظیر اور ضیاء الحق کو مل جل کر کام کرنے پر آمادہ کیا جا رہا ہے۔ ہمارے لئے یہ ناقابلِ یقین تھا۔ بعد میں سردار شیر باز مزاری نے کہا، ہاں، ایسا ہو رہا تھا اور میں اس کا گواہ ہوں۔

بیجنگ والے تو بالکل سادہ لوگ ہیں مگر زمینی حقائق کو نظر انداز نہیں کرتے۔ اس لئے ہمیں سپر پاورز کو خلائی مخلوق نہیں سمجھنا چاہئے۔ ہم بالکل اُن جیسے ہیں یا وہ ہمارے جیسے۔

ڈاکٹر کرٹ والڈ ہائم اقوام متحدہ کے پہلے سیکرٹری جنرل تھے، جن سے میری طویل ملاقاتیں ہوئیں۔ ڈاکٹر کرٹ والڈ ہائم کا جھکاؤ یہودیوں کی بجائے فلسطینیوں کی طرف تھا۔ اس پر الزام لگا دیا گیا کہ وہ نازی ازم میں یقین رکھتا ہے۔ مگر قوم نے اسے اپنا صدر منتخب کر لیا۔ بطرس بطرس غالی دوسرے اور کوفی عنان تیسرے سیکرٹری جنرل ہیں، جن کے ساتھ مجھے مل بیٹھنے کا موقع ملا۔ بطرس بطرس غالی نے فلسطینیوں اور یہودیوں کے درمیان توازن برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ امریکا کی قیادت کو یہ پسند نہ آیا اور انہیں گھر کا راستہ دکھا دیا گیا۔ یہ اوسط درجے کی ذہانت رکھنے والے افراد ہیں۔ کوفی عنان چلتی پھرتی بے بسی کی تصویر ہیں۔ ''ہمارے وزیراعظم کی طرح''۔ ادارے کی وجہ سے پوری دنیا ان کی طرف رہنمائی کیلئے دیکھتی ہے۔ مگر ان میں سے کوئی بھی بڑا عبقری نہیں جو جریدہ عالم پر اپنا نقش ثبت کر سکے۔

مجھے دو بین الاقوامی انتخابی مہمات میں حصہ لینا پڑا تو اندازہ ہوا کہ بین الاقوامی سوچ ابھی میرے گاؤں کی سیاسی سوچ سے بلند نہیں ہو سکی، بلکہ کئی معاملات میں میرے گاؤں کی سوچ بین الاقوامی سوچ سے بہتر ہے۔

گوہر ایوب خان انٹرنیشنل پارلیمنٹرین یونین کا انتخاب لڑ رہے تھے۔ میری سربراہی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں ایک وفد وزیراعظم نواز شریف کا پیغام لے کر یورپی ممالک کے سربراہوں سے مل رہا تھا۔ میر بلخ شیر مزاری بھی وفد میں شامل تھے۔ ہم جہاں جاتے وہ جمہوریت کیلئے ہماری خدمات کا پوچھتے۔ ہم جھینپ جاتے مگر پھر انہیں کہتے کہ آپ ہمیں موقع دیں گے تو ہم جمہوریت کی خدمت کریں گے۔ وہ یورپی امیدوار پر ہمیں ترجیح دینے کو تیار نہیں تھے۔ رہی سہی کسر ہمارے امیدوار نے سٹراسبرگ کی کانفرنس میں تقریر کر کے پوری کردی۔ اپنی تقریر میں وہ ایوب کے مارشل لاء کا دفاع کرتے رہے۔ حالانکہ ساری رات اکرم ذکی اور میں ان کی منتیں کرتے رہے کہ آپ جمہوریت کے فورم پر یہ تقریر نہ کریں۔ نتیجہ صاف ظاہر تھا، وہ جو محاورتاً کہتے ہیں، ہم اپنی ضمانت بھی ضبط کرا بیٹھے اور زرمبادلہ الگ ضائع ہوا۔

دوسرا انتخاب محترمہ نفیس صادق کا تھا جو اقوام متحدہ کی این ایف پی اے (N-F-P-A) بہبود آبادی کی سربراہ تھیں۔ وہ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن (W-H-O) کی سربراہ بننا چاہتی تھیں۔ مقابلے میں ناروے کی تین مرتبہ وزیراعظم منتخب ہونے والی مس لن (Ms-Lin) تھیں۔ جنہوں نے تیسری مرتبہ وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دے دیا اور بین الاقوامی سماجی بہبود کے کاموں میں حصہ لینے کیلئے افریقی ممالک میں سرگرم عمل ہوگئیں۔

مجھے وزیر صحت ہونے کیوجہ سے وزیراعظم نے کہا کہ محترمہ نفیس صادق کی انتخابی مہم کے سلسلے میں مختلف ممالک کا دورہ کروں۔ ہمیں شروع سے ہی اندازہ ہوگیا کہ ہم کتنے پانی میں ہیں۔ لیکن امیدوار کی خوش فہمی وہی تھی، جو گاؤں یا محلے میں الیکشن لڑنے والے کونسلر کی ہوتی ہے۔ مجھے اس مہم میں بین الاقوامی ذہن میں جھانکنے کا موقع ملا۔ پوری دنیا گاؤں کی طرح تقسیم تھی، برادریوں کی بات کی اہمیت تھی، علاقائی حقائق فوقیت رکھتے تھے، امیدوار کے الیکشن میں اخراجات فیصلہ کن کردار ادا کر سکتے تھے۔

عربوں سے ووٹ مانگتے تو وہ کہتے ہمارا اپنا علاقائی امیدوار ہے۔ یورپ والوں کے پاس جاتے تو وہ کہتے کہ یورپی برادری کے فیصلے کا انتظار ہے۔ افریقی ممالک میں مس لن نے زیادہ سماجی کام کرادیئے۔ ہندوستان سے انڈونیشیا تک کوئی صاف انکار بھی نہ کرتا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہمارے ہاں اسے منافقت کہتے ہیں، بین الاقوامی سطح پر یہ ڈپلومیسی (Diplomacy) کہلاتی ہے۔ یہ باتیں اگر کونسلر کے انتخاب میں بھی کی جارہی ہوں تو بھی قابل قبول نہیں ہوتیں۔

دُنیا میں کئی ملک ترقی یافتہ ہو گئے ہیں مگر انسان ترقی کے مراحل طے کر کے بھی ترقی یافتہ نہیں ہو سکا۔

ابھی انسانی ترقی کے مدارج کی رفتار انتہائی سُست نظر آتی ہے، جو قوم انصاف، مُساوات اور سچائی کا پرچم لے کر چل پڑے گی زمانہ اس کی یلغار کا ساتھ دے گا۔ وسائل کی عدم دستیابی انسانی شعور کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ قاضی تقدیر کا اٹل فیصلہ ہے کہ زیادہ وسائل والی بے انصاف قوموں کی جگہ بے وسیلہ، مگر عدل و انصاف کی حامل قوموں کو برتری نصیب ہوتی ہے۔

والسّلام!

تمہارا والد!

جاوید ہاشمی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پارلیمنٹ کی بالادستی واحد علاج

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

10 اگست 2004ء

گوانتاناموبے سیکورٹی سیل

سنٹرل جیل اڈیالہ راولپنڈی

بشی جی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

پچھلی ملاقات میں ابوالقاسم اپنی توتلی زبان میں کہہ رہا تھا "بابا سائیں گھر چلو" اسے کہا میں اس کی ہر ضد پوری کرسکتا ہوں مگر میری بھی ایک ضد ہے۔ میں اپنی آزادی پر عوام کی آزادی کو ترجیح دیتا ہوں۔ یہ ضد اس کے خون میں بھی ہے۔ بڑا ہو کر میری مجبوری کو سمجھ جائے گا۔ دو سال پہلے جب وہ پیدا ہوا تو میں کیمپ جیل لاہور میں قید تھا۔ اس کی ماں آمنہ 1977ء میں پیدا ہوئی تو یہ عجیب اتفاق ہے میں اس وقت بھی کیمپ جیل لاہور میں تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ کے سلسلے میں قید تھا۔ اتنا شاندار ماضی رکھتے ہوئے اس کی سمجھ میں سب کچھ آجائے گا۔

جب کوئی مفلس و نادار اپنے منتخب نمائندے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا ہے کہ آپ نے دوبارہ میرے دروازے پر آنا ہے جو برتاؤ آج میرے ساتھ کریں گے، کل اسی برتاؤ کا سامنا کرنے کیلئے تیار ہو جائیں تو اس کی روح فنا ہو جاتی ہے۔ اسے ووٹ کی پرچی "برچھی" نظر آنے لگتی ہے۔ اگر عوام سے پرچی کی طاقت چھین کر فرد واحد کی حکومت قائم ہو جائے تو وہ بے زبان ہو کر بے بسی کی تصویر بن جاتے ہیں۔ وڈیرے، جاگیردار اور بااثر افراد اس موقع کا خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ فرد واحد کا عوام سے براہ راست کوئی رابطہ نہیں ہوتا، اسے بیساکھیوں کی ضرورت ہوتی ہے، یہ ازلی تابعدار اس کی تابعداری کر کے کمزور طبقات سے تابعداری کرانے کا لائسنس حاصل کر لیتے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

عوام کی آزادی کا مطلب ہے، پارلیمنٹ کی بالادستی اور سیاسی عمل کا تسلسل۔ سیاسی جماعتیں جب بار بار عوام کے دروازے پر جاتی ہیں تو سیاسی عمل کی وجہ سے معاشرے کے تمام طبقات اہمیت حاصل کر لیتے ہیں۔ سیاسی جماعتوں کو اپنی پارٹی کے دانشوروں، مزدوروں، کسانوں اور قانون دانوں کو ٹکٹ جاری کرنا پڑتا ہے۔ جس پارلیمنٹ میں تمام طبقات کی متوازن نمائندگی ہو جائے وہ ملک خوش قسمتی کی معراج پر پہنچ جاتا ہے۔

جب کسی قبیلے کا سردار اس قبیلے کے محروم اور مقہور شخص کی کٹیا کے باہر کشکول گدائی لے کر اپنے لئے عزت و وقار کی بھیک مانگ رہا ہوتا ہے۔

جب کوئی نواب اپنی ریاست کے سرسوں کے کھیت کے کنارے اپنی سابقہ رعایا کے سامنے تاجِ شاہی اُتار کر دستارِ فضیلت کیلئے ہاتھ پھیلائے کھڑا ہوتا ہے۔

جب کوئی مرشد یا مخدوم شہروں اور بستیوں کی خاک چھان رہا ہوتا ہے اور عزتِ سادات بھی داؤ پر لگی ہوتی ہے۔ جس مرید کے گھر میں مٹی کا دیا بھی نہ ہو، پیر وہاں سے روشنی تلاش کرتا ہے۔

جب کوئی وڈیرا، کوئی چودھری، کوئی خاں صاحب 16 کروڑ عوام کو پہاڑی چوٹیوں پر غاروں میں، صحراؤں، کوچوں اور گلیوں میں تلاش کرنے کیلئے دربدر ہو رہا ہوتا ہے۔

جب علمائے کرام انسانوں کے دروازے پر اپنی حاجت پوری کرنے کیلئے انتظار کرتے ہیں، نہ عورت کے ووٹ کو آدھا ہونے دیتے ہیں اور نہ کسی کو عامی کہتے ہیں۔

جب کوئی کارخانہ دار اپنے مزدور سے بھیک مانگ رہا ہوتا ہے تو سلطانی جمہور کا یہ منظر قابلِ دید ہوتا ہے۔

پارلیمنٹ کے قیام کے ساتھ ہی حکومت بنتی ہے۔ یہ حکومت عوام کی دی ہوئی ہوتی ہے حزبِ اختلاف اس کے احتساب کا عمل شروع کرتی ہے۔ یہ احتساب کا حق بھی عوام کا دیا ہوا ہوتا ہے۔

اگر حکومت عوام کا خیال رکھے تو عوام بھی پانچ سال بعد اس حکومت کا خیال رکھتے ہیں،

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ورنہ احتساب کرنے والوں کو موقع عطا کرتے ہیں۔ کہ وہ اپنے وعدوں کو عمل میں بدل کر دکھائیں۔

ملک کا ہر فرد سمجھتا ہے، پارلیمنٹ میں اس کی آواز موجود ہے۔ وہ تمام ملکی معاملات میں اپنے آپ کو شریک سمجھتا ہے اور اجتماعی سوچ پیدا ہونے لگتی ہے، قوم کا وجود عمل میں آجاتا ہے۔

فیوڈل فوجی اور سول بیورو کریسی کا احتساب شروع ہو جاتا ہے، کیونکہ پارلیمنٹ کے ارکان کو ملک میں ہونے والے تمام واقعات اور فیصلوں کے بارے میں پوچھنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔

اگر دس فی صد ارکان پارلیمنٹ بھی سوالات پوچھنا شروع کر دیں اور اپنی تقاریر میں حکومت کی بے اعتدالیوں کو قوم کے سامنے لائیں تو پارلیمنٹ کی بالادستی کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ اگر حزب اختلاف، احتساب صحیح طریقے سے نہ کر سکے تو قوم اگلے انتخابات میں اس کا احتساب کر لیتی ہے۔

پارلیمنٹ بنانے کے عمل میں اگر مداخلت نہ ہو تو اس کی کارکردگی میں پختگی آجاتی ہے اور پارلیمنٹ کے فورم سے نئی قیادت جنم لیتی ہے۔ اگر پارلیمنٹ کی بالادستی تسلیم نہ کی جائے تو پھر افراتفری کا عالم ہوتا ہے، کوئی کسی کے سامنے اپنے آپ کو جوابدہ نہیں سمجھتا اور جس معاشرے میں جوابدہی کا عمل نہ ہو وہ معاشرہ بانجھ ہو جاتا ہے۔

پارلیمنٹ کی بالادستی سے دنیا میں معاشی ترقی ہوئی یا معاشی ترقی سے جمہوریت نے جنم لیا، یہ ایک لمبی بحث ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ معاشی ثمرات کے بغیر ایک کھوکھلی جمہوریت جنم لیتی ہے۔ جو اڑھائی ہزار سال قبل ("جولیس سیزر" سے بھی پہلے) موجود تھی۔ جولیس سیزر نے اسے ختم کر دیا۔ کمزور پارلیمنٹ کا تحفظ کرنے والا کوئی نہیں ہوتا، نہ ہی اس جمہوری عمل کیلئے کوئی جان دینے کو تیار ہوتا ہے۔

انسان شروع دن سے اپنی زندگی کے تحفظ اور معاشی مفادات کی جنگ لڑ رہا ہے۔ جو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پارلیمنٹ بے روزگاری اور بھوک کا علاج دریافت کر لیتی ہے، عوام اس کی پشت پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

تمام حکمران طبقے جب جوابدہی کے عمل سے گذرتے ہیں تو ان کا وجود نا قابل برداشت نہیں رہتا بلکہ سوال صرف اچھے اور برے حکمران کا رہ جاتا ہے۔ برے حکمران کو پانچ سال کے اندر نکالنے اور اچھے حکمران کو مزید پانچ سال کیلئے کام کرنے کا موقع دینے کا فیصلہ عوام کے ہاتھوں میں آجائے تو ایک متوازن معاشرہ جنم لیتا ہے۔

اگلی صدی جمہوریت کی صدی ہے، بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اگلی صدی کا مذہب ہی جمہوریت ہے۔ یہ بات اسلام کے پھیلنے کا باعث بنے گی، چونکہ اسلام سچائی کا مذہب ہے، آزاد فضا اسے راس آتی ہے، پابندیاں اسلام کیلئے زہر قاتل ہیں۔ افغانستان میں طالبان کی حکومت کے دوران تبلیغی جماعت کو اجتماع کی اجازت نہیں تھی۔ اسی طرح سعودی عرب میں تبلیغی جماعت کا اجتماع نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہندوستان، بنگلہ دیش اور سری لنکا میں جمہوریت کی وجہ سے یہ اجتماع ہو سکتا ہے۔ حتیٰ کہ امریکہ اور برطانیہ میں اِس قسم کے اجتماعات پر کوئی پابندی نہیں۔

جب پارلیمنٹ کی بالادستی تسلیم کر لی جائے تو طاقتور ملکوں کی مداخلت سے بچنا آسان ہو جاتا ہے۔ فردِ واحد دباؤ میں آسکتا ہے، پارلیمنٹ چونکہ اپنے عوام کے سامنے جوابدہ ہوتی ہے، اس لئے وہ ملک کا دفاع فوج سے بھی زیادہ مضبوطی کے ساتھ کر سکتی ہے۔

جمہوریت میں عوام کی بالادستی کا حق تسلیم شدہ اصول ہے۔ اکثریت کا فیصلہ قانونی شکل اختیار کر لے تو پر امن معاشرہ جنم لیتا ہے۔ فیصلوں میں عوام کی شرکت قوم کو متحد کرنے کا باعث بنتی ہے۔ عوام کے نمائندوں کے ذریعے زمینی حقائق اور عوام کے مسائل پارلیمنٹ کے ذریعے قومی بحث کا حصہ بن جاتے ہیں۔

سول یا فوجی بیوروکریسی، زمینی حقائق جاننے اور لوگوں کے مسائل سمجھنے میں پٹواری سے اسسٹنٹ کمشنر اور وہاں سے ڈی سی او اور ڈی سی او سے صوبائی سطح اور وہاں سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مرکز تک کئی مراحل سے گزرتی ہے۔ یہ مراحل زمینی حقائق اور مسائل کو قومی سطح پر پہنچانے میں کافی وقت لگاتے ہیں۔ اس وقت تک مسئلہ بحرانی شکل اختیار کر چکا ہوتا ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ مسئلہ کا انتظامی حل عوام کی سوچ کے مطابق ہو۔ حل کی تلاش میں دیر کی وجہ سے عوام اور بیورو کریسی میں غلط فہمیاں بڑھ جاتی ہیں۔ ان غلط فہمیوں کی وجہ سے بیورو کریسی اور عوام میں دوری پیدا ہو جاتی ہے، یہ دوری محرومی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور ملک کے وجود پر عوام کا یقین متزلزل ہونے لگتا ہے۔ امن کی صورتِ حال بحران میں تبدیل ہو جاتی ہے اور معاشرہ انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔

پارلیمنٹ کی بالادستی کی سب سے بڑی خوبی، جو کسی دوسرے نظام حکومت میں نہیں، وہ یہ ہے کہ ایک نمائندہ اگر صبح کے وقت کسی محلے یا دُور دراز دیہات میں لوگوں کے مسائل سے آگاہ ہوتا ہے تو پارلیمنٹ کے شام کے اجلاس میں وہ مسائل ملکی سطح پر اجاگر ہو کر حل طلب بن جاتے ہیں۔ اسی طرح نمائندوں کے سوال کرنے سے حکومت اور افسر شاہی کو ہر وقت جوابدہی اور احتساب کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔

والسلام!

تمہارا والد!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

صبحِ آزادی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

14 اگست 2004ء

گوانتاناموبے سیکورٹی سیل

سنٹرل جیل اڈیالہ راولپنڈی

بشی جی!

السلام علیکم! اُمید ہے تم خیریت سے ہوگی!

آج چودہ اگست ہے۔ صبح جلدی جاگ گیا، میرے سیل اور اس کے باہر گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ بجلی جا چکی تھی اور سخت حبس کی کیفیت تھی۔ آہستہ آہستہ سامنے کے درخت پر پرندوں نے چہچہانا شروع کیا، پھر تیز ہوا چلنے لگی، مگر ابھی تک صبح کے ماتھے کا رنگ کالا تھا۔

موذن کی اذان نے شبستانِ وجود میں قندیل روشن کر دی، سکوتِ شب کو سپیدہ سحر نے زندگی کا پیغام دیا۔ میں اپنے سیل کی سلاخوں کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ صبح آزادی آیت کی طرح آسمان سے اُتر رہی تھی۔ آزادی کی پہلی کرن زندان کی سلاخوں پر پڑی تو میں نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا۔ روشنی پھیلنے لگی تو موتیا، چنبیلی اور گلاب عجب رنگ بکھیرتے نظر آئے۔ میں انہیں روزنِ دیوار سے دیکھ سکتا تھا، ان تک رسائی ناممکن تھی۔ اگرچہ یہ پھول میں نے خود لگائے ہیں اور انہیں اپنے ہاتھوں سے سینچا ہے مگر جب تک صیاد مجھے اجازت نہ دے میں قریب ہوتے ہوئے بھی ان پھولوں کی خوشبو تک نہیں پہنچ سکتا مگر آج میرا دماغ آزادی کی خوشبو سے معطر ہے۔

میں اپنے حصے کے آسمان کو دیکھ سکتا ہوں اور اپنے حصے کی زمین پر پاؤں جمائے بیٹھا ہوں۔ زمین کے رشتے کتنے مضبوط اور کتنے حقیقی ہوتے ہیں! فضا میں محوِ پرواز طیارے کو دیکھ کر میں سوچ رہا ہوں کہ وہ جتنا زمین سے دُور ہوتا جاتا ہے اس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیو قامت عمارات، دریا اور پہاڑ ریت کے ذرے کے برابر نظر آتے ہیں اور زمین پر انسان ایک رینگنے والے کیڑے کی طرح۔ جونہی زمین سے دوبارہ رشتہ قائم ہوتا ہے، زندگی کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آثار لوٹ آتے ہیں اور انسان پھر انسان نظر آنے لگتا ہے۔

بشریٰ بی بی کبھی زمین سے رشتہ نہ توڑنا۔ تمہارے آباؤ اجداد نے صدیوں تک اسے خونِ جگر سے سینچا ہے۔ ان کی ہڈیاں اسی مٹی کا حصہ بن چکی ہیں۔ میں جو پھول دیکھ رہا ہوں، جو خوشبو سونگھ رہا ہوں، ان میں رنگ بھرنے کیلئے لاکھوں انسانوں نے اپنے جگر کو لہو کیا ہے۔ کروڑوں انسانوں نے اس زمین سے اپنا رشتہ جوڑنے کی لئے آباؤ اجداد کے گھروں کو چھوڑا ہے، لاکھوں اس خوشبو کو سونگھنے کی حسرت کو دل میں لئے دنیا سے چل بسے۔

زندان میں مَیں نے اپنی شاموں کو کبھی اُداس نہیں ہونے دیا۔ جب پرندے گھروں کو لوٹ رہے ہوتے ہیں اُن پر عجیب سرشاری کا جذبہ ہوتا ہے۔ وہ تلاش رزق کے سفر سے واپسی پر چہچہا رہے ہوتے ہیں۔ اپنے بچوں سے ملنے اور اپنے آشیانے تک پہنچنے کی ترنگ میں ہوتے ہیں۔ جونہی بچوں تک پہنچتے ہیں اپنے دن بھر کی جمع پونجی اُن پر نثار کر دیتے ہیں۔ میں یہ سارا منظر اپنی آنکھوں میں جذب کر لیتا ہوں۔ یہ منظر خوش کن بھی ہے اور دل گداز بھی۔ ہم نے بھی آج کے دن اپنا آشیانہ بنایا تھا، میں اس خوشی کے موقع پر اس کی تزئین و آرائش کے بارے میں سوچتا رہا۔

پرندوں کو اپنے بچوں سے پیار کرتے دیکھ کر میری آنکھیں نم ہوئی تھیں، یہ ایک کمزوری کا لمحہ تھا جو بہت جلد گذر گیا۔ میری آنکھیں ڈھاکہ کے سیلاب پر مرکوز ہو گئیں اور پھر ایک اور سیلاب میری آنکھوں سے بہنے لگا۔ ہمارے خاندان میں کسی کی موت کے بعد آنیوالی پہلی عید پر پورا خاندان اکٹھا ہو کر کچھ وقت کیلئے سوگ مناتا ہے۔ میری والدہ کی وفات پر ہر رمضان شریف کا پہلا ہفتہ سوگ میں گزارا جاتا۔ یہ سلسلہ کچھ سالوں تک چلتا رہا پھر حالات معمول پر آگئے۔ میں مادرِ وطن کے حصے مشرقی پاکستان کو بھولنے کی کوشش کر رہا ہوں تا کہ آزادی کی خوشیوں کو اپنی خود غرضی تک محدود کر لوں۔

14 اگست 1947ء کو جب پاکستان بنا تو برصغیر کے ان حصوں پر مشتمل تھا جو انتہائی پسماندہ تھے۔ مشرقی پاکستان کی نوے فیصد زمین ہندو مارواڑیوں کے پاس تھی۔ صنعتی لحاظ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے انگریز نے اس علاقے کو بانجھ کر دیا تھا۔ وہاں کے مسلمانوں کو اس بات کا شدید احساس تھا اسی لئے وہ ہر سیاسی عمل میں پیش پیش رہے۔ قیام پاکستان کے وقت متحدہ بنگال اور آسام میں مسلم لیگ کی حکومت تھی، مولوی فضل حق، شہید سہروردی اور خواجہ ناظم الدین یکے بعد دیگرے بنگال کے وزیر اعلیٰ رہے۔ اس سے پہلے مولوی فضل الحق کلکتے کے میئر بھی منتخب ہوئے۔ ان سیاستدانوں کی اکثریت متوسط طبقے سے تھی۔ جب تک مشرقی پاکستان ہمارا رہا، وہاں سے متوسط طبقہ ہی اسمبلیوں میں آتا رہا، جو مغربی پاکستان کی فیوڈل قیادت اور افسر شاہی کیلئے ناقابل قبول تھے، وہ پاکستان سے چمٹے رہنا چاہتے تھے، کیونکہ انہیں پاکستان کے قیام نے ہندو کی معاشی، سماجی اور مذہبی بالادستی سے نجات دلائی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ اگر علاقہ میں ہندوستان کی بالادستی پھر قائم ہو گئی تو وہ صدیوں تک دوبارہ نہ اٹھ سکیں گے۔ قیام پاکستان کے بعد بہاری اور پنجابی بیوروکریسی نے ہر قدم پر انہیں احساسِ کمتری میں مبتلا کیا۔ جس قوم نے انگریز کے خلاف جنگیں لڑی تھیں اور ہندو کو صوبے کی سیاست میں مات دے دی تھی اپنوں سے مات کھا گئے۔

مغربی پاکستان میں سیاسی قیادت فیوڈلز کے پاس تھی اور انہیں قیام پاکستان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پنجاب، سندھ اور سرحد میں کہیں بھی مسلم لیگ کو واضح اکثریت حاصل نہیں تھی۔ پنجاب میں مسلمان فیوڈلز نے ہندوؤں اور سکھوں سے مل کر یونینسٹ وزارت قائم کر لی تھی۔

قیام پاکستان کے وقت تجارت پر قابض ہندو طبقہ ہندوستان چلا گیا، صنعت کا وجود نہیں تھا۔ پنجاب فیوڈل اور افسر شاہی نے مل کر غریب عوام اور چھوٹے صوبوں کا ناک میں دم کر دیا۔ مسلم لیگ کے سیاستدان نوآموز تھے، گھاگ بیوروکریٹس نے ان کی طفلانہ حرکتوں سے فائدہ اٹھا کر اقتدار اعلیٰ پر قبضہ کر لیا۔ وہ کوئی ایسا آئین نہیں بننے دیتے تھے جس سے اقتدارِ اعلیٰ عوام کو منتقل ہو سکے۔ انہوں نے سیاستدانوں کو پیچھے دھکیل کر اقتدار پر براہِ راست قبضہ کر لیا۔ ملک غلام محمد گورنر جنرل بن گئے، جن کی حیثیت ایک بیوروکریٹ سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

زیادہ نہ تھی۔

سیاستدانوں نے جمہوریت کی جدوجہد جاری رکھی۔ جب وہ طاقتور ہونے لگے تو بیورو کریسی نے فوج کو اپنے ساتھ ملا لیا اور 1954ء میں کمانڈرانچیف ایوب خان کو وزیر دفاع بنا دیا گیا، بعد میں وہ پہلے وزیراعظم بنائے گئے اور پھر صدر بن گئے۔ قائد ملت لیاقت علی خان کی شہادت اور خواجہ ناظم الدین کی سبکدوشی کے بعد ہر ڈپٹی کمشنر ملک کا گورنر جنرل اور وزیراعظم بننے کے خواب دیکھتا تھا۔ فوجی قیادت کو جب اپنی اہمیت کا احساس ہوا تو انہوں نے براہِ راست اقتدار پر شب خُون مارنے کا پروگرام بنایا۔

مشرقی اور مغربی پاکستان میں فاصلے بڑھنے لگے۔ مشرقی پاکستان کی معیشت پر مغربی پاکستان کے صنعت کاروں نے قبضہ کرلیا، وہ نوآموز ہونے کی وجہ سے تجارت کی بجائے لوٹ کھسوٹ میں مصروف ہوگئے۔ پاکستان میں فیوڈل بیوروکریٹ اور نئے صنعت کاروں کا طبقہ مستحکم ہوگیا، جرنیل اور ان کی اولادوں نے بھی اپنی صدیوں کی محرومیوں کا علاج دریافت کرلیا، اب اگر فیوڈل ازم کو ختم کرنا چاہیں تو فیوڈل اور جرنیل کا اتحاد رکاوٹ بن جاتا ہے۔ صنعت اور تجارت پر جرنیلوں کی اولاد قابض ہے، متوسط اور غریب طبقہ پس رہا ہے، ملک کے دانشور اہل قلم بے بس ہیں، علماء کا ایک طبقہ بھی پاکستان کے حکمرانوں کی صفوں میں شامل ہوگیا ہے۔ راستے میں مشکلات ضرور ہیں، لیکن نااُمیدی گناہ ہے۔ ہمیں ہر حالت میں اداروں کو مستحکم کرنا ہوگا۔ ورنہ بچے کھچے پاکستان کو بھی قائم رکھنا دشوار ہو جائیگا۔ آج یومِ تجدید عہد ہے۔ میں صبح آزادی کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ میں قیدی ہوں مگر غلام نہیں ہوں، میرا اِس دھرتی کے ذرّے ذرّے پر حق ہے اور میں آج کو قربان کرکے کل کو محفوظ کرنا چاہتا ہوں۔ آئین کی بالادستی میری آشیاں بندی کی بنیاد ہے اور میں اس بنیاد کو مضبوط کرنے کا عہد نبھانے کیلئے آخری سانس تک لڑوں گا، اس دھرتی نے ہمیں وہ کچھ دیا ہے جس کا ہم تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔ تمہیں آزادی مبارک ہو اور مجھے بھی۔ یہ نگارِ وطن کی سلامتی کیلئے دست بدعا ہونے کا دن ہے۔

والسّلام!　　　تمہارا والد!